# صراطِ مستقیم

## ملفوظات

امیر المؤمنین حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ


جمع وترتیب

حجۃ الاسلام مولانا شاہ محمد اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ

شیخ الاسلام مولانا عبدالحی بڈھانوی رحمۃ اللہ علیہ

ترجمہ، تحقیق اور حواشی

شاہ ارشد علی ندوی



ناشر

**سید احمد شہید اکیڈمی**

دارِ عرفات تکیہ کلاں، رائے بریلی

بار اوّل

۱۴۴۰ھ - ۲۰۱۹ء

| | | |
|---|---|---|
| نام کتاب | : | صراط مستقیم |
| ملفوظات | : | امیر المؤمنین حضرت سید احمد شہیدؒ |
| جمع وترتیب | : | حجۃ الاسلام مولانا شاہ محمد اسماعیل شہیدؒ<br>شیخ الاسلام مولانا عبدالحی بڈھانویؒ |
| ترجمہ، تحقیق اور حواشی | : | شاہ ارشد علی ندوی |
| کمپوزنگ | : | عبدالرحیم ندوی **8726305094** |
| صفحات | : | |
| تعداد | : | ایک ہزار |
| قیمت | : | |

## ملنے کے پتے

(۱) مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، ندوۃ العلماء، لکھنؤ

(۲) مکتبہ اسلام، گوئن روڈ، لکھنؤ

(۳) مکتبۃ الشباب العلمیۃ، ندوہ روڈ، ڈالی گنج لکھنؤ

## ناشر

# سید احمد شہید اکیڈمی

دار عرفات تکیہ کلاں، رائے بریلی

# فہرست عناوین

نمبر شمار | عنوان | نمبر صفحہ



## باب اوّل

# باب دوم

## بدعات سے اجتناب، عبادات کی ادائیگی کے طریقے

## بری عادتوں سے پرہیز اور اچھی خصلتوں سے آراستگی کا بیان

# باب سوم

## طریق سلوکِ راہِ ولایت کا بیان

# باب چہارم

## طریق سلوک راہِ نبوت کا بیان

# حضرت سیّد احمد شہیدؒ کے مختصر حالاتِ زندگی

قطب العالم مجدد دین وملت حضرت سید احمد شہیدؒ کی ولادت باسعادت بمقام تکیہ رائے بریلی صفر ۱۲۰۱ھ کو سادات خاندان میں ہوئی۔ آپ کا خاندان برّصغیر کے برگزیدہ خاندانوں میں شمار ہوتا ہے، آپ حضرت سید شاہ علم اللہ نقشبندیؒ کی اولاد میں سے تھے، جنھیں امام ربانی حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ کے خلیفۂ اجل حضرت سید آدم بنوری قدس سرہٗ سے نسبت بیعت واجازت حاصل تھی۔

حضرت حسن مثنیٰ کی شادی اپنے عم نام دار شہیدِ کربلا حضرت سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی فاطمہ صغریٰؒ سے ہوئی تھی، اس لیے اِس خاندان کو حسنی حسینی کہا جاتا ہے۔ ابتدا ہی سے آثارِ رُشد وہدایت آپ کی جبینِ مبارک میں روشن تھے۔ ذوقِ عبادت، شوقِ جہاد اور جذبۂ خدمتِ خلق سِن شعور ہی سے طبیعت مبارک میں راسخ تھا۔ شباب کا زمانہ قریب آیا تو والد ماجد کا انتقال ہو گیا، حالات کے تقاضے سے آپ نے پہلے لکھنؤ اور پھر دہلی کا سفر کیا۔ حکیم الامت حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہٗ کے خاندان سے آپ کے خاندان کے گہرے روابط تھے۔

## حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کی خدمت میں:

دہلی پہنچ کر آپ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ شاہ صاحب نے مصافحہ ومعانقہ کے بعد دریافت کیا کہ کہاں سے تشریف لائے؟ آپ نے عرض کیا، رائے بریلی سے۔ فرمایا کس خاندان سے ہیں؟ عرض کیا وہاں کے سادات میں شمار ہے۔ فرمایا کہ سید ابوسعید صاحب وسید نعمان صاحب سے واقف ہیں؟ سید صاحب

نے عرض کیا کہ سید ابوسعید صاحب میرے نانا اور سید نعمان صاحب میرے حقیقی چچا ہیں۔ شاہ صاحب نے اٹھ کر دوبارہ مصافحہ و معانقہ کیا اور پوچھا کہ کس غرض کے لیے اس طویل سفر کی تکلیف برداشت کی۔ سید صاحب نے جواب دیا کہ آپ کی ذاتِ مبارک کو غنیمت سمجھ کر اللہ تعالیٰ کی طلب کے لیے یہاں پہنچا۔ شاہ صاحب نے فرمایا کہ اللہ کا فضل اگر شامل حال ہے تو اپنے ددھیال اور ننھیال کی میراث تم کو مل جائے گی۔ اس وقت شاہ صاحب نے ایک ملازم کی طرف اشارہ فرمایا کہ ’’سید صاحب کو بھائی مولوی عبدالقادر صاحب کے یہاں پہنچا دو اور اِن کا ہاتھ اُن کے ہاتھ میں دے کر کہنا کہ اس عزیز مہمان کی قدر کریں اور ان کی خدمت میں کوتاہی نہ کریں، ان کا مفصل حال ملاقات کے وقت بیان کروں گا۔‘‘ سید صاحب حسبِ ارشاد اکبر آبادی مسجد میں ترجمان القرآن حضرت شاہ عبدالقادر صاحبؒ کی تربیت میں ٹھہر گئے۔ سید صاحبؒ کو خاندانِ ولی اللہی کے اِن دونوں بزرگوں سے استفادہ کا موقع ملا۔ شاہ عبدالقادر صاحبؒ کو سید صاحبؒ سے بڑی محبت تھی۔ ’’امیر الروایات‘‘ میں ہے کہ شاہ عبدالقادر صاحبؒ نے سید صاحبؒ کی بعض ادائیں دیکھ کر حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ سے انھیں مانگ لیا تھا۔

## شرفِ بیعت:

سید صاحبؒ نے حضرت شاہ عبدالقادر صاحبؒ سے کچھ پڑھنا بھی شروع کر دیا۔ چند دنوں کے بعد ایک شبِ جمعہ کو آپ نے حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے دستِ حق پرست پر بیعت کا شرف حاصل کیا۔ شاہ صاحبؒ نے طرقِ ثلاثہ چشتیہ، قادریہ، نقشبندیہ میں آپ کو داخل فرما لیا اور ذکر و اشغال تلقین فرمائے۔ سید صاحبؒ مسجد اکبر آبادی میں مشغول بحق رہتے تھے۔ حضرت شاہ عبدالقادر صاحبؒ نے بھی ایک مدت تک آپ کو سلوک کی تعلیم و تربیت فرمائی۔

آپ کو چند دنوں میں اس قدر باطنی ترقی ہوئی اور وہ بلند مقامات حاصل ہوئے جو بڑے بڑے سالکین و مشائخ کو برسہا برس کی ریاضت و مجاہدہ سے کم حاصل ہوئے ہیں۔

آپ پر بیداری وخواب میں اس قدر انعاماتِ الٰہیہ کی بارش ہوئی جس کی نظیر کم بزرگوں کی تاریخ میں ملتی ہے۔

## رتبۂ بلند:

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ منشی نعیم کو ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:

> ''اِس امت میں چالیس ابدال ہر وقت رہتے ہیں جن کے صدقے میں اہلِ زمین پر بارش برستی ہے اور انھیں رزق ملتا ہے اور انھیں کے صدقے میں نصرت حاصل ہوتی ہے۔ چہ عجب کہ سید احمد کو بھی ایسا ہی رتبہ مل گیا ہو اس لیے اُن کے مقام کا انکار نہیں کرنا چاہیے۔''

ایک عرصہ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کی خدمت میں رہنے کے بعد آپ اپنے وطن رائے بریلی تشریف لے گئے۔ دو برس کے قریب وہاں رہنا ہوا۔ اِسی مدت میں آپ نے نکاح کیا۔ رائے بریلی سے ۱۲۲۶ھ میں دوبارہ آپ دہلی تشریف لے گئے۔

## نواب امیر خاں کے لشکر میں:

۱۲۲۷ھ میں حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کی اجازت سے نواب امیر خاں والیٔ ریاست ٹونک کے لشکر میں چلے گئے۔ ''منظورۃ السعداء'' میں ہے:

| | |
|---|---|
| بنابر الہامیکہ در بابِ اقامت جہاد | اقامتِ جہاد کے بارے میں آپ کو جو |
| شُد رہگرائے لشکرِ ظفر اثر...... امیر الدولہ | الہامِ ربّانی ہوا، اس کی بنا پر آپ نواب |
| نواب امیر خاں بہادر مرحوم شدند | امیر خاں کے لشکر کی طرف تشریف لے گئے |

حضرت سید صاحبؒ نواب امیر خاں مرحوم کے لشکر میں چھ سال سے زائد رہے، سید صاحبؒ کے تذکرے اور تاریخیں اس زمانۂ قیام کی کرامات اور واقعاتِ غریبہ سے پُر ہیں۔ آپ نواب صاحب کو صحیح مشورے اور قیمتی امداد دیتے رہے۔

## لشکر سے علاحدگی:

۱۲۳۲ھ میں یہ صحبت اس وقت ختم ہوئی جب بد قسمتی سے نواب امیر خاں کی انگریزوں سے صلح ہوگئی۔ حضرت سید صاحبؒ نے لشکر سے علاحدگی اختیار کرلی اور حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کی خدمت میں لکھا کہ ''خاک سار قدم بوسی کو حاضر ہوتا ہے، یہاں لشکر کا کارخانہ درہم برہم ہوگیا۔ نواب صاحب انگریزوں سے مل گئے۔ اب یہاں رہنے کی کوئی صورت نہیں۔

## شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کا خواب:

حضرت سید صاحبؒ کے دہلی پہنچنے سے ایک ہفتہ قبل حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے خواب دیکھا کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم جامع مسجد دہلی میں تشریف لائے ہیں اور لوگ جوق درجوق زیارت کے لیے دور دور سے آرہے ہیں۔ سب سے پہلے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شاہ صاحبؒ کو شرفِ باریابی عطا فرمایا اور عصاء مبارک دے کر فرمایا کہ اس عصاء کو لے کر مسجد کے دروازہ پر بیٹھ جاؤ اور جو آنا چاہے، اندر آ کر اُس کا حال عرض کرو اور میری اجازت سے اندر بھیجو۔ شاہ صاحبؒ نے اس کی تعمیل کی اور ہزارہا بندگانِ خدا نے حضورﷺ کی زیارت کی۔ صبح اٹھ کر شاہ صاحبؒ سب سے پہلے حضرت شاہ غلام علی صاحبؒ خلیفہ حضرت مرزا مظہر جانِ جاناں رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں تشریف لے گئے اور خوب کی تعبیر چاہی۔ شاہ غلام علی صاحبؒ نے فرمایا کہ سبحان اللہ! یوسفِ وقت مجھ سے تعبیر پوچھتا ہے۔ شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ اس خواب کی تعبیر میں آپ کی زبان سے سننا چاہتا ہوں۔ شاہ غلام علی صاحبؒ نے فرمایا کہ اس خواب سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے یا آپ کے کسی مرید رشید کے ذریعے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت وفیض کا سلسلہ جاری ہوگا۔ شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے فرمایا کہ میرے خیال میں بھی یہی تعبیر آئی تھی۔

## رجوعِ عام:

ایک ہفتہ کے بعد حضرت سید صاحبؒ دہلی تشریف لائے اور حسب معمول اکبر آبادی مسجد میں قیام فرمایا، اور لوگوں کا رجوع ہوا۔ انھیں دنوں میں شیخ الاسلام حضرت مولانا عبدالحی اور حجۃ الاسلام مولانا شاہ محمد اسمٰعیل آپ کے حلقۂ بیعت وارادت میں داخل ہوئے۔

مرشد وقت حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کی زندگی میں ان اماموں کا کسی کی بیعت میں داخل ہونا معمولی واقعہ نہ تھا۔ اس کا بڑا چرچا ہوا۔ جوق در جوق علماء وفضلاء وصالحین بیعت ہونے لگے۔ شاہ صاحبؒ کے خاندان کے اکثر افراد شاہ صاحب کی اجازت سے اور مولانا محمد یوسف صاحب نبیرۂ حضرت شاہ اہل اللہ صاحبؒ برادر حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ مع خاندان، مولوی وجیہ الدین صاحبؒ، حکیم مغیث الدین صاحبؒ، حافظ معین الدین صاحبؒ وغیرہ مع خاندان واقربا مرید ہوئے اور ایسی مقبولیت وشہرت ہوئی کہ "یَدۡخُلُوۡنَ فِیۡ دِیۡنِ اللّٰهِ اَفۡوَاجاً" کا سماں بندھ گیا۔

## اقامتِ جہاد:

۱۲۴۱ھ کے آغاز میں آپ نے اقامتِ جہاد کے لیے کمر ہمت باندھ لی اور اپنے وطن سے ہجرت کی۔ راج پوتانہ، رواڑ، سندھ، بلوچستان، افغانستان اور صوبۂ سرحد کے ریگستانوں، میدانوں، پہاڑوں، دروں اور جنگلوں اور دریاؤں میں سفر کیا۔ ہر ہر جگہ اعلاء کلمۃ الحق کا فریضہ ادا کرتے گئے۔ سرحد پہنچ کر جہاد کا آغاز کیا، آپ اور آپ کی جماعت نے سکھوں سے متعدد جنگیں کیں، جن میں بڑی کامیابی نصیب ہوئی۔

## شہادت:

حضرت سید احمد شہیدؒ اور اُن کی جماعتِ مجاہدین نے بالاکوٹ کے مقام پر ۲۴/ ذی قعدہ ۱۲۴۶ھ کو رنجیت سنگھ کی فوج سے لڑتے ہوئے میدانِ جنگ میں جامِ شہادت نوش فرمایا۔

بنا کردند خوش رسمے بخون و خاک غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقِ پاک طینت را

شہادت کے روز حضرت سید صاحبؒ اور مجاہدین کے چہرے دَمک رہے تھے اور ایک عجیب کیفیت اُن پر طاری تھی۔ راوی کہتا ہے:

''حضرت سید صاحبؒ اُس وقت مَلکی صفات میں تھے، آپ کا چہرہ ایسا دمک رہا تھا کہ کسی کی نظر اُس پر نہیں ٹھیرتی تھی۔''

## حضرت سید صاحبؒ کا فیضِ عام:

حضرت سید صاحبؒ نے اسلام کے عقائدِ صحیحہ کی تبلیغ اور توحید و سنت کی عالم گیر اشاعت فرمائی۔ برصغیر کا کوئی گوشہ نہیں چھوٹا جہاں آپ کا فیض نہ پہنچا ہو۔ دہلی اور کلکتہ کے درمیان سیکڑوں مقامات پر آپ نے خود دورہ فرمایا۔ مولانا عبدالحی صاحبؒ اور مولانا محمد اسمٰعیل صاحبؒ کے مواعظ ہوئے اور اللہ کی حجت تمام ہوگئی۔ سندھ اور سرحد میں خود قیام فرمایا۔ حیدرآباد دکن، بمبئی، مدراس میں مولانا سید محمد علی صاحب رام پوریؒ و مولانا ولایت علی صاحب عظیم آبادیؒ کو بھیجا، جنھوں نے وہاں قیام فرما کر اصلاح عقائد و اعمال و رسوم کا عظیم الشان کام انجام دیا۔ ہزاروں بندگانِ خدا اور سیکڑوں اُمرا و رؤسا و اہلِ علم و فضل مستفید ہوئے اور توحید و سنت کا عام چرچا ہوگیا۔ پورب میں آپ کے خلفاء مولانا کرامت علی صاحبؒ و مولانا سخاوت علی جون پوریؒ نے تبلیغ و ہدایت کے فرائض انجام دیئے اور بڑی کامیابی حاصل کی۔ آج بھی آپ کے اثرات ان اطراف میں موجود ہیں۔ صرف مولانا کرامت علی صاحبؒ کی کوششوں سے بنگال میں لاکھوں آدمی مشرف بہ اسلام ہوئے۔

نیپال کی ترائی میں مولانا جعفر علی صاحبؒ نے روشنی پھیلائی۔ افغانستان میں بھی آپ کے خلیفہ مولانا حبیب اللہ صاحب قندھاریؒ سے اصلاح ہوئی۔

ملک تبّت میں بھی آپ نے تبتیوں کا ایک وفد تبلیغ و ہدایت کے لیے بھیجا اور

مسلمانوں کی اصلاح ان کے سپرد کی۔ اوّل ان کی سخت مخالفت ہوئی پھر ان کو بہت کام یابی و ترقی ہوئی، ہزاروں آدمی ان کے حلقہ بگوش ہو گئے، یہاں تک کہ انھوں نے اپنے چند آدمی تبلیغ کے لیے چین بھیجے۔ جاوہ، بلغار اور مراکش وغیرہ میں بھی آپ کے خلفاء پہنچے اور مشرقِ اقصیٰ سے مغرب اقصیٰ تک آپ کی مملکتِ تجدید کے حدود پہنچ گئے۔

مولانا عبدالاحد صاحب لکھتے ہیں:

''حضرت سید صاحب قدس سرہٗ کے ہاتھ پر چالیس ہزار سے زیادہ ہندو وغیرہ کفار مسلمان ہوئے اور تیس لاکھ مسلمانوں نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی اور جو سلسلۂ بیعت آپ کے خلفاء اور خلفاء کے خلفاء کے ذریعے تمام روئے زمین پر جاری ہے۔ اس سلسلے میں تو کروڑوں آدمی آپ کی بیعت میں داخل ہیں۔''

حضرت سید صاحبؒ کے طریقے کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس زمانے میں اللہ کے یہاں آپ کا طریقہ سب سے زیادہ مقبول تھا اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشی ان دیارِ مشرقیہ میں اس میں منحصر تھی۔ چناں چہ حضرت حاجی عبدالرحیم ولایتیؒ جو اپنے وقت کے جلیل القدر شیخ و سالک اور سلسلۂ چشتیہ میں بیعت و مجاز تھے اور آپ کے سیکڑوں ہزاروں مرید تھے۔ فرماتے تھے:

''مجھے کسی سے سلوک میں رجوع کی ضرورت نہیں، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشی اسی میں پاتا ہوں کہ میں سید صاحبؒ سے بیعت ہو جاؤں۔''

دوسری خصوصیت مشائخ و علماء میں مقبولیت ہے، چناں چہ ہندوستان کا کوئی خانوادہ اور کوئی سلسلہ نہیں ہے، جس کے اکابر نے سید صاحبؒ کو اپنا بڑا نہ مانا ہو اور آپ سے استفادہ کیا ہو۔ سلسلۂ چشتیہ صابریہ کے دو نام ور شیخ حاجی عبدالرحیم صاحب ولایتیؒ اور آپ کے خلیفہ میاں جی نور محمد صاحب جھنجھانویؒ (پیر و مرشد شیخ العرب والعجم حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی قدس سرہٗ) آپ سے بیعت ہوئے اور آپ کے رنگ میں رنگ گئے۔ حاجی عبدالرحیم صاحبؒ بیعت کے

بعد ہمیشہ خدمت میں رہے، یہاں تک کہ بالاکوٹ میں شہید ہوئے۔ اس سلسلے کے دوسرے حضرات حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، قطب الارشاد مولانا رشید احمد محدث گنگوہیؒ، شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ اور اُن کی جماعت کا تعلق تو آپ سے ایسا تھا جیسا کہ عاشق کو معشوق سے ہوتا ہے۔ شاہ ابوسعید صاحبؒ جو خاندانِ نقشبندیہ مجددیہ کے سلسلۃ الذہب کا ضروری حلقہ اور حضرت شاہ غلام علی صاحبؒ کے خلیفہ تھے، عرصے تک آپ کی خدمت میں رہے، اور استفادہ کیا۔ سلسلۂ قادریہ کے مشہور شیخ سید صبغت اللہ بن سید محمد راشدؒ نے جن کا سلسلہ سندھ میں بہت مشہور ومعمور ہے، آپ سے استفادہ کیا۔ حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کی حیات میں آپ کے خاندان کے اہل علم وفضل نے آپ سے بیعت کی۔ مولانا محمد اسمٰعیل صاحبؒ، مولانا عبدالحی صاحبؒ، مولانا محمد یوسف صاحب پھلتیؒ کے علاوہ شاہ محمد اسحٰق صاحبؒ ومولانا محمد یعقوب صاحبؒ نے استفادہ وباطنی تعلیم حاصل کی۔ اس کے علاوہ تمام مشایخ وعلماء آپ کی عظمت ومقبولیت آپ کے طریقے کی رفعت وفضیلت، آپ کی محبت اور آپ سے عقیدت پر متفق العقیدہ ومتفق اللسان ہیں۔ آپ کی محبت اہلِ سنت وصحیح الخیال جماعت کا شعار اور علامت بن گئی ہے، اور آپ کے متعلق وہی کہنا بالکل صحیح ہوگا جو بعض اہلِ علم نے آپ کے ہم نام امام احمدؒ کے متعلق کہا ہے:

"إذا رأيت يحب أحمد بن حنبل فاعلم أنّهٗ صاحب سنّة."

(جب تم کسی کو دیکھو کہ اس کو احمد بن حنبلؒ سے محبت ہے تو سمجھ لو، کہ وہ سنت کا متبع ہے۔)

ایک دوسرے عالم کا قول ہے:

"من سمعتموه يذكر أحمد بن حنبل بسوء فاتّهموه على الإسلام."

(جس کو تم احمد بن حنبلؒ کا ذکر برائی سے کرتے سنو، اُس کے اسلام کو مشکوک جانو۔)

(ملخص: از سیرت سید احمد شہیدؒ)

# شاہ محمد اسماعیل شہیدؒ - ایک مختصر تعارف

شاہ محمد اسمٰعیلؒ، شاہ عبدالغنیؒ کے اکلوتے فرزند، شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے پوتے، شاہ عبدالعزیزؒ محدث، شاہ رفیع الدینؒ محدث اور شاہ عبدالقادرؒ محدث کے بھتیجے تھے۔ پاک وہند کی وسیع سرزمین میں علم وفضل، درس وتدریس، تصنیف وتالیف، وعظ وارشاد، تجدید دین، احیائے اسلامیت اور اصلاح امت کی ایسی بلند نسبتیں شائد ہی کسی کے حصے میں آئی ہوں، جن سے شاہ اسمٰعیلؒ مشرف ہوئے اور ایسی گراں بہا میراث بھی بہت کم لوگوں کو ملی ہوگی۔ شاہ اسمٰعیل رحمۃ اللہ علیہ نے ان نسبتوں کی بلندی اور اس میراث کی گراں بہائی نہ محض قائم رکھی بلکہ عملاً ان کی زینت وزیبائی بدرجہا درخشاں تر بنادی۔

شاہ اسمٰعیلؒ مستند روایت کے مطابق ۱۲/ربیع الاوّل ۱۱۹۳ھ (۲۹/اپریل ۱۷۷۹ء) کو اپنی ننھیال پھلت، ضلع مظفر نگر میں پیدا ہوئے۔ والدہ ماجدہ کا نام بی بی فاطمہ رحمۃ اللہ علیہا تھا۔

## تعلیم وتربیت:

شاہ صاحب نے ابتدائی تعلیم والد ماجد سے پائی، آٹھ سال کی عمر میں حافظ قرآن بن گئے۔ ۱۶/رجب ۱۲۰۳ھ (۱۲/اپریل ۱۷۸۹ء) کو شاہ عبدالغنی رحمۃ اللہ علیہ نے وفات پائی، جب شاہ شہید صرف دس برس کے تھے، تینوں اعمام کرام (شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ، شاہ رفیع الدین رحمۃ اللہ علیہ اور شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ) یتیم بھتیجے کو آغوش محبت میں لینے کے لیے یکساں تیار تھے۔ لیکن رسماً یہ ذمہ داری شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ نے اٹھالی، جن کی اپنی اولاد میں صرف ایک لڑکی تھی۔ شاہ اسمٰعیل رحمۃ اللہ علیہ نے درسی کتابیں انھیں سے پڑھیں۔ تمام مروّجہ علوم میں وہ درجہ حاصل کرلیا جوان کے عہد میں تعلیم وتدریس

کا آخری درجہ سمجھا جاتا تھا۔ شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ سے حدیث کی سند لی اور ۱۵، ۱۶ سال کی عمر میں فارغ التحصیل ہو گئے۔

سر سیّد احمد خان کے بیان کے مطابق ابتدا میں استغنا کا یہ عالم تھا کہ یاد ہی نہ رہتا تھا، سبق کہاں سے شروع ہوگا، کبھی اصل مقام سے بعد کی عبارت شروع کر دیتے۔ شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ ٹوکتے تو جواب میں کہہ دیتے کہ مطلب سہل سمجھ کر نہ پڑھا۔ شاہ عبدالقادر متروکہ حصے میں سے کچھ پوچھتے تو شاہ شہید ایسی تقریر فرماتے کہ سب لوگ سن کر حیران رہ جاتے۔ کبھی اصل مقام سے پیش تر سبق کا آغاز کر دیتے، شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ متنبہ فرماتے تو شاہ شہید رحمۃ اللہ علیہ ایسے شبہات وارد کر دیتے کہ فاضل استاد کو بھی ان کے جواب میں خاص توجہ مبذول کرنا پڑتی۔

غیر معمولی ذکاوت کی دھوم شہر بھر میں تھی، فارغ التحصیل ہونے کے بعد لوگ امتحاناً برسرراہ سوالات پیش کر دیتے، خیال یہ ہوتا کہ کتاب پاس نہیں، اسی لیے شافی جواب نہ دے سکیں گے، لیکن شاہ شہید بے تامل تقریر شروع کر دیتے اور مسئلے کی ایسی تشریح فرماتے کہ پوچھنے والے کو اپنی جرأت پر خجالت ہوتی۔

مولانا محمد خان عالم مدراسی رحمۃ اللہ علیہ نے مولانا سید محمد علی رام پوری رحمۃ اللہ علیہ کے بیان کے مطابق لکھا ہے کہ شاہ شہید عالم متبحر اور حافظ قرآن تھے۔ تیس ہزار حدیثیں ان کی نوک زبان پر تھیں۔

## سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت:

شاہ شہید رحمۃ اللہ علیہ کے علم و فضل کی شہرت اگرچہ عام تھی، لیکن اس کے ساتھ طبیعت میں اک گونہ بے پروائی سی پائی جاتی تھی، یعنی انھوں نے کوئی مستقل مشغلہ اختیار نہ کیا تھا شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ خاندان میں جن مشاغل کا رواج تھا، انھیں وہ مقاصد اصلاح کے لیے کافی نہ نظر آتے تھے اور کوئی نیا مشغلہ پیش نظر نہ تھا۔ یا یہ سمجھ لیجیے کہ وہ اپنے دل میں

ایک لائحۂ عمل کا فیصلہ کر چکے تھے اور رفقاء ومعاونین کی تلاش میں متوقف تھے۔ یہ حالت تھی کہ ۱۲۳۲ھ میں امیر المؤمنین حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ، نواب امیر خاں والیٔ ٹونک کی رفاقت چھوڑ کر راج پوتانہ سے دہلی پہنچے اور اکبر آباد مسجد میں مقیم ہوئے۔ پہلے مولانا محمد یوسف پھلتی نے، جو غالباً شاہ ولی اللہ کے بھائی شاہ اہل اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے پوتے تھے، پھر شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے داماد مولانا عبدالحی رحمۃ اللہ علیہ نے اور ان کے بعد شاہ شہید نے سید صاحب سے بیعت کی، اسی وقت سے شاہ شہید کی زندگی بالکل بدل گئی۔ وہ رات دن اصلاح وارشاد میں مصروف رہنے لگے۔ سہ شنبہ اور جمعہ کو شاہی مسجد میں بالالتزام وعظ فرماتے۔ سرسید نے لکھا ہے کہ نماز جمعہ کے لیے لوگ اس کثرت سے آنے لگے، جیسے عیدین کی نمازوں میں آتے تھے، سامعین کا شمار نہ ہوسکتا تھا۔ وعظ کا طریقہ ایسا تھا کہ جو کچھ فرماتے دلوں میں پیوست ہوجاتا۔ اگر کسی بات پر کوئی خلش پیدا بھی ہوتی تو آگے چل کر بالکل رفع ہوجاتی۔ احیائے سنت اور ردشرک وبدعت وعظوں کا خاص موضوع ہوتا۔ یہی دور تھا جس میں احیائے دین کا کام پوری سرگرمی سے شروع ہوا۔ یہی دور تھا جس کے متعلق مولانا ابوالکلام آزاد رحمۃ اللہ علیہ نے ''تذکرہ'' میں تحریر فرمایا:

''دعوت واصلاح امت کے جو بھید پرانی دہلی کے کھنڈروں اور کوٹلہ کے حجروں میں دفن کر دیئے گئے تھے، اب اس سلطان وقت اور سکندر اعظم کی بدولت شاہ جہان آباد کے بازاروں اور جامع مسجد کی سیڑھیوں پر ان کا ہنگامہ مچ گیا اور ہندوستان کے کناروں سے بھی گزر کر نہیں معلوم کہاں کہاں تک چرچے اور افسانے پھیل گئے۔ جن باتوں کے کہنے کی بڑوں بڑوں کو بند حجروں کے اندر بھی تاب نہ تھی وہ اب برسر بازار کی جارہی اور ہورہی تھیں اور خون شہادت کے چھینٹے حرف وحکایت کے نقوش صفحہ عالم پر ثبت کر رہے تھے۔''

## اولاد:

شاہ عبدالقادر نے اپنی نواسی بی بی کلثوم رحمۃ اللہ علیہا سے شاہ شہید کا نکاح کر دیا

تھا، صرف ایک بچہ ہوا جس کا نام شاہ محمد عمر رحمۃ اللہ علیہ تھا، اس کی پوری زندگی نیم مجذوبیت کی حالت میں گزری۔

## وفات:

بیعت کے بعد سے شہادت تک شاہ شہیدؒ ہمیشہ اپنے پیر و مرشد حضرت سید احمد شہیدؒ کے ساتھ رہے، تمام اصلاحی دوروں اور جنگوں میں ایک بڑے مشیر اور وزیر اعظم کی طرح آپ کو مفید و قیمتی مشوروں سے نوازتے رہے۔ بلآخر بالاکوٹ کے میدان میں ۱۲۴۶ھ کو سکھوں سے لڑتے ہوئے اپنے شیخ کے ساتھ جام شہادت نوش فرمایا ؎

جو تجھ بن نہ جینے کو کہتے تھے ہم    سو اس عہد کو ہم وفا کر چلے

## تصانیف:

شاہ شہید کی متعدد تصانیف ہیں مثلاً:

۱۔ اصول فقہ میں ایک رسالہ جو چھپ چکا ہے۔

۲۔ منطق میں ایک رسالہ جس کا ذکر سر سید احمد خاں نے کیا ہے۔

۳۔ ایضاح الحق الصریح فی احکام المیت والضریح: محققین کا بیان ہے کہ حقیقت بدعت میں ایسی کوئی کتاب کسی زبان میں نہیں لکھی گئی، افسوس یہ مکمل نہ ہو سکی، اردو ترجمے کے ساتھ دو تین مرتبہ چھپ چکی ہے۔

۴۔ منصب امامت: یہ بھی نہایت عمدہ کتاب ہے، فارسی نسخے اب کم یاب ہیں، البتہ اردو ترجمہ ملتا ہے۔

۵۔ تنویر العینین فی اثبات رفع الیدین: اس میں وہ احادیث جمع کر دی گئی ہیں، جن سے رفع یدین کا سنت ہونا ثابت ہے، اردو ترجمے کے ساتھ کئی مرتبہ چھپ چکی ہے۔

۶۔ صراط مستقیم: اس کتاب کے چار باب ہیں، جن میں سے پہلا اور چوتھا باب شاہ شہید کا لکھا ہوا ہے، مضامین سید صاحب کے ہیں، صرف عبارت اور اسلوب بیان شاہ صاحب کا

ہے، اس کا اردو ترجمہ بھی چھپ چکا ہے، فارسی ایک مرتبہ چھپی اور بہت کم یاب ہے۔
معلوم ہوا کہ اب اس کو المکتبۃ السّلفیہ (پاکستان) نے شائع کر دیا ہے۔

۷۔ تقویۃ الایمان: اصلاح عقیدہ یعنی اثبات توحید وسنت اور ردّ شرک و بدعات میں ایک بے نظیر کتاب ہے، جو سب سے پہلے ۱۲۴۴ھ میں چھپی تھی، گزشتہ تقریباً دو سو سال کی مدت دراز میں اللہ ہی بہتر جانتا ہے، یہ کتاب کتنی مرتبہ طبع ہوئی، سرسری اندازہ ہے کہ ساٹھ ستّر لاکھ سے کم نہ چھپی ہوگی۔ کروڑوں آدمیوں نے اسے پڑھا اور ہدایت کی روشنی حاصل کی۔ یہ ایک ایسا شرف ہے جو تقویۃ الایمان کے سوا اردو کی کسی دوسری کتاب کو شاید ہی نصیب ہوا ہو۔

۸۔ یک روزی: مختصر سا رسالہ ہے جس میں تقویۃ الایمان پر مولوی فضل حق خیرآبادی کے بعض اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے۔ شاہ صاحب نماز کے لیے مسجد کی طرف جا رہے تھے۔ راستے میں انھیں مولوی فضل حق کا رسالہ ملا، نماز سے فارغ ہوتے ہی جواب لکھنے بیٹھ گئے اور ایک نشست میں اسے پورا کر دیا، اسی وجہ سے یک روزی نام پایا۔

۹۔ مکاتیب۔ ان کا بہت بڑا مجموعہ ہے، جن میں سے بعض ان کے نام سے مشہور ہوئے اکثر انھوں نے سید صاحب کی ایما پر لکھے۔

۱۰۔ منظومات۔ ان کی کیفیت یہ ہے۔

(الف) ایک فارسی قصیدہ نعت میں۔

(ب) ایک فارسی قصیدہ سید صاحب کی مدح میں۔

(ج) ایک فارسی مثنوی موسوم بہ سلک نور۔ توحید کے مضمون پر۔

(د) ایک اردو مثنوی موسوم بہ سلک نور۔ توحید ہی کے مضمون پر۔

(ہ) ایک مثنوی بہ زبان فارسی ایک حدیث کی شرح میں۔

(ماخوذ: از مقدمہ تقویۃ الایمان، از غلام رسول مہرؔ)

# مولانا عبدالحی بڈھانویؒ-ایک مختصر تعارف

نام: عبدالحی بن ہبۃ اللہ بن نوراللہ، وطن: بڈھانہ، ضلع: مظفرنگر۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی سے آپ کا دوگونہ رشتہ تھا۔ اوّل یہ کہ مولانا عبدالحی کی پھوپھی شاہ صاحب کی اہلیہ تھیں، دوسرے شاہ صاحب کی ایک صاحبزادی کی شادی مولانا عبدالحی سے ہوئی۔ اغلب ہے، پھلت والوں کی طرح مولانا کے خاندان کی رشتہ داریاں بھی پہلے ہی سے شاہ صاحب کے خاندان سے ہوں، شاہ صاحب کی صاحبزادی سے مولانا کے کوئی اولاد نہ ہوئی۔ تعلیم دہلی ہی میں خود شاہ صاحب اوران کے بھائیوں سے پائی۔ چوں کہ بہت قریبی رشتہ دار تھے، اس لیے شاہ عبدالعزیز بہت شفقت فرماتے تھے، اور مولانا عبدالحی اپنے علم وفضل اور زہد وتقویٰ کے باعث زیادہ سے زیادہ شفقت کے مستحق تھے، مولانا نسباً صدیقی تھے۔ ''ابجد العلوم'' میں بہ حوالہ ''الیانع الجنی'' مرقوم ہے کہ شاہ عبدالعزیز کے شاگردوں میں فقہ حنفی مولانا سے بہتر کوئی نہ جانتا تھا، اور درسیات میں بھی ان سے زیادہ ماہر کوئی نہ تھا۔

## بیعت:

سید صاحب نواب امیر خاں کا ساتھ چھوڑ کر دہلی آئے اور جہاد فی سبیل اللہ کے لیے ایک مستقل جماعت کی تاسیس کا انتظام کرنے لگے، تو مولانا عبدالحی کو سید صاحب سے کسبِ فیض کا موقع ملا، کہ مولانا عبدالحی نے شاہ عبدالعزیز کے مشورے کے مطابق سید صاحب سے نماز حضورِ قلب کے متعلق سوال کیا، سید صاحب نے فرمایا کہ مولانا! بات چیت سے تو یہ مقصد حاصل نہیں ہوسکتا، اٹھیے اور میرے پیچھے دو رکعت نماز پڑھیے، اس کے بعد مولانا نے بیعت کرلی اور شاہ اسماعیل بھی انھیں کی ترغیب سے سید صاحب کے مرید ہوئے۔

نواب وزیرالدولہ نے ''وصایا'' میں اس واقعہ کا ذکر یوں کیا ہے کہ مولانا نے صحابۂ کرامؓ کی نماز کا اشتیاق ظاہر کیا تھا۔ سید صاحب نے ترکیب بیان فرمادی۔ مولانا نے نمازِ عشا کے بعد اسی ترکیب کے مطابق دو رکعت نفل کی نیت باندھی۔ سید صاحب حجرے کے دروازے پر بیٹھ گئے۔ مولانا نے پوری رات انھیں دو رکعتوں میں گزار دی۔ بس اس وقت سے سید صاحب کے ساتھ ایسی عقیدت اور راہ ایمان پر ایسی استقامت نصیب ہوئی کہ اسے لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔

مولانا فرمایا کرتے تھے کہ خدا نے مجھے ایسے شیخ کی خدمت میں پہنچایا گویا حضرت خضر کی زیارت نصیب ہوئی، لیکن مجھے ان سے اس کے سوا کوئی غرض نہیں کہ اپنے لیے دعا کراؤں۔

## رفاقت:

مولانا جب سے مرید ہوئے سید صاحب کی رفاقت نہ چھوڑی۔ سفر و حضر میں اکثر ساتھ رہے۔ سفر حج میں بھی ساتھ تھے، اور سید صاحب کے جہاز میں حجاز پہنچے تھے، اسی سفر میں یمن کے مشہور محدث قاضی محمد بن علی شوکانی سے ''مکاتبتاً'' حدیث کی سند لی، اور ان کی کتاب ''موضوعات'' مولانا ہی ہندوستان لائے۔ ردّ بدعات، احیائے سنن اور ترغیبِ جہاد میں مسلسل وعظ فرماتے رہے۔ وعظ کا آغاز مدرسے میں ہوا تھا، جب لوگ بہ کثرت شامل ہونے لگے تو شاہی مسجد میں اجتماع ہونے لگا۔ مولانا رشید الدین مرحوم سے بدعات و محدثات کے متعلق آپ کا اور شاہ اسمٰعیل کا ایک مناظرہ بھی ہوا تھا، جس کی روداد آپ نے مرتب فرمادی تھی۔

بیان کیا جاتا ہے کہ معترضوں کی طرف سے مولانا رشید الدین سترہ سوال مرتب کر کے لائے تھے وہ پیش ہوئے تو مولانا عبدالحی نے فرمایا:

''ملائے محض نیستم، سپاہی گری ہم دانم اگر با ساز وتفنگ گراں بار قطع یک منزل راہ پیادہ پا نمودہ باشم وتعب آں دامن گیر حال من باشد، در آں وقت نیز اگر سوالات پیش خواہید نمود، بہ تائید تعالیٰ جواب باصواب خواہید یافت۔''

(میں نرا ملّا نہیں، سپاہ گری بھی جانتا ہوں، اگر بھاری بندوق اور گولی بارود لے کر ایک منزل پیادہ پا طے کر کے آؤں اور تکان کے باعث چور ہو جاؤں، اس وقت بھی جو سوالات پیش کرو گے، خدا کی مدد سے ان کا شافی جواب پاؤ گے۔)

## ہجرت:

مولانا، سید صاحب کے ساتھ جہاد کے لیے نکلے تھے، نواب وزیرالدولہ فرماتے ہیں، کہ ٹونک پہنچنے کے بعد مولانائے موصوف، حاجی احمد اور مولانا عبدالقدوس کو حضرت سید صاحب نے مریدوں کی تعلیم و تربیت کے لیے مقرر فرمادیا۔ مولانا کو سید صاحب سے مفارقت گوارا نہ تھی لیکن حکم کی بنا پر ٹھہر گئے تاہم ہر وقت انتظار تھا کہ سید صاحب کب بلاتے ہیں۔ پانچ مہینے گزر جانے کے بعد سید صاحب کی طرف سے نامۂ طلب صادر ہوا۔ مولانا نے فوراً سفر کا سامان تیار کیا اور روانہ ہو گئے۔ اگرچہ پرانی بیماریوں کے باعث بہت کمزور ہو گئے تھے، لیکن سید صاحب سے ملاقات کے شوق نے سب کچھ بھلا دیا۔ راستہ چلتے چلتے رفیقوں سے الگ ہو جاتے، سید صاحب کا خط نکال کر پڑھتے تو بے اختیار رقت طاری ہو جاتی۔ پھر شوق کی گرم جوشی سے تیز چلنے لگتے، جو شخص سامنے آتا، کہتے، مجھے سید صاحب نے طلب فرمایا ہے۔ غرض اس حال میں لمبا سفر طے کیا۔ جیسے عاشق محبوب کی خدمت میں جاتا ہے۔ سید صاحب سے ملاقات کے بعد دوستوں کو جو خط لکھا، اس میں مرقوم تھا:

''مجھ پر ویسی ہی حالت طاری ہوئی جس کا ذکر حدیث شریف میں آیا ہے کہ: قیامت کے وقت مومن کو جنتِ معلّٰی میں غوطہ دیں گے اور اس نے زندگی میں جو مصیبتیں اور مشقتیں برداشت کیں، ان کا رنج و ملال جان و تن سے دھل جائے گا۔''

## وفات:

بہت بوڑھے ہو چکے تھے۔ پھر بواسیر کا شدید دورہ ہوا۔ ''وقائع'' کا بیان ہے کہ

کوئی دوا مفید نہ پڑتی تھی اور بیماری بڑھتی جاتی تھی۔ یہاں تک کہ مولانا پر نزع کی حالت طاری ہوگئی:

کسی وقت آپ بے ہوش ہو جاتے تھے اور کسی وقت ہوش میں آتے تھے۔ آپ کا یہ حال سن کر حضرت علیہ الرحمۃ (سید صاحب) تشریف لائے، جب مولانا صاحب کو ہوش آیا، حضرت کو دیکھا اور پہچانا، حضرت نے پوچھا کہ اس وقت کیا حال ہے؟ کہا: نہایت تکلیف ہے۔ آپ میرے واسطے دعا کریں اور میرے سینے پر اپنے قدم مبارک رکھ دیں کہ اس کی برکت سے اللہ تعالیٰ اس مصیبت سے مجھ کو نجات دے۔ آپ (سید صاحب) نے فرمایا: مولانا صاحب! آپ کے سینے میں علم قرآن وحدیث کا گنجینہ ہے۔ یہ اس قابل نہیں کہ میں اس پر قدم رکھوں۔ پھر آپ نے بسم اللہ کر کے اپنا دست مبارک رکھا۔ مولانا صاحب کو قدرے تسکین ہوئی اور کئی بار ''اللہ رفیق الاعلیٰ''، ''اللہ رفیق الاعلیٰ'' اپنی زبان سے کہا اور یہی کہتے کہتے انتقال فرمایا۔

شعبان ۱۲۴۳ھ کی آٹھویں تاریخ تھی۔ (۲۴ر فروری ۱۸۲۸ء) اور انتقال رات کے وقت ہوا تھا، اگلے دن صبح کے وقت شاہ اسمٰعیل، مولوی محمد حسن رام پوری، قاضی علاءالدین بگھروی، میاں جی نظام الدین چشتی اور میاں جی محی الدین غسل میت میں مصروف ہو گئے۔ سید صاحب مولانا کے فضائل ومحاسن بیان کرتے رہے۔ آپ نے فرمایا: ''مولانا دین کے ایک رکن تھے اور بڑی برکت والے شخص تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو اٹھالیا، جو مرضی مالک کی۔''

آنکھوں سے برابر آنسو بہہ رہے تھے۔ جنازہ اٹھانے والوں میں خود سید صاحب بھی تھے۔ آپ ہی نے نماز جنازہ پڑھائی جس میں اہلِ خہر کے علاوہ تقریباً سات سو مجاہدین شریک تھے۔ خہر کے جنوب مشرق میں ایک تیر کے فاصلے پر قبرستان تھا۔ جہاں لشکر اسلام کے اس مایۂ ناز شیخ الاسلام کو دفن کیا گیا۔ آج کل یہ مزار ''دلجی بابا'' کا مزار کہلاتا ہے۔

## اہل وعیال:

اوپر بیان کیا جاچکا ہے کہ شاہ عبدالعزیز کی صاحبزادی سے مولانا کے کوئی اولاد نہ تھی۔ غالبًا اس اہلیہ کی وفات پر مولانا نے اپنی چچیری بہن سے شادی کی۔ جن سے عبدالقیوم پیدا ہوئے۔ جب سید صاحب نے نکاحِ بیوگان کی سنت تازہ کی تو شاہ اسمٰعیل نے محض بہ غرض احیاء سنت اپنی بیوہ ہمشیر کی شادی مولانا عبدالحی سے کردی تھی، گویا انتقال کے وقت مولانا نے دو بیوائیں چھوڑیں، سید احمد علی رائے بریلوی نے نواب وزیر الدولہ کو مولانا کے انتقال کی اطلاع دیتے ہوئے لکھا تھا کہ دونوں بیواؤں کے لیے امداد کا بندوبست کردیا جائے۔

## علم وفضل:

مولانا عبدالحیؒ کے علم وفضل کی تعریف خود شاہ عبدالعزیزؒ نے فرمائی ہے۔ ایک مرتبہ کہا کہ علم تفسیر میں مولانا عبدالحی میرا نمونہ ہیں۔ ایک خط میں شاہ صاحب نے مولانا اور شاہ اسمٰعیل کو تاج المفسرین فخر المحدثین اور سرآمد علمائے محققین لکھا، نیز فرمایا کہ دونوں تفسیر، حدیث، فقہ، اصول، منطق وغیرہ میں مجھ سے کم نہیں، دونوں کو علمائے ربانی میں شمار کیا۔ خود مولانا کی یہ حالت تھی کہ بار بار فرماتے، مجھے جو کچھ ملا، سید صاحب کی برکت سے ملا۔

(ماخوذ: از جماعت مجاہدین)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# عرض مرتّب

ایسی حمد وثنا جو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ کے شایانِ شان ہو، سوائے اس ذات پاک کے کوئی اس کو بیان ہی نہیں کرسکتا، اور اس دعوے کی دلیل اللہ کے رسول ﷺ کی یہ ارشاد گرامی ہے "لا أُحْصِیْ ثَنَاءً عَلَیْكَ أَنْتَ كَمَا أَثْنَیْتَ عَلٰی نَفْسِكَ" (۱)۔ اور ایسا شکر جو اس کی ان لاتعداد اور بے شمار نعمتوں کا حق ادا کرے جو ہر وقت بنی نوعِ انسان پر برستی رہتی ہیں، کسی مخلوق سے نہیں ادا ہوسکتا اور شکر خود ایک ایسی نعمت ہے جس کے مدّ مقابل کوئی نعمت نہیں، لہٰذا اگر تمام عالَم خلق وامر جو کہ شخص اکبر سے موسوم ہے، اپنے جیسے ہزاروں عالَم کے ساتھ اس وادی شکر میں قدم رکھ کر ابد تک بے انتہا جدوجہد کرے اور پھر نعمتوں کے بقدر شکر کا خیال اس کے دل میں گزرے تو وہ حسرت وندامت سے پانی پانی ہوجائے، اپنی بڑی کوتاہی کا احساس کرے اور ہزار زبانوں سے اپنی بے زبانی کا اعتراف کرکے "وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا" (۲) کے فیصلے کو بندگی کے محکمے میں اپنی عاجزی ودرماندگی پر بطور شاہد عدل پیش کرے۔

غرض اس مشت خاک (انسان) سے اس کا تھوڑا بھی شکر نہیں ادا ہوسکتا مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنی عام مہربانی سے اس کا حکم فرماتا ہے تو مجبوراً اس بیچارہ کا چارہ اسی میں ہے کہ وہ بے بس ہوکر حکم خداوندی کی تعمیل میں "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ" کہہ کر کبھی بھی کوتاہی کے گریبان سے اپنا سر باہر نہ نکالے اور اس حقیقی بادشاہ کی ولایت ونگرانی کے تصور میں کہ خود اس بے مثل وبے نظیر ذات نے اس ناچیز کو اپنی تعریف وشکر کی تعلیم دی، ہمیشہ اس نعمت عظمیٰ کی لذت سے لطف اندوز ہوتا رہے۔ اور "اَشْهَدُ أَنْ لَّآ إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا

شَرِيكَ لَهٗ وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ" اور "سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَا اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ" کواپنا رفیق وہمدم اور مونس بنائے رکھے۔

اور بے شمار درود پاک عالم وجود کے نشان، فخر موجودات، صاحب مقام محمود، پیشوائے اتقیاء، خاتم النبیین، چمن رسالت کے پر رونق وپر بہار پھول، گلشن نبوت کے گل سرسبد اور خلاصۂ کائنات پر نازل ہو جس سے میری مراد احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ صَلَـوَاتُ اللّٰـهِ وَسَلَامُهٗ عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَأَصْحَابِهٖ أَجْمَعِيْنَ وَعَلٰى وُرَّاثِهٖ وَنُوَّابِهٖ إِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ وَعَلَيْنَا مَعَهُمْ وَفِيْهِمْ بِرَحْمَتِكَ يَا أَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ کی ذات گرامی ہے۔

امابعد! اللہ جل شانہٗ کی رحمت کا امیدوار، عاجز ذلیل، بندۂ ضعیف محمد اسماعیل عرض کرتا ہے کہ اس ناچیز پر حق تعالیٰ کی لامحدود نعمتیں ہیں اور (بعد از ایمان) ان میں سب سے بڑی نعمت فخر خاندان سیادت، مرجع ارباب ہدایت، مرکز دائرہ ولایت، ہادی سبیل فلاح و رشاد، رہنمائے طریق مستقیم، مظہر انوار نبوی، منبع آثار مصطفوی، پاکیزہ خانوادے کے جوہر اور سید الاولیاء یعنی حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کے بڑے لڑکے سند الاصفیاء حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے خاندان عالی کی بزرگ شخصیت مقتدائے اصحاب شریعت، پیشوائے ارباب طریقت، ہادی زمانہ، مرشد یگانہ، سراج المحبین، تاج المحبوبین اور یکتائے روزگار امام سید احمد متع اللّٰه المسلمين بطول بقائه ونفعنا وسائر الطالبين بأقواله وأفعاله وأحواله کی بزم ہدایت میں حاضری ہے۔

اور یہ ہیچ مداں اس مجلس ملائکہ صفت محفل میں حاضر ہو کر کلمات عالیہ سے مستفید ہوا تو عام مسلمانوں کی نصیحت اور تمام طالبین کی خیر خواہی کا تقاضا دل میں پیدا ہوا کہ ان فیوض عالیہ اور ملفوظات متبرکہ میں غائبین بھی حاضرین کے ساتھ شریک ہوں، اور اس کی صورت بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ ان بلند پرواز مضامین کو تحریر کے پنجرے میں قید کر دیا

جائے۔ اگرچہ عیاں اور بیاں میں اور حضور وغیبت میں فرق ہے جو کسی عقلمند پر پوشیدہ نہیں اور حدیث "الشَّاهِدُ يَرىٰ مَا لَا يَرَاهُ الْغَائِبُ" (۳) اس پر شاہد عدل ہے۔ لیکن بحکم مقولہ "ما لا يدرك كله لا يترك كله" میں نے اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے کمر ہمت باندھی اور اخلاص نیت کے ساتھ بھرپور کوشش کی۔ اور وہ کاپی جس میں جناب افادت مآب، قدوۃ الفضلاء، زبدۃ العلماء مولانا عبدالحی مدظلہ العالی نے جو حضرت سید احمد دامت برکاتہم کے خاص مریدوں میں سے ہیں، رشد وہدایت کی باتیں حضرت سید صاحب کی زبان سے سن کر تحریر کی ہیں، دستیاب ہوئی تو اس کاپی کو غنیمت سمجھ کر اس کتاب کے دوسرے اور تیسرے باب کے طور پر اس میں شامل کیا۔

اگرچہ اس کتاب کی تالیف میں مناسب یہ ہوتا کہ جس طرح اس کتاب کے اکثر مضامین کو قلمبند کرنے میں صرف حضرت والا کے ملفوظات کی ترجمانی پر اکتفا کیا گیا ہے اسی طرح کتاب کے تمام مضامین میں یہی طریقہ اختیار کیا جاتا، لیکن چوں کہ حضرت کی ذات گرامی ابتدائے آفرینش سے رسول اللہ ﷺ کی کمال مشابہت پر پیدا کی گئی ہے، اس لیے آپ کی لوح فطرت علوم رسمیہ کے نقوش، دانشمندوں کی تقریر اور مصنفوں کی تحریر کے انداز سے صاف وشفاف ہے اور ان رازہائے سربستہ اور دقیق وعمیق مضامین کا سمجھنا بغیر تمہید ومقدمہ اور مثالوں کے اور بجز ان مضامین کو سلف متقدمین کی اصطلاحوں پر تطبیق دیے لوگوں کے ذہنوں پر جو کہ علوم رسمیہ کے عادی ہو چکے ہیں صرف آپ کی زبان برکت نشان سے صادر ہوئے کلمات ذکر کرنے سے دشوار معلوم ہو رہا تھا، اس واسطے کتاب ہذا میں قارئین کی سہولت کے لیے بعض جگہ کچھ تقدیم وتاخیر سے کام لیا گیا اور معروضات کی تھوڑی تمہید اور مثالیں لکھی گئیں، اور اس کو سلف کی اصطلاحات بالخصوص قطب المحققين، فخر العرفاء المكملين، أعلمهم بالله الشيخ ولي الله قدس سرهٗ (۴) کی اصطلاح پر منطبق کیا گیا، تاکہ اس کا سمجھنا آسان ہو جائے۔

مع ہذا اس ناچیز نے اس کتاب کے ہر حصّے کو لکھنے کے بعد حضرت سید صاحب کو سنایا، تاکہ صحیح، غلط سے اور مقصود، غیر مقصود سے الگ ہو جائے اور اس ہیچ مداں کی ناقص عقل کی مداخلت سے جو خامی اس کتاب میں واقع ہوگئی ہو وہ حضرت والا کی اصلاح سے دور ہو جائے۔ اس کتاب کا نام ''صراط مستقیم'' رکھا اور اس کو ایک مقدمہ، چار ابواب اور ایک خاتمہ پر مرتب کیا اور ابواب کو فصلوں پر اور فصلوں کو ہدایات پر اور ہدایات کو تمہیدات وافادات پر تقسیم کیا اور مبادی کو لفظ تمہید سے اور مقاصد کو لفظ افادہ سے شروع کیا۔

وما توفيقي إلّا باللّٰه عليه توكلت وإليه أنيب

# مقدمہ

## راہِ نبوت کے راہِ ولایت سے امتیاز کا بیان

یہ مقدمہ تین افادات پر مشتمل ہے:

### پہلا افادہ: حبّ عشقی اور حبّ ایمانی کا ذکر

معلوم ہونا چاہیے کہ شریعت وطریقت کا خلاصہ اور حقیقت ومعرفت کی بنیاد اللہ تعالیٰ کی محبت کو حاصل کرنا ہے جیسا کہ حدیث شریف "مَنْ كَانَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِمَّا سِوَاهُمَا" (۵) اس امر کی صراحت کرتی ہے اور آیت کریمہ "وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَشَدُّ حُبًّا لِلّٰهِ" (۶) اس کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ اس مسئلہ پر اگر چہ تمام صوفیۂ کرام اور جمیع طوائف انام متفق ہیں، مگر یہاں پر ایک باریک نکتہ ہے جس سے اکثر لوگ غافل اور ناواقف ہیں اور وہ نکتہ حُبِّ نفسانی جو عشق سے موسوم ہے اور حُبِّ ایمانی جو حب عقلی سے مشہور ہے کہ درمیان فرق وامتیاز ہے۔

پہلی محبت مبادیِ سلوک کی واردات سے ہے اور دوسری محبت انبیاے کرام کے کمالات اور اولیاے عظام کے مقامات میں سے ہے، اکثر عام اہل تصوف پہلی کو دوسری کی جگہ پر رکھ کر اور اسی کو اشارات شرعیہ کا مشارٌ الیہ سمجھ کر انبیاء اور اولیاء کے حالات کو اہل عشق ووجدان کے احوال پر تطبیق دینے میں بے فائدہ مغزماری کرتے ہیں، حالاں کہ ان بزرگوں کے حالات زندگی کا ان سالکین کے واردات سے کوئی جوڑ ہی نہیں۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ عشق سے مراد وہ قلبی سوزش اور بے قراری ہے جو انسان کے باطن میں مقصود کے حاصل نہ ہونے کی صورت میں پیدا ہوتی ہے اور پھر تمام قواے

باطنہ میں سرایت کرجاتی ہےاوراس کی انتہااس مقصود کی دستیابی اوراس محبوب کا وصال ہے۔

اوّلاً اس کیفیت کی جاے وقوع دل ہے جوتمام کیفیات نفسانیہ کا مقام ہےاور ثانیاً تمام قوائے باطنہ ہیں اوراس کی انتہا مطلوب کی تحصیل میں طالب کی بے خودی وفنائیت ہے، پھر جب مقصود ہم دست ہو جاتا ہےتو بے چینی دور ہوجاتی ہےاور وہ کیفیت جس کوعشق کہاجاتاہے، زائل ہوجاتی ہے۔

اور حبِّ عقلی سے مراداس چیز کی طلب کا داعیہ پیدا ہونا ہے جس کےفوائدومنافع کے پیش نظر طالب نے خودکواس کامحتاج سمجھا ہواور اس جذبے نے طلب کے راستے کی تکلیفوں اور مشقتوں کواس پر آسان کردیا ہواوراس وجہ سے اس نے اس کی تلاش میں عزم مصمم کیا ہواور ہر وہ حیلہ جس کووہ اختیار کرسکتا تھا، اس نے وہ حیلہ اس کو پانے کے لیے اختیار کیا ہواوراپنے سارے سازوسامان کو بالاختیار داؤپر لگادیا ہونہ کہ بطور مجبوری۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ اس محبت کا محل عقل ہے جوتمام معلومات کا خزانہ ہے اور دوسرے یہ کہ تمام قوائے باطنہ میں یہ داعیہ اثر انداز ہوتاہے جیسا کہ پانی درخت کی جڑ سے اس کے برگ وبار میں سرایت کرجاتاہے، لہٰذاوہ اپنی عقل میں کیسے کیسے افکاروخیالات اس کوحاصل کرنے کے واسطے لاتاہے، اس کے دل میں کیا کیا عزائم وارادے اس کی طلب کے لیے اٹھتے ہیں اوراعضاوجوارح اس کی تحصیل کے راستے میں کیسی کیسی زحمتوں اورترک مالوفات (ناگواریوں) کواپنے اوپر گوارہ کرتے ہیں، اور جیسا کہ پہلی حب کا نتیجہ فنائے علم واحساس یعنی بےخودی اور بےشعوری کی کیفیت اور محبوب کے ماسوا سے آنکھیں بند کرلینا ہے یہاں تک کہ ایسا شخص اپنی ذات سے بھی بےخبر ہوجاتا ہے، ایسے ہی دوسری محبت کا ثمرہ فنائے فکروارادہ ہے یعنی جوکچھ وہ کہتاہے اپنے محبوب سے کہتاہےاور جوکچھ وہ سنتا ہے اسی سے سنتاہےاور ہر وہ فکرونظر جس کا نتیجہ محبوب کے حصول اوراس کے راستے میں چلنے کے علاوہ کچھ اور ہو، وہ اس کے نزدیک وساوس کی جنس سے ہیں جن کی پروانہیں کی جاتی۔

اور ہر وہ محبت ونفرت اور پسند و ناپسند جو کہ محبوب اور اس کے راستے کے مناسب ومخالف نہ ہو، اس کے نزدیک رکاوٹوں کے سلسلے سے ہے جن کی طرف توجہ نہیں کی جاتی۔

غرض کہ مقصود کو حاصل کرنے کا ارادہ اور اس کے راستے کو ہموار کرنے کا جذبہ طالب کے ظاہر و باطن پر مسلط ہو جاتا ہے پہلی محبت کے برخلاف کہ اس میں محبت کرنے والے کے تمام باطن میں محبت کا سرایت کر جانا اس کی صحت کی دلیل نہیں ہو سکتی، کیوں کہ بہت ایسا ہوتا ہے کہ کسی چیز سے محبت اس کی عقل کی نفرت کے باوجود ہو جاتی ہے خاص کر دونوں محبتوں (حب عشقی اور حب عقلی) کے درمیان تعارض کے وقت ایسا واقعہ ضرور پیش آتا ہے۔

مثلاً ایک دیندار اور والدین کے ساتھ حسن سلوک کرنے والے نوجوان کو کسی عورت یا کسی بے ریش لڑکے سے عشق ہو جاتا ہے اور چوں کہ شارع یا والدین جو اس کے نزدیک حب عقلی کی وجہ سے محبوب ہیں، اس کام سے روکتے ہیں تو یقیناً وہ سعادت مند نوجوان اس معشوق کو بلکہ اس کے عشق کو قابل نفرت اور ناپسندیدہ سمجھتا ہے اگرچہ اپنی طبیعت کی مجبوری سے اس پر فریفتہ ہو۔

اور جہاں تک دوسری محبت کی بات ہے تو چوں کہ اس کا اصلی محل عقل ہے جو طبعی قوتوں پر اپنی گرفت مضبوط کر کے محبّ کے تمام باطن کو مسخر کر لیتی ہے، اس لیے کسی اور کے لیے اس میں کوئی گنجائش نہیں۔ اور جیسا کہ پہلی محبت محبوب کو پا لینے کے بعد ختم ہو جاتی ہے اور سوزش عشق فرو ہو جاتی ہے اسی طرح دوسری محبت محبوب کے وصال سے ترقی کرتے کرتے ہزار گنا بڑھ جاتی ہے اور اس قدر وسعت اختیار کر لیتی ہے کہ ہرگز اس وسعت وقوت کا تصور جدائی میں نہیں کیا جا سکتا، کیوں کہ پہلی محبت کی بنیاد محبوب کو نہ پانے پر ہے اور اس کی شرط جدائی ہے اور قاعدہ یہ ہے کہ "وَاِذَا فَاتَ الشَّرطُ فَاتَ الْمَشْرُوطُ" (جب شرط نہیں پائی جاتی تو جو شرط لگائی جاتی ہے اس کا بھی اعتبار نہیں ہوتا)۔

اور دوسری محبت کی بنیاد محبوب کی مفید وکارآمد چیزوں اور اس کے کمالات کی

معرفت اوراس کی طرف اپنی احتیاج کے علم پر ہے اور یہ باتیں وصال کی صورت میں بہت زیادہ واضح ہوجاتی ہیں کیوں کہ علم الیقین عین الیقین سے بدل جاتا ہے، اور تفصیل کے ساتھ اجمال کی شرح ہوجاتی ہے۔

**حبِّ عشقی کی مثال:** مثلاً کسی پیاسے شخص کو پیاس کے وقت معدہ میں حرارت، سینے میں جلن اور لب پر خشکی کے وقت پانی سے عشق ہوجاتا ہے اور وہ اپنے دل کی گہرائی سے پانی کی طرف مائل ہوتا ہے اور اس کے نہ ملنے سے اسے بے چینی و بے قراری ہوتی ہے، اگر چہ اس نے کسی سے یہ نہ سنا ہو کہ پانی پیاس کو بجھاتا ہے اور اگر چہ اس کی عقل جسمانی یا نفسانی نقصان کے اندیشے کی وجہ سے پانی کے استعمال سے منع کرتی ہو۔ اور جب عین پیاس کی شدت میں اسے ٹھنڈا پانی مل جاتا ہے، وہ اس سے سیراب ہوجاتا ہے اور وہ سیرابی اس کے جسم کے ہر جوڑ اور بدن کے ہر حصے میں سرایت کر جاتی ہے تو اس وقت ایک ایسی حالت اس پر طاری ہوتی ہے کہ اس کی تعبیر بجز پانی کے ہر چیز کو فراموش کر دینے کے سوا کسی اور چیز سے نہیں کی جاسکتی، بلکہ بہت ایسا ہوتا ہے کہ نشہ کے مثل ایک خمار اس پر چڑھ جاتا ہے اور وہ اس کی وجہ سے تھوڑی دیر کے لیے بے خود و مدہوش ہوجاتا ہے اور تشنگی کی کیفیت بالکل دور ہوجاتی ہے۔

**حب عقلی کی مثال:** اسی طرح کسانوں و کاشت کاروں کو پانی سے حب عقلی کا تعلق ہوتا ہے اس واسطے کہ ان کا دل پانی حاصل کرنے کی طرف اس وجہ سے مائل ہوتا ہے کہ وہ قطعی طور پر جانتے ہیں کہ ان کے کھیت، چراگاہ اور باغات جو سرمایۂ حیات اور اساس زندگی ہیں، پانی کے بغیر سرسبز و کارآمد نہیں ہوسکتے۔ غرض یہ کہ انھوں نے خود کو پانی کا حد درجہ محتاج اور غلوں و پھلوں کے واسطے اس کے بہت زیادہ کارآمد ہونے کو سمجھا تو ان کے ذہن میں پانی کی طلب کا خیال پیدا ہوا اور انھوں نے اپنی پوری توجہ اس کی تلاش میں صرف کر دی، پس وہ کس قدر دعائیں اور الحاح وزاری بارش کے واسطے کرتے ہیں اور کیسی کیسی

تدبیریں اور حیلے، چرخوں اور پانی مشینوں کے واسطے اختیار کرتے ہیں اور کتنی مشقتیں وہ اوران کے چوپائے کنوؤں ونہروں کو کھودنے اور حوضوں کو درست کرنے میں دن رات اٹھاتے ہیں اوران سب امور کو اپنا فخر وکمال تصور کرتے ہیں اور پورے اہتمام کے ساتھ ان کاموں میں مصروف ہوکر ایسی سرگرمی و پھرتی دکھاتے ہیں کہ سستی واضمحلال کا سایہ بھی ان پر نہیں پڑتا اور اگر کوئی کسان ان کاموں میں سستی کرے تو دوسرے کسان ضرور اس پر طعن وتشنیع کریں گے اوراس کو بیوقوف وکم ہمت کہیں گے۔

اور کسانوں کو جس قدر پانی حاصل ہوتا ہے اسی قدر وہ اس کے فوائد ومنافع پر عین الیقین سے مطلع ہوتے ہیں اور اپنی تمام کوششوں ومشقتوں کو جو انھوں نے اس کی طلب وحصول میں اٹھائی تھیں، بجا اور برمحل سمجھتے ہیں، اس پر خوش ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں اور مزید تکلیفوں کا سامنا کرنے میں بہت چست وچالاک ہوجاتے ہیں۔

جب مقدمہ ذہن نشیں ہوگیا تو معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ اپنے کچھ خاص بندوں کو جن کی قسمت میں سعادت ازلی پہلے سے طے شدہ ہوتی ہے محض اپنے فضل وکرم سے منتخب کر کے محبت کی ہر دو قسم میں سے ایک قسم یا دونوں قسموں کی طرف اپنی نسبت کے ساتھ رہنمائی کرتا ہے، اوران کو دونوں جہاں کے اس سرمایۂ سعادت سے بہرہ ور ہونے کی توفیق بخشتا ہے اور وہ حضرات اس کے ثمرات ونتائج پر فخر محسوس کرتے ہیں "ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاءُ" (۷)۔

محبت کی ان دو قسموں میں سے ہر ایک کے کچھ اسباب، مؤیدات، آثار اور نتائج ہیں جو اسی قسم کے ساتھ خاص ہیں اور چوں کہ راہ حق کا طالب محبت کی دونوں قسموں میں سے ایک کو دوسرے سے انھیں باتوں کے ذریعے جدا سمجھتا ہے، اس لیے ان چاروں چیزوں کا نام "وُجُوْهُ تُمَايِزُ فِيْمَا بَيْنَ النَّوْعَيْنِ" (محبت کی دونوں قسموں کے درمیان فرق کرنے والی باتیں) رکھا گیا۔

## دوسرا افادہ: دونوں طریقوں کے القاب کا ذکر

چوں کہ حبّ ایمانی اور اس کے احوال ومقامات اور نتائج وثمرات نبوت پر جا کر ختم ہوتے ہیں اس لیے اس طریقے کو جس کی ابتدا حب ایمانی سے ہوتی ہے اور اس کی انتہا نبوت پر ختم ہوتی ہے، راہ نبوت اور نسبت نبوت سے موسوم کیا گیا۔ اور چوں کہ حب عشقی اور اس کے حالات ومقامات اور نتائج وثمرات کی انتہا اللہ تعالیٰ کے سامنے تمام اشیاء کے حقائق کی معدومی کی معرفت پر ہوتی ہے اور یہ معرفت ولایت کا نچوڑ اور خلاصہ ہے، اس لیے اس طریقے کو جو حب عشقی سے شروع ہوتا ہے اور معرفت پر منتہی ہوتا ہے، راہ ولایت اور نسبت کا نام دیا گیا۔

## تیسرا افادہ: ابوابِ کتاب اور ان کی وجہ ترتیب کا ذکر

اس امت کے اکابرین یعنی ائمۂ طریقت اور پیشوایانِ حقیقت اگرچہ طریق نبوت کے کمالات سے متصف اور اس کے نتائج کے مقام میں راسخ القدم تھے، لیکن انھوں نے اس کے حاصل کرنے کے طریقے کو راہ ولایت کی تحصیل کے طریقے سے علاحدہ نہیں کیا تھا اور اس کے مباحث میں مستقل کلام نہیں فرمایا تھا اور اس کے مبادی کی تعیین میں سعی بلیغ نہیں کی تھی، اس لیے مناسب معلوم ہوا کہ اس کتاب کا ایک باب دونوں محبتوں کے درمیان فرق کرنے والی باتوں کے بیان کے واسطے باندھا جائے اور چوں کہ ہر راستے کے آثار وعلامات کی دریافت اس راستے پر چلنے سے پہلے کی جاتی ہے اس لیے اس باب کو تمام ابواب سے پہلے لکھا گیا۔

اور چوں کہ بری باتوں سے نفس کا تزکیہ اور اچھی باتوں سے اس کی آراستگی اور عبادتوں کو اس طریقے کے مطابق ادا کرنا جو شارع کو مقصود ہے، راہِ نبوت کی بنیاد اور راہِ ولایت کو ترقی دینے والا ہے، لہٰذا ضروری معلوم ہوا کہ کتاب کے اس باب کو جو اوصاف حمیدہ سے آراستگی، بری عادتوں سے کنارہ کشی اور عبادتوں کو صحیح ڈھنگ سے ادا کرنے کے بیان پر مشتمل ہے دونوں محبتوں کے درمیان فرق کرنے والی باتوں کے بیان کے بعد اور

دونوں طریقوں کے سلوک کے بیان سے پہلے ذکر کیا جائے تاکہ طالبین راہِ نبوت کو اپنے کام کا نتیجہ حاصل ہو جائے اور سالکین راہِ ولایت کو اپنی کوشش کے ثمرات نظر آنے لگیں۔

اکابرین طریقت نے اگرچہ راہ ولایت کی بنیادی باتوں: اذکار، مراقبات، ریاضات اور مجاہدات کی تعیین میں خوب جدوجہد کی ہے، لیکن بموجب اس جملہ کے ''ہر سخن وقتے و ہر نکتہ مکانے دارد'' (ہر بات کا ایک وقت اور ہر نکتہ کی ایک جگہ ہوتی ہے) ہر دور کے مناسب اشغال اور ہر زمانے کے مناسب ریاضات جداجدا ہوتے ہیں، اسی لیے ہر طریقے کے پیشواؤں میں سے اہل تحقیق نے اشغال کی جدت آفرینی میں بڑی بڑی کوششیں کی ہیں؛ لہٰذا وقت کا تقاضا یہ ہے کہ اس کتاب کے ایک باب کو نئے اشغال کے حوالے کیا جائے جو موجودہ دور کے مناسب ہوں۔

اشغال کی تجدید میں تین طریقوں یعنی قادریہ، چشتیہ اور نقشبندیہ پر اکتفا کیا گیا ہے، کیوں کہ یہی تینوں طریقے زیادہ مشہور ہیں لہٰذا ان تینوں طرق کے اشغال کی تجدید کے بعد باقی دوسرے طریقوں کے اشغال کی تجدید کی ضرورت نہیں رہ جاتی۔ اور چونکہ نسبت ولایت کا حصول راہِ نبوت کے سلوک کو آسان کر دیتا ہے اور صاحب نسبت ولایت نسبت نبوت کو تھوڑی کوشش سے حاصل کرسکتا ہے اس لیے بہتر معلوم ہوا کہ اس باب کو چوتھے باب سے جو سلوک راہِ نبوت پر مشتمل ہے، پہلے لایا جائے۔ وباللّٰہ التوفیق وبیدہ أزمة التحقیق.

# باب اوّل

# طریقۂ نبوت اور طریقۂ ولایت کے درمیان فرق کرنے والی باتوں کا بیان

اس باب کے تحت دو فصلیں ہیں، **پہلی فصل** طریقۂ ولایت کے امتیازات کے بیان میں ہے، اس میں چار ہدایات ہیں، پہلی ہدایت حب عشقی حاصل کرنے کے اسباب کی وضاحت میں ہے اور وہ دو افادات پر مشتمل ہے:

پہلا افادہ: دونوں طریقوں میں سے ہر ایک طریقے کے علاحدہ علاحدہ ذکر و فکر کا بیان

معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی محبت عام طور پر ذکر و فکر سے حاصل ہوتی ہے، البتہ وہ ذکر و فکر جو محبت کی دونوں قسموں میں سے کسی ایک محبت کے حصول کا سبب ہے وہ اس ذکر و فکر سے جدا ہے جو دوسری محبت کا ذریعہ بن سکتا ہے، چناں چہ ان دونوں محبتوں کے تفصیلی احکام کے ضمن میں اس نکتہ کی طرف اشارہ کیا جائے گا۔

دوسرا افادہ: حبّ عشقی کے حصول کی تصویر کشی کا بیان

جہاں تک حصول عشق کے سبب کی بات ہے تو اس کا بیان یہ ہے کہ جیسے آگ جو عناصر اربعہ میں سب سے زیادہ لطیف، صاف وشفاف اور بلند ہے جب زمین کے اجزاے لطیفہ سے جن کو دخان کہا جاتا ہے ملتی ہے تو ان کو اپنے حیّز کی طرف جو تمام احیاز عنصریہ میں سب سے اوپر ہے، کھینچتی ہے، تا کہ ان کو خود میں فنا کر کے آثار واحکام میں اپنی طرح بنا دے، لیکن غبار جو کہ فضا میں تھوڑا تھوڑا ہو کر جمع ہوا ہے چونکہ اس دخان کے حیّزِ آگ کی طرف چڑھنے سے رکاوٹ بنتا ہے اس لیے لامحالہ اقتضاے نار اور اقتضاے غبار کے درمیان ٹکراؤ ہوتا ہے جس کی وجہ سے بجلی کی ہولناک آواز اور اس کی چمک معرض وجود میں آتی ہے۔ یہاں تک کہ اجزاے ناریہ اپنی گرمی وحدت سے بعض رکاوٹوں کو پانی میں تبدیل

کر کے زمین پر برسا دیتی ہیں اور بعض موانع کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے فضا میں پراگندہ ومنتشر کر دیتی ہیں تا کہ اجزاے لطیفہ دخانیہ کو کشاں کشاں اپنی طرف کھینچ کر خود میں فنا کر سکیں۔

اسی طرح مبارک لفظ اللہ (اسم ذات) جو الفاظ کی دنیا میں حضرت حق تعالیٰ کی تجلی ہے جب حلق، زبان تالو اور کان کو اس طریقے کے مطابق اس کا ذاکر بنایا جاتا ہے جو ذکر جہری کے لیے صوفیہ کے درمیان متداول ہے اور جسے اطمینان قلب، لطافتِ روح، سکونِ خاطر اور دفع وساوس کے لیے وضع کیا گیا ہے تو ایسا ذکر ذاکر کو نور وسکون اور لذت سے مالا مال کر دیتا ہے۔ اور اسی طرح جب حلق، زبان، تالو اور کان کو اس طریقے کے مطابق لفظ اللہ کا ذاکر بنایا جاتا ہے جو ذکر خفی کے لیے صوفیہ کے درمیان رائج ہے اور جس طریقے کو اس لفظ کے ذریعے حلاوت پانے نیز خلوت، خاموشی، لوگوں کی ہم نشینی اور ان کے ساتھ گفتگو سے پرہیز کے ذریعے لطف حاصل کرنے کے لیے وجود میں لایا گیا ہے تو یہ ذکر ذاکر کے فکر وخیال کو معدومی وگمنامی عطا کرتا ہے۔ کبھی کبھی صرف اس لفظ کے ذکر سے یہ بات حاصل ہو جاتی ہے اور کبھی کبھی اس کے ساتھ نفی یا دوسری صفات کے ملانے سے طالب کا ذہن اس مبارک لفظ کے مفہوم کی طرف منتقل ہوتا ہے اور یہ ناموں کی دنیا میں حضرت حق تعالیٰ کی تجلی ہے جو تمام تجلیات میں سب سے زیادہ لطیف، بلند اور حق تعالیٰ کی ذات سے سب سے زیادہ قریب ہے۔ اور جب یہ تجلی یعنی اس لفظ کا مفہوم جو محض ایک بسیط لفظ ہے اس کے ذہن میں اس طور پر جاگزیں ہو جاتا ہے کہ اس کی نگاہ بصیرت ہمیشہ اس مفہوم کی طرف متوجہ رہتی ہے اور وہ آنکھ سے دیکھنے کی طرح اپنی قوت مدرکہ سے اس کو محسوس کرتا ہے، اس پر نظر ٹکائے رہتا ہے اور اس کے علاوہ دوسری چیز کی طرف دل سے متوجہ نہیں ہوتا ہے اور اگر کبھی کبھی غیر کا خیال اس کے ذہن میں آجائے تو یقیناً وہ اتفاقی امور سے ہوگا نہ کہ تہہ دل سے، اس کیفیت کو صوفیہ کی اصطلاح میں ''فکر'' کہتے ہیں۔

جب سالک اپنے پورے شعور وفکر کے ساتھ اس مفہوم میں مشغول ہو جاتا ہے تو وہ تجلی اس کی جان کا پیوند بن جاتی ہے اور سالک کے لطیف ترین جز کو جو کہ روح الٰہی ہے، اپنا

آشیانہ بنا لیتی ہے اور اس کو اپنے سے ملا کر اس کی اصل کی طرف کھینچتی ہے۔ اور روح الٰہی جس کا تعلق عالم پاک سے ہے اور آیت "قُلِ الرُّوحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ" (۸) سے اس امر کی تائید ہوتی ہے، اس نے اس مشت خاک (جسم) کے ساتھ مقید و محبوس ہونے کے باعث اپنی اصل کو بھلا دیا تھا اور اپنے آئینۂ احساس کو زنگ آلودہ کر دیا تھا تو جب اس تجلی کی روشنی سے اس کا چہرہ صاف ستھرا ہوا اور اس نے حق تعالیٰ کے کمالات کا عکس اپنے اندر دیکھا کہ حدیث "اِنَّ اللّٰہَ خَلَقَ آدَمَ عَلٰی صُوْرَتِہٖ" (۹) میں اسی طرف اشارہ ہے، تو اس نے اپنے فراموش کردہ وطن کو پھر سے یاد کر کے اپنی اصل کی طرف لوٹنے کی خواہش جتانا شروع کر دی۔ پس اس تجلی کا اس روح کو جذب کرنا اور اس روح کا جذب ہو جانا اس بیداری اور آگاہی کی وجہ سے ہے جو روح نے تجلی کی ٹھہراؤ سے حاصل کی تھی، پھر روح حظیرۃ القدس کی طرف چڑھنے کا ارادہ کرتی ہے اور رفیق اعلیٰ سے مل جانا چاہتی ہے، لیکن جب بشریت کا غبار عالم بالا تک پہنچنے سے اسے روکتا ہے تو ناچار روحانی اور نفسانی تقاضوں کے درمیان ٹکراؤ پیدا ہوتا ہے جس کی وجہ سے روح انسانی میں جس کو روح طبی کہتے ہیں، شورش، ہنگامہ اور گرمی پیدا ہوتی ہے جیسے گرمی اور شورش غصہ کے وقت اور اطمینان وکشادہ قلبی خوشی و مسرت کے وقت رونما ہوتی ہے۔

غرض یہ شورش و ہنگامہ اور گرمی جو روح نفسانی میں پیدا ہوئی ہے، طالب کو دیوانہ ومستانہ بنا دیتی ہے اور اس کی عقل وفکر کو تباہ کر دیتی ہے، بسا اوقات اس کو قانونِ شریعت اور ادب وتہذیب کی دنیا سے باہر پھینک دیتی ہے اور اس گرمی وشورش کی وجہ سے اسے جنگلوں اور میدانوں سے انس ہو جاتا ہے، مجلسوں اور گھروں سے وحشت ہو جاتی ہے اور وہ آہ وفغاں، چہرہ کی زردی اور اشک باری سے دوچار ہوتا ہے، اسی کیفیت کو عشق کہتے ہیں اور چونکہ اس کیفیت کو حاصل کرنے والا روح حیوانی ہے اس لیے اس کا نام حب نفسانی رکھا گیا اور یہ کیفیت وقتاً فوقتاً ترقی کرتی رہتی ہے یہاں تک کہ بشریت اور ناآشنائی کا حجاب پھٹ جاتا ہے اور نفسانی غبار پاش پاش ہو جاتا ہے اور اس محبت کا ثمرہ مرتب ہونے لگتا ہے۔

# دوسری ہدایت

## حبّ عشقی کی تائید کرنے والی باتوں کا بیان

**یہ ہدایت تین افادات پر مشتمل ہے:**

**پہلا افادہ: ریاضت کا ذکر**

حبّ عشقی کو سب سے زیادہ تقویت ریاضت سے ملتی ہے یعنی کم سونا کم بولنا اور لوگوں سے کم ملنا کیوں کہ روح حیوانی کو ان باتوں سے رقت و لطافت حاصل ہوتی ہے اور جس قدر روح حیوانی زیادہ رقیق و باریک ہوگی اسی قدر اس میں حدت و گرمی اور شورش زیادہ تیزی کے ساتھ پیدا ہوگی۔

**دوسرا افادہ: خوش الحان آوازوں سے لطف اندوز ہونے کا ذکر**

نیز اس کو تقویت پہنچانے والی باتوں میں خوش الحان و دلکش آواز داستان محبت اور عشقیہ اشعار کا سننا بھی شامل ہے۔

**تیسرا افادہ: روح طبی کو لطیف بنانے کا ذکر**

اسی طرح اس کے جملہ مؤیدات میں سے ان امور سے بچنا بھی ہے جو روح طبی میں کثافت پیدا ہونے کے باعث ہوں جیسے زیادہ سونا اور ہمیشہ کثیف غذاؤں کا استعمال کرنا وغیرہ جو تجربہ کاروں پر پوشیدہ نہیں۔

# تیسری ہدایت

## حبّ عشقی کے آثار کا بیان

یہ ہدایت پانچ افادات پر مشتمل ہے:

### پہلا افادہ: حبّ عشقی کے مقتضا کا بیان

حبّ عشقی کے جملہ آثار میں سے یہ ہے کہ یہ محبت حقیقی طور پر بشری حجاب کے چھٹنے اور روح الٰہی کو اس کی اصل تک پہنچنے کا تقاضا کرتی ہے اور بس۔ یہ محبت کسی قانون کے مطابق نہیں ہوتی خواہ وہ شرعی قانون ہو یا تمدنی قانون، نہ کسی کی رضا کی طلب گار ہوتی ہے خواہ وہ محبوب کی خوشنودی ہو یا اس کے علاوہ کسی اور کی، اور نہ کسی کی پیروی کا التزام کرتی ہے خواہ وہ معشوق کی پیروی ہو یا غیر کی۔ تم یہ نہ سمجھو کہ اس کلام سے ہمارا مقصود یہ ہے کہ اہل عشق و وجدان شرعی پابندیوں اور ادب و تہذیب کے مکلّف نہیں ہوتے اور اللہ تعالیٰ کی رضا کے طالب اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیروکار نہیں ہوتے، ہرگز نہیں، بلکہ اس گفتگو سے مقصود یہ ہے کہ یہ محبت حقیقی لحاظ سے ان امور کے متقاضی نہیں ہوتی بلکہ اس محبت سے سرشار شخص صرف حضرت حق تعالیٰ کے جمال کے مشاہدہ میں فنا چاہتا ہے، بس جس طریقے سے بھی یہ کیفیت اسے حاصل ہو جائے اس کی طلب میں کسی طریقے کی خصوصیت کا دخل نہیں ہے۔

مثلاً اگر حب عشقی کے حامل شخص کا خیال یہ ہو کہ میرا مقصد مزامیر کی سماعت، عشق مجازی، شغل برزخ (۱۰) اور اوقات کو اذکار و طاعات سے فارغ کرنے وغیرہ جیسی شرعی ممنوعات کے ارتکاب سے حاصل ہوگا تو وہ بخوشی ان کاموں کی طرف مائل ہوگا، اگرچہ وہ صاحب حال دین داری کے باعث اس ارادہ کو عملی جامہ پہنانے سے باز آجائے بلکہ اس خیال کے ازالے کی کوشش کرے۔

کیا تم نہیں دیکھتے ہو کہ عشق مجازی میں عاشق کو معشوق کی خوبصورتی کا مشاہدہ اور اس کا

قرب ووصال مطلوب ہوتا ہے اگرچہ وہ معشوق اس عاشق کی قربت سے ناراض ہوتا ہو اور تکلیف محسوس کرتا ہو، بلکہ بہت ایسا ہوتا ہے کہ یہ مجازی معشوق اپنے عاشقوں کو، بار بار دیکھنے اور اپنی مجلس میں آمدورفت سے منع کر دیتے ہیں اور اپنے قرب وجوار بلکہ اپنے محلے اور علاقے تک سے نکال دیتے ہیں، یہاں تک کہ گالی گلوج اور مار پیٹ تک نوبت پہنچ جاتی ہے؛ لیکن وہ عشّاق کسی بھی طرح نظر بازی اور اپنے معشوقوں کی مجلسوں میں آنے جانے سے باز نہیں آتے ہیں، بلکہ اپنے معشوقوں کے ہاتھ سے قتل ہونے، ان کے غصے کو برداشت کرنے اور ان کی گلی میں اپنی جان دینے کو انتہائی فخر اور بلند ہمتی شمار کرتے ہیں جیسا کہ ان کا منثور و منظوم کلام اس پر واضح دلالت کرتا ہے۔

کیا تم نہیں دیکھتے ہو کہ کسی کی نسبت گلہ وشکوہ کا لفظ زبان پر لانا کس قدر اس شخص کی ناراضی اور رنجش کا سبب ہوتا ہے اور مقام عقلی میں یہ بات شاکی کو کہاں تک پہنچا دیتی ہے! اس کے باوجود عشق مجازی والے ان جیسی حکایتوں اور شکایتوں کو زبان پر لانے سے احتیاط نہیں برتتے ہیں، بلکہ اپنی بات کو اس طرح کے مضامین سے رنگین ومزیّن کرتے ہیں۔ الغرض اس کلام سے مقصود حب عشقی کی توہین نہیں ہے، ہرگز نہیں بلکہ اس فرق کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے جو حب عشقی اور حب عقلی کے درمیان ہے۔

## دوسرا افادہ: تنہائی اختیار کرنے کا بیان

اس کی جملہ نشانیوں میں سے تنہائی ہے یعنی ایسا شخص محبوب کے ماسوا تمام چیزوں سے قطع تعلق کر لیتا ہے اور مختلف مشاغل اور تعلقات سے اس کے دل میں تنگی پیدا ہوتی ہے، نیز متفرق امور کے نظم وترتیب جیسے سیاست منزلی وسیاست مدنی، جماعتوں کی امامت اور عیدوں وجمعوں کی اقامت اور اہل قرابت وغیرہ کے حقوق کی ادائیگی سے اس کی ہمت پست ہوتی ہے، اسی لیے اس کو شادی سے جو کہ تمام تعلقات کی جڑ ہے، انتہائی نفرت ووحشت ہو جاتی ہے۔

## تیسرا افادہ: شیخ سے قلبی تعلق کا بیان

اس کی جملہ علامتوں میں سے یہ بھی ہے کہ مستقل طور پر اس کے دل کا تعلق اس

کے مرشد کے ساتھ مضبوط ہو جاتا ہے، یعنی اس لحاظ سے نہیں کہ یہ شخص اللہ تعالیٰ کے فیضان کا ذریعہ اور اس کی ہدایت کا واسطہ ہے، بلکہ بعینہ اس سے عشق ہو جاتا ہے، چناں چہ اس طریقے کے اکابرین میں سے ایک بڑے شخص سے منقول ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ میرے مرشد کی صورت کے علاوہ دوسری صورت میں تجلی فرمائے گا تو میں ہرگز اسے نہیں دیکھوں گا۔

## چوتھا افادہ: ظاہری علوم کی طرف عدم اعتنا کا بیان

نیز حبّ عشقی کے جملہ آثار میں سے علوم اور ظاہری طاعات کی طرف سے بے اعتنائی ہے، کیوں کہ ان علوم سے اشتغال مختلف کاموں کے نظم و ترتیب کی قبیل سے ہے اور اس کا معاملہ سادگی در سادگی ہے، اس لیے ایسے کام اس کے کاروبار کو منتشر اور پراگندہ کر دیتے ہیں۔

## پانچواں افادہ: صاحب حبّ عشقی کا شریعت کے ظاہر و باطن کے اتصال کو نہ سمجھنے کا بیان

اسی طرح اس کی جملہ نشانیوں میں سے اس تعلق کا نہ سمجھنا ہے جو شریعت کے ظاہر اور اس کے باطن کے درمیان واقع ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ شریعت کا ایک باطن ہے اور وہ اللہ جل شانہٗ سے قلبی تعلق ہے اور اس تعلق کے مختلف گوشے ہیں، جن میں سے ہر ایک گوشے کو نسبت کہتے ہیں، ان شاء اللہ اس کی تفصیل اپنی جگہ پر آئے گی۔ اور ایک شریعت کا ظاہر ہے اور وہ ان باتوں کو بجالانا ہے جن کا حکم دیا گیا ہے اور ان امور سے باز رہنا ہے جن سے منع کیا گیا ہے اور ان ظاہری اعمال اور قلبی تعلقات کے درمیان ایک باریک جوڑ ہے جس کو امام المحققین اور رئیس المدققین شیخ ولی اللہ قدس سرہٗ نے بتوفیق الٰہی شرح و بسط کے ساتھ بیان کیا ہے۔

پس جو شخص اپنے وجدان سے اس تعلق کو سمجھ لیتا ہے اس کی عبادت بالکل خالص مغز کی طرح ہو جاتی ہے اور اس کے احوال اعمال سے وابستہ ہو جاتے ہیں۔ ورنہ جو شخص صرف ظاہری اعمال شرعیہ کو اختیار کرتا ہے تو وہ محض قشری اور خشک زاہد بن کر رہ جاتا ہے اور جو شخص صرف شریعت کے باطن کو اختیار کرتا ہے اور اس کے ظاہر کو غیر معتبر جانتا ہے تو اس کے عقائد میں کفر و الحاد جگہ پا لیتے ہیں، اور چوں کہ اس تعلق کا سمجھنا وحدت احوال میں بہت سے

کاموں کے نظم ونسق کی قبیل سے ہے، اس لیے اس میدان میں حب نفسانی والے کے لیے دوڑ دھوپ کی کوئی گنجایش نہیں، مگر ارباب حب عقلی کی تقلید کے ذریعے۔

ان ذکر کردہ علامات سے دوسری علامتوں کا پتہ لگانا جنھیں جگہ کی تنگی کے باعث تحریر نہیں کیا گیا، اہل عقل ودانش پر دشوار نہیں۔ "العاقل تکفیه الإشارة" عقلمند کے لیے اشارہ کافی ہے۔

# چوتھی ہدایت

## حب عشقی کے نتائج کا بیان

اس میں تین افادات ہیں:

پہلا افادہ: مشاہدات کا ذکر

جب کیفیت عشقیہ کی گرمی وتیزی اور تجلی علمی کے جذب کی قوت اور روح الٰہی کے مکمل طور پر جذب ہوجانے کی وجہ سے شہود ومثال کا غبار چھٹ جاتا ہے اور روشنی وتاریکی کا پردہ پھٹ جاتا ہے تو ضرور وعدۂ الٰہی "وَ الَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا" (۱۱) اور ارشاد خداوندی: "فَاذْکُرُوْنِیْ اَذْکُرْکُمْ" (۱۲) کے مطابق اسے اللہ تعالیٰ کے دائمی جمال کا مشاہدہ نصیب ہوتا ہے اور قربت ومعیت جو "اَنَا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِیْ بِیْ" اور "اَنَا مَعَهٗ اِذَا ذَکَرَنِیْ" (۱۳) اور "اِحْفَظِ اللّٰهَ تَجِدْهُ تُجَاهَكَ" (۱۴) سے واضح ہوتی ہے اور جس کو وصال سے تعبیر کرتے ہیں، اسے حاصل ہوجاتی ہے۔

اور اس عاشق نے جو دقت وپریشانی اور زحمت وتکلیف محرومی ومہجوری میں اٹھائی تھی، اب وہ ان کے صلے میں خوش وخرم ہوتا ہے اور ہم کلامی وسرگوشی کا شرف حاصل کرتا ہے۔ خلاصۂ کلام یہ کہ پریشانی الفت سے اور وحشت انسیت سے بدل جاتی ہے۔

## دوسرا افادہ: فنا وبقا کا ذکر

جب توفیق ایزدی اس مشاہدہ کی خوشی سے سرمست شخص کا ہاتھ پکڑ کر اوپر کی طرف کھینچتی ہے تو فنا وبقا کا مقام پردۂ خفا سے ظہور میں آتا ہے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ جیسے لوہے کے ٹکڑے کو آگ میں ڈالتے ہیں اور آگ کے شعلے ہر چہار جانب سے اس کا احاطہ کر لیتے ہیں، بلکہ لطیفیہ ناریہ کے اجزاء اس لوہے کے ٹکڑے کے نفس جوہر میں داخل ہو جاتے ہیں اور اس کی شکل ورنگ کو اپنا جیسا بنا دیتے ہیں اور حرارت وتپش جو آگ کی خصوصیت ہے اس کے اندر بھی داخل ہو جاتی ہے تو ضرور اس وقت وہ لوہے کا ٹکڑا آگ کے انگاروں میں شمار ہوگا، ایسا نہیں کہ وہ لوہا اپنی حقیقت سے بدل گیا اور خالص آگ بن گیا؛ کیوں کہ یہ بات بالکل باطل ہے، بلکہ یہ لوہے کا ٹکڑا درحقیقت لوہا ہی ہے، لیکن آگ کے شعلوں کے ہجوم کی وجہ سے اس نے اپنے احکام وخواص سے دست برداری اختیار کر لی ہے اور کسی گوشے میں جا کر چھپ گیا ہے، لہٰذا جو آثار واحکام آگ پر مرتب ہوتے ہیں، وہی آثار واحکام بے کم وکاست اس لوہے کے ٹکڑے پر بھی مرتب ہو سکتے ہیں۔ نہیں نہیں بلکہ (درحقیقت) وہ آثار واحکام اب بھی آگ ہی پر فٹ ہیں کہ اسی نے اس لوہے کے ٹکڑے کو گھیر رکھا ہے، لیکن جب اس آگ نے اس لوہے کے ٹکڑے کو اپنی سواری بنا کر اپنی سلطنت کا تخت قرار دے دیا تو آگ کے آثار واحکام کو اس لوہے کی طرف منسوب کر سکتے ہیں جیسا کہ آیت "وَمَا فَعَلْتُهٗ عَنْ اَمْرِیْ" (۱۵) اس کی صراحت کرتی ہے اور "فَاَرَادَ رَبُّكَ" (۱۶) سے بھی اسی طرف اشارہ ہے۔

غرض اگر اس حال میں اس لوہے کے ٹکڑے کو بولنے کی قوت ہوتی تو وہ ضرور سیکڑوں زبانوں سے اپنی آگ سے مل کر ایک ہونے اور اس کے ساتھ متحد ہونے کا شور مچاتا اور تھوڑی دیر کے لیے اپنی حقیقت سے غافل ہو کر یہ بات بول پڑتا کہ میں جلانے والی آگ کا انگارہ ہوں اور مجھ سے باورچیوں، لوہاروں اور سناروں بلکہ تمام کاریگروں کے کاروبار وابستہ اور متعلق ہیں، اسی طرح جب رحمانی جذب وکشش کی موجیں اس طالب

کے نفس کاملہ کو احدیت کے سمندروں کی گہری تہہ میں لے جاتی ہیں تو "اَنَا الْحَقُّ" اور "لَیْسَ فِیْ جَیْبِیْ سِوَی اللّٰہِ" کی صدا اس سے بلند ہونے لگتی ہے۔ اور جو حدیث قدسی میں وارد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "کُنْتُ سَمْعَہٗ الَّذِیْ یَسْمَعُ بِہٖ وَبَصَرَہٗ الَّذِیْ یُبْصِرُ بِہٖ وَیَدَہٗ الَّتِیْ یَبْطِشُ بِھَا وَرِجْلَہٗ الَّذِیْ یَمْشِیْ بِھَا" (۱۷) اور ایک روایت میں ہے "وَلِسَانَہٗ الَّذِیْ یَتَکَلَّمُ بِہٖ" (۱۸) وہ اسی مذکورہ خامہ فرسائی کی تصویر کشی ہے اور حدیث نبوی "وَاِذَا قَالَ اللّٰہُ عَلیٰ لِسَانِ نَبِیِّہٖ سَمِعَ اللّٰہُ لِمَنْ حَمِدَہٗ" (۱۹) اور "وَیَقْضِیْ اللّٰہُ عَلیٰ لِسَانِ نَبِیِّہٖ مَا شَاءَ" (۲۰) ان دونوں حدیثوں کا اشارہ اسی مقام کی طرف ہے۔ یہ نہایت باریک اور انتہائی نازک مسئلہ ہے، چاہیے کہ تم اس میں خوب غور کرو اور اس کی تفصیل کو دوسرے مقام کے حوالے کر دو۔

وَرَاءَ ذٰلِکَ فَلَا أَقُوْلُ لِأَنَّہٗ      سِرٌّ لِسَانُ النُّطْقِ عَنْہُ اَخْرَسُ (۲۱)

ہرگز تم اس معاملہ پر تعجب نہ کرو، اور اس کا انکار نہ کرو اس لیے کہ جب مقدس وادی کی آگ سے "اِنِّیْ اَنَا اللّٰہُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ" (۲۲) کی ندا آسکتی ہے تو اگر نفس کاملہ سے جو کہ اشرف المخلوقات ہے اور حق تعالیٰ کا نمونہ ہے "أَنَا الْحَقُّ" کی آواز صادر ہو تو تعجب کی کوئی بات نہیں!

اس مقام کے لوازمات میں سے عجیب و غریب خوارق کا صدور، قوی تاثیرات کا ظہور، دعاؤں کی قبولیت اور مصائب و آلام کا دور ہونا ہے اور حدیث "لَئِنْ سَأَلَنِیْ لَأُعْطِیَنَّہٗ وَلَئِنِ اسْتَعَاذَنِیْ لَأُعِیْذَنَّہٗ" اس بات کی تائید کرتی ہے۔ نیز اس کی ضروری باتوں میں سے اس صاحب حال کے بدخواہوں اور دشمنوں پر مصیبت و نکبت کا نزول ہے کہ حدیث قدسی "مَنْ عَادیٰ لِیْ وَلِیًّا فَقَدْ اٰذَنْتُہٗ بِالْحَرْبِ" اس کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

## تیسرا افادہ: انکشاف وحدانیت کا ذکر

پھر اگر غیب و جدید جاذبیت کا کوئی اور لطیفہ پردۂ لاریب سے اس کو پہنچتا ہے تو اس کی قوت احساس بہت تیز اور وسیع ہو جاتی ہے، جس کی وجہ سے اسے تمام حقائق کونیہ اور

موجودات امکانیہ اللہ تعالیٰ کی جلالتِ شان کے آگے نیست ونابود نظر آنے لگتے ہیں اور وہ نسبت جو اس طالب کے نفس اور اللہ تعالیٰ کے درمیان ظاہر ہوئی تھی وہی نسبت کائنات کی ہر شے اور اللہ جل شانہ کے درمیان واضح ہو جاتی ہے۔ غرض بساط وجود پر حضرت حق تعالیٰ کی قیومیت کا انبساط اور اس ذات واحد کے ساتھ ان کثیر الحقائق اشیا کا قیام اسے محسوس ہونے لگتا ہے تو وہ آیت کریمہ "هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْئٍ عَلِيْمٌ" (۲۳) اور حدیث "وَلَوْ دَلَّيْتُمْ بِحَبْلٍ اِلَى الْاَرْضِ السَّابِعَةِ السُّفْلٰى لَهَبَطَ عَلَى اللّٰهِ" (۲۴) کے مضمون کے مطابق فخر کرنے لگتا ہے۔

سبحان اللہ حب عشقی کی کتنی اچھی تاثیر ہے اور کیا خوب تجلی کی جاذبیت ہے کہ اس کے سبب سے یہ مشت خاک مقدس و پاک مقام میں کس قدر چست ہو گئی ہے اور اس حقیر مٹی نے پروردگار کے قرب کی مجلس میں کتنی عمدہ جائے نشست اور معزز مقام پا لیا ہے۔ ؎

جسم خاک از عشق بر افلاک شد　　کوہ در رقص آمد و چالاک شد

عشق جان طور آمد عاشقا　　طور مست و خرّ موسیٰ صاعقا (۲۵)

اس مقام کے لوازمات میں سے وحدۃ الوجود کی ڈینگے ہانکنا، معارف الٰہیہ کے ساتھ لب کشائی کرنا اور ان جیسے اشعار کا گنگنانا ہے۔ ؎

آنچہ نے می گوید اندر زیر و بم　　فاش گر گویم جہاں برہم زنم

جملہ معشوق است و عاشق پردۂ　　زندہ معشوق است و عاشق مردۂ (۲۶)

یہ سب حبّ نفسانی کے ان احکام میں سے ہیں جن کا بیان کرنا ضروری تھا اور جہاں تک ان احکام کی شرح و بسط کا تعلق ہے خاص کر مقام فنا و بقا کی تفصیلات کا تو اس کو صوفیۂ کرام کی کتابوں سے معلوم کرنا چاہیے۔ اور قدوۃ الاولیاء و زبدۃ الاصفیاء یعنی حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ اس کمال کو قرب النوافل سے تعبیر کرتے ہیں۔

# دوسری فصل

## طریق نبوت کی امتیازی باتوں کا بیان

### اس میں چار ہدایات ہیں، پہلی ہدایت حب ایمانی حاصل کرنے کے اسباب کے بیان میں ہے، یہ ہدایت تین تمہیدوں اور دو افادات پر مشتمل ہے:

### پہلی تمہید: فطری امور کا بیان

جاننا چاہیے کہ انسان اپنی اصل پیدائش میں چند ایسی باتوں پر پیدا کیا گیا ہے جن کو اچھا سمجھنا اور ان کی برعکس چیزوں کو برا سمجھنا اس کی فطرت میں رکھا گیا ہے، اور ہر وہ انسان جس کے دل کی تختی اہل جہل وعناد کی باطل تقلید کے نقوش سے صاف وشفاف ہو، جنھوں نے اپنی فطرت کو بگاڑ دیا ہے اور اپنی فطری امتیازات کو پیٹھ پیچھے ڈال دیا ہے، وہ یقیناً ان امور کو اپنی خوبیوں وکمالات، بلکہ تمام بنی نوع انسانی کی خوبیوں اور قابل فخر باتوں میں سے شمار کرتا ہے اور ان کی برعکس باتوں کو اپنے ہم جنسوں کے عیوب ونقائص میں سے جانتا ہے اور ابنائے نوع انسانی میں سے جس کسی کو ان امور سے خالی اور ان کی طلب سے بے رغبت پاتا ہے اس کو ناسمجھ اور بے وقوف خیال کرتا ہے۔ ان فطری خوبیوں میں سب سے اہم اور عمدہ خوبی محسن کی محبت اور اس کی تعظیم ہے، نیز اس کو غیروں پر ترجیح دینا، اس کی نعمتوں کا شکر ادا کرنا، اس کی خوشنودی کی طلب میں مرغوبات کو چھوڑنا اور پسندیدہ اموال کو اس کی راہ میں خرچ کرنا، اپنے آپ کو اس کے بندوں کے زمرے میں شمار کرنا، خود کو اس کے سامنے ناچیز محض تصور کرنا، اس کی حمد وثنا کرنا، اس کی خدمت کو بجالانا، اس کے احسان کے بوجھ کے نیچے اپنی گردن جھکا دینا، اپنے اوپر اس کے احسان کو قولاً وفعلاً ظاہر کرنا، اپنی

خواہشات کواس کی تابعداری میں قربان کرنا، اس کی رضا جوئی اوراس کے احکام کی تعمیل میں عزیمت کواختیار کرنااوراس کے سامنے سرینڈر ہونے اورسرتسلیم خم کرنے سے عارمحسوس نہ کرنااگرچہ گھٹیااوردشوارامورکا سامنا کرنا پڑجاوے۔ان بیان کردہ امورکا اہتمام اوران پرمداومت اختیار کرنااس محسن کی حق شناسی کی علامت اورخلاصہ ہے۔

غرض ان کلمات کا حاصل یہ ہے کہ سلیم الفطرت انسان کواپنے محسن سے ایسا تعلق ہوجاتا ہے کہ ہرگز وہ پوری زندگی اس کی کوئی خدمت کرکےاپنی ذمہ داری سےسبکدوش نہیں ہوسکتااورکسی چیزکواس کی نعمتوں کا مقابل ومتوازی نہیں سمجھ سکتااورخدمتوں کی انجام دہی میں مشقتوں کےاٹھانے کی جزا بجزاس کی خوشنودی کے کچھ اورنہیں تصورکرسکتا،اگرتم خوب غور کروتوافرادانسانی میں سےکسی بھی فرد بشرکوجوفطری شرافت میں اپنے ہم عصروں میں ممتاز ہو،اس سے تہی دامن نہیں پاؤگےاورمحسن کی محبت کی وجہ سے ایک دوسرے کی تعریف کرنا، ایک دوسرے پرفخر کرنا،محسن کی ناشکری سے بچنا،کفران نعمت سےنفرت کرنااوراس کے سبب ایک دوسرےکو برا بھلا کہنااس طرح کےلوگوں میں پایا جاتا ہے۔

مثلاً اگرتم کسی شخص کووالدین کےساتھ حسن سلوک،آقا کی خیرخواہی ونمک حلالی، استاد کی تعظیم اور بادشاہوں کی اطاعت کے ساتھ یادکروگےتو وہ ان باتوں کواپنی تعریف سمجھےگااوراس کواس تعریف سےخوشی ہوگی، بلکہ اس کے کہنے والے کےمتعلق اس کے دل میں نفع پہنچانے کی کوشش اورمحبت کا خیال پیدا ہوگا، اس کے برعکس اگرتم کسی کا تذکرہ والدین کی نافرمانی،آقاؤں سے بھاگنےاوران کی نمک حرامی کرنے، اساتذہ کی توہین اور سلاطین کےخلاف بغاوت کےساتھ کروگےتو وہ شخص بلاشبہ ان باتوں کواپنی مذمت وہجوسمجھ کرغصہ ہوگااورکہنے والے کےمتعلق ایذارسانی کی کوشش کرےگا۔

محسن کی محبت کی فروعات میں سےاس کے شعائر کی تعظیم ہےیعنی ان امورکی تعظیم جواس کے ساتھ ایک خاص تعلق رکھتے ہوں، اس طور پرکہ جوشخص اس تعلق سے

واقف ہواس کا ذہن ان امور سے اس احسان کرنے والے کی طرف منتقل ہو جائے۔ جیسے اس کے نام، کلام، لباس اور ہتھیار یہاں تک کہ اس کی سواری اور گھر کی تعظیم کرنا، جیسا کہ ہر اس شخص پر جس کا ان امور سے واسطہ پڑا ہو اور اس کا اٹھنا بیٹھنا امرائے عظام کے حق شناسوں، بلکہ اس کے تمام درباریوں کے ساتھ ہوا ہو، اور اس نے ان لوگوں کو فرمان شاہی و تخت شاہی کی تعظیم و تکریم کرتے ہوئے دیکھا ہو، مخفی نہیں ہوگا۔

اور جب محسن کے شعائر کی تعظیم انتہا کو پہنچتی ہے تو ہر اس چیز کی تعظیم کا باعث بنتی ہے جو اس کی محبت کی تائید کرنے والی اور اس کے شکر کو رواج دینے والی ہو مثلاً اس شخص کی تعظیم جو اس محسن کی شکر گزاری یا خدمت گزاری کی دعوت دیتا ہو اور اس محبت کرنے والے کی تائید کرتا ہو، یا اس کی نعمتوں کی اطلاع دیتا ہو، اور جب یہ مرتبہ بھی قوت پکڑ لیتا ہے اور حد سے آگے بڑھ جاتا ہے تو ان امور کی تعظیم کا باعث بنتا ہے جو محبت کرنے والے کی طرف سے محسن کی تعظیم اور اس کی خدمت گزاری میں صادر ہوئے ہوں، یعنی ان افعال واقوال کی تعظیم جو اس نے محسن کی نعمتوں کے مقابلے میں بجالائے ہوں اور ان اموال کی تعظیم جو اس نے اس کے راستے میں خرچ کیا ہو۔

یہ نہ سمجھو کہ یہ بات اپنے اقوال وافعال پر ناز اور صرف اموال پر فخر کے سلسلے سے ہے، اس لیے کہ ان اقوال وافعال اور اموال کی دو صورتیں ہیں ایک صورت محبّ کے کمالات و متعلقات سے متعلق ہے اور دوسری صورت منعم کے شعائر کی تعظیم کی قبیل سے ہے اور بیان کردہ معاملے کا تعلق دوسری صورت سے ہے نہ کہ پہلی صورت سے۔

اسی طرح ان فطری امتیازات میں سے سخی کی محبت ہے، جو دوسروں کے کام آتا ہو اور بے غرض نفع پہنچاتا ہو کیوں کہ ہر سلیم الفطرت انسان جس شخص کو اس صفت سے متصف جانتا ہے اس کو دل سے چاہتا ہے مثلاً ذی اقتدار سلاطین یا مشہور امراء میں سے اہل جود وسخا اور ارباب احسان و مروّت کو ہر عقلمند شخص دل سے پسند کرتا ہے اور اپنے دل کی

گہرائی میں ان کی عزت و مرتبہ کے اضافے کی خواہش رکھتا ہے خواہ ان حضرات نے اس پر احسان کیا ہو یا نہ کیا ہو۔ حالاں کہ اہل وجدان پر مخفی نہیں ہے کہ ان عظیم ہستیوں میں سے کسی کو بھی درحقیقت فیاض اور سخی نہیں کہا جا سکتا، کیوں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا جو کوئی بھی نفع و فیض رسانی کا کام کرتا ہے یقیناً اس کو دینی یا دنیوی اغراض میں سے کوئی نہ کوئی غرض ضرور ہوتی ہے خواہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کی تلاش ہو یا بڑے ثواب کی طلب یا آخرت کے عذاب سے بچنے کی خواہش ہو یا اپنے اخلاق کی درستگی کی تمنا یا اپنے نام و نشان کی طلب ہو یا اپنی سخاوت و فیاضی کی شہرت اور اپنی ہم عمروں میں اپنی تعریف کی آرزو، اس قسم کی باتیں سخاوت و کرم فرمائی کا سبب بنتی ہیں لیکن چوں کہ اہل جود و سخا اس غرض کو احسان و نوازش کے وقت چھپائے رہتے ہیں اور بے غرضی کا اظہار کرتے ہیں اور بادی النظر میں سخی مطلق سے مشابہت ظاہر کرتے ہیں اس لیے عقلمندوں کی محبت کے مستحق بن جاتے ہیں، چہ جائے کہ سخی مطلق خدا تعالیٰ کہ درحقیقت صفت جود و کرم اسی فیاض ذات میں منحصر ہے، کیا تو نہیں دیکھتا کہ اگر کبھی ان میں سے کسی سے انعام و سخاوت کے وقت کوئی مقصد یا کوئی فائدہ منظر عام پر آتا ہے تو تمام اہل عقل و خرد اس کو ارباب جود و سخا کے زمرے سے باہر شمار کر کے گھٹیا لوگوں میں سے جانتے ہیں۔

اور انہیں فطری خوبیوں میں سے صمد (بے نیاز ذات) کی تعظیم ہے اور یہاں پر بے نیاز سے مراد ایسی ہستی ہے جو بالذات بے نیاز ہو اور اس کے غیر کو اس کی ضرورت پیش آتی ہو اور صمدیت ایسا امر ہے جو کمال و نقصان میں متفاوت ہے، کیوں کہ کھانے پینے اور جماع وغیرہ لوازم حیوانیت سے بے نیازی صمدیت کا ایک مرتبہ ہے اور جہت، شکل اور رنگ وغیرہ لوازم جسمانیہ سے بے نیازی اس سے بڑا مرتبہ ہے اور مددگار، وزیر، شریک، مشیر اور آلات و وسائل وغیرہ سے استغنا جو کہ عاجزی کے لوازمات میں سے ہے، اسی طرح جاسوسوں، قاصدوں، خفیہ نویسوں اور وقائع نگاروں وغیرہ لوازم جہل سے استغنا یہ دونوں ایسے مرتبے ہیں جو پچھلے تمام مراتب سے بلند ہیں اور علت سے بے نیازی خواہ وہ فاعل ہو یا

قابل جسے دوسرے لفظ میں وجوب سے تعبیر کرتے ہیں ایک ایسا درجہ ہے جو ان سے بھی اوپر ہے، دوسرے بڑے مراتب کو انھیں پر قیاس کر لینا چاہیے۔

اسی طرح اس کی طرف دوسرے کی حاجت وضرورت کے مراتب میں فرق ہے کیوں کہ پریشانیوں کو دور کرنے اور مصیبتوں کو ٹالنے میں محتاج ہونا ایک درجہ ہے اور تربیت وپرورش یعنی کھانے پینے اور سونے میں محتاج ہونا دوسرا درجہ ہے جو اس سے اوپر ہے اور اعضا وجوارح اور قوتوں کے حاصل ہونے میں اس کی عنایت کی طرف محتاج ہونا ایک ایسا مرتبہ ہے جو پچھلے دونوں مرتبوں سے اوپر ہے اور نفس وجود اور اس کی بقا، یعنی عدم کے پردے سے نکلنے اور منصۂ شہود پر ظاہر ہونے میں احتیاج کا درجہ بیان کردہ تمام مدارج سے بلند ہے، ان کے علاوہ دوسرے بڑے مراتب کو انہیں پر قیاس کرنا چاہیے۔

صمدیت کے ہر مرتبے کے مقابلے میں تعظیم کا ایک مرتبہ ہے جو کمال ونقصان میں اس کے مانند ہوتا ہے یعنی جس قدر صمدیت عالی ہوگی اور اس کی طرف ضرورت زیادہ ہوگی اسی قدر اس کے بالمقابل تعظیم زیادہ کامل اور زیادہ خشوع وخضوع کے ساتھ ہوگی۔ غرض صمدیت وتعظیم کو ترازو کے دو پلڑوں کی طرح سمجھنا چاہیے کہ جس قدر ایک پلڑا اونچا ہوتا ہے اسی قدر دوسرا پلڑا نیچا ہوتا ہے، کیا تم نہیں دیکھتے ہو کہ کسی بھی مذہب کا آدمی خواہ وہ مذہب حق ہو یا باطل عبادت کو جو کسی کے حق میں انتہائی درجہ کی تعظیم ہے بغیر اس کی صمدیت کے اثبات یعنی حاجتوں سے اس کی بے نیازی اور اپنی ضرورتوں ومشکلات میں اس کی طرف احتیاج کے اثبات کے بغیر، درست نہیں سمجھتا ہے، بلکہ اسی صمدیت کو اس کے مستحق عبادت ہونے پر بطور دلیل پیش کرتا ہے اور شارع نے بھی معبودان باطل کی معبودیت کو ان کی طرف سے بے نیازی نہ ہونے کی بنا پر غلط قرار دیا ہے کہ جا بجا ان کی محتاج گی کو ثابت کیا ہے اور ان کی پرستش کرنے والوں کو کسی بھی ضرورت میں ان کے محتاج نہ ہونے کو ظاہر کیا ہے جو ماہر اہل تفسیر پر پوشیدہ نہیں ہے۔

اور منجملہ ان فطری امور کے اہل کمال سے محبت اور ان کی تعظیم ہے اور یہ بات اس قدر قطعی اور اس حد تک واضح ہے کہ بیان کا محتاج نہیں، کیوں کہ ہر سلیم الفطرت انسان جس کسی کو کسی کمال سے متصف جانتا ہے جیسے علم، ذہانت، قوت، خوبصورتی وخوب سیرتی اور وقار ومتانت وغیرہ تو وہ دل سے اس سے محبت کرتا ہے اور جس قدر ممکن ہو اس کی تعظیم وتوقیر بجالاتا ہے اور اس کی صحبت اختیار کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اور چوں کہ صفات کاملہ کمی وزیادتی کے مراتب میں بہت تفاوت رکھتی ہیں، اسی لیے محبت وتعظیم کے مراتب جو ان کے مقابلے میں ہوتے ہیں وہ بھی ناچار متفاوت ہوں گے۔

خلاصۂ کلام یہ کہ جب ان فطری باتوں میں سے ہر ایک بات سلیم الفطرت انسان کے باطن میں حب عقلی پیدا کرنے کے لیے کافی ہے تو پھر ان سب امور کا اجتماع خصوصاً جب وہ حد کمال تک پہنچے ہوں تو لامحالہ محبت وتعظیم کی اس قدر زیادتی کے باعث ہوں گے جس سے زیادہ کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔

## دوسری تمہید: فطری امور کے لبادے میں شریعتوں کے نزول کا بیان

چوں کہ محسن حقیقی اور سخی مطلق کو معلوم تھا کہ اولاد آدم کے واسطے آخرت کی مصیبتوں سے نجات اور بلند مراتب کا حصول بجز اللہ تعالیٰ سے سب سے زیادہ محبت اور اس کی انتہائی تعظیم کے ممکن نہیں، اسی لیے جو کچھ محسن کی محبت اور دیگر بیان کردہ باتیں ان کی فطرت میں رکھی گئی تھیں انھیں کو اس پائیدار سعادت کی کلید اور دنیا وآخرت کی کامیابی کی کنجی قرار دے کر شریف ترین اور کامل ترین انسان کی زبان ہدایت نشان سے اعلان کرایا کہ "اَحِبُّوا اللّٰہَ لِمَا یَغْذُوْکُمْ مِنْ نِعَمِہٖ" (۲۷) اور کوہ فطرت سے "قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ" (۲۸) کا پیغام دیا، اور لطف وعنایت کے وہ کلمات جو حضرت حق تعالیٰ کی نعمتوں سے پُر، آثار صمدیت کی شرح وبسط سے لبریز، صفات کمال کو ثابت کرنے والے اور صفات نقص وزوال کی نفی کرنے والے تھے، آپ کے باطن میں ڈالے گئے اور پاکی وبڑائی کے وہ کلمات جو اللہ تعالیٰ کی

بے نیازی کا احساس دلانے والے ہیں اور حمد وثنا کے وہ کلمات جو اس کی جود وسخا کی خبر دینے والے اور اس کے اوصاف وکمالات کی اطلاع بہم پہنچانے والے ہیں اور الوہیت کے وہ کلمات جو اس کی تنہا عبودیت کو جو کہ صمدیت کی اصل ہے، ظاہر کرنے والے ہیں اور ربوبیت کے وہ کلمات جو اس کے اکیلے رب ہونے کو جو کہ سخاوت وانعامات اور تعریفات وکمالات کی بنیاد ہے، واضح کرنے والے ہیں اس کامل ترین انسان یعنی حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے سے تعلیم فرمائے گئے۔

اسی طرح وہ نشانیاں جو آفاق عالم میں بکھری ہوئی اور ذوات ونفوس میں پوشیدہ ہیں اور وہ عجائبات قدرت جو اجرام علویہ اور اجسام عنصریہ خصوصاً بنی نوع انسان میں موجود ہیں یعنی انسانیت کی تخلیق میں جو کچھ تغیرات جیسے نطفہ ہونا، علقہ ہونا اور مضغہ ہونا ماں کے پیٹ میں رونما ہوتے ہیں اور اس کی تصویر کشی یعنی اچھے رنگوں، دلکش صورتوں متناسب اعضاء اور مختلف قوتوں کی ایجاد میں جو محیر العقول چیزیں نظر آتی ہیں، اسی طرح اس کی پرورش میں اوّلاً ماں کے شکم میں کھلانا، پلانا اور سلانا۔ ثانیاً بچپن میں۔ ثالثاً جوانی میں اور رابعاً بڑھاپے میں، نیز بلاؤں کے ٹالنے، مصیبتوں کے دور کرنے، ستم رسیدوں کی فریاد سننے اور پریشان حال کی دعاؤں کو قبول کرنے میں جو حق تعالیٰ کی عنایتیں ہیں، علاوہ ازیں اس کی ہدایت میں جیسے انبیاء ومرسلین کو بھیجنے اور کتابوں کو نازل کرنے وغیرہ میں جو عجائبات خداوندی ہیں اللہ تعالیٰ نے ان سب کو محض اپنے فضل وکرم سے افصح العرب والعجم جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے واضح فرمادیے، تاکہ وہ باتیں جو خیمۂ فطرت میں چھپی ہوئی تھیں، ظاہر ہوجائیں اور دین حنیف جو بجز فطرت کی صفائی وستھرائی کے اور کچھ نہیں ہے وہ اسے نصیب ہوجائے، چناں چہ یہ دونوں آیتیں "فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا فِطْرَةَ اللّٰهِ الَّتِىْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ" (۲۹) اور "بَلْ مِلَّةَ اِبْرَاهِيْمَ حَنِيْفًا" (۳۰) اس پر دلالت کرتی ہیں۔

## تیسری تمہید: مناسب اقوال وافعال کے ذریعے فطری امور کی تائید کا بیان

معلوم ہونا چاہیے کہ اگر چہ اقوال وافعال، احوال کے توابع وفروعات میں سے ہیں، لیکن بعض وجوہات کی بنا پر انھیں احوال کو مکمل کرنے والی چیزوں میں سے شمار کر سکتے ہیں، کیوں کہ افعال واقوال قالب وجسم کے مانند ہیں اور احوال روح وجان کے درجے میں ہیں اور جس طرح بے جان جسم کا شمار جنس جمادات میں سے ہوتا ہے، اسی طرح بے جسم جان کو کمالات سے خالی شمار کیا جاتا ہے۔ جیسے گالی گلوج اور مار پیٹ اگر چہ کیفیت غضبانیہ کی فروعات میں سے ہیں کیوں کہ کیفیت کا تعلق قلبی احوال سے ہے، لیکن ان امور کو غصہ کی تکمیل کرنے والی باتوں میں سے شمار کرنا چاہیے۔ مثلاً اگر کسی کو غصہ آئے یا اسے مسرت وشادمانی میسر ہو اور اس کے اثرات جیسے سب وشتم، مار پیٹ، گیت گوئی ونغمہ سرائی، اسباب عیش ونشاط کی آراستگی، مسرت ومستی کی محفلوں کا انتظام اور ان جیسے دیگر خوشی وناراضگی کی بات اور کاموں کے ظہور سے حیا مانع ہو تو یقیناً وہ غصہ اور خوشی نفسانی وسوسوں کی قبیل سے شمار ہوگا، اس وقت غصہ کی آگ بجھ جائے گی اور خوشی پژمردگی میں تبدیل ہو جائے گی اور اگر اس قلبی احوال کی تائید اقوال لسانیہ اور افعال جسمانیہ سے کی جاتی تو اسے طاقت، ترقی اور وسعت حاصل ہوتی۔

اسی طرح اس محسن وسخی کی محبت اور اس بے نیاز ذات کی تعظیم جو اپنے کمالات میں شرکاء سے پاک ہے، اگر چہ قلبی امور اور نفسانی احوال میں سے ہے لیکن محبت کی باتیں اور تعظیمی کام اس کیفیت کو دوبالا کر دیتے ہیں اور اسے رونق عطا کرتے ہیں جو اہل وجدان پر مخفی نہیں ہے۔ اور ان امور کے بغیر وہ قلبی حالت ہاتھ کٹے ہوئے کاتب اور ہلاک شدہ گھوڑے کے شہسوار کی طرح ہوگی۔ جب اس مقدمہ کی تمہید بیان ہو چکی تو اب ہم اصل مدعا کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

## پہلا افادہ: ذکرِ ایمانی اور مراقبۂ صمدیت کا بیان

معلوم ہونا چاہیے کہ سلیم الفطرت انسان جس کا نام ازل سے سعادت مند بندوں کی فہرست میں لکھا گیا اور اس کے حق میں ایک مخفی عنایت مقرر کی گئی وہ جب اپنے ہوش کے کان سے سنتا ہے کہ اس کا حقیقی محسن جسمانی و روحانی نعمتوں کے ساتھ صمدیت کے اعلیٰ درجے پر اور جود و سخا کی بلند چوٹی پر فائز ہے اور بہترین اوصاف و افضل ترین خوبیوں سے متصف ہے اور اس کی ذات و صفات نقص و زوال کے عیب سے پاک ہے اور یہ شخص احتیاج وضرورت کے آخری سرے پر ہے اور ہر وقت ہر چیز کے سلسلے میں اس کا محتاج ہے، یہاں تک کہ اپنے اعضا ہاتھ پاؤں کان وغیرہ میں بھی اس کا ضرورت مند ہے، گویا کہ اس کا پورا وجود حاجت میں گھرا ہوا ہے اور محسن حقیقی کی نعمتیں باوجود اس کی انتہائی بے نیازی و استغنا کے ہر وقت اس پر بارش کی طرح برستی رہتی ہیں اور وہ اپنی نگاہ بصیرت سے ان نشانیوں کو دیکھتا ہے جو دنیا کے اطراف واکناف اور اشخاص میں جلوہ گر ہیں اور ان عجائبات قدرت کا مشاہدہ کرتا ہے جو زمین سے آسمان تک اور ثریٰ سے ثریّا تک پھیلے ہوئے ہیں، بلکہ عرش سے فرش تک وسیع ہیں خصوصاً انسانوں کے اندر بلکہ خود اس دیکھنے والے میں موجود ہیں جن میں سے کچھ حصے کا تذکرہ شروع کلام میں ہو چکا ہے، تو ضرور بیان کردہ باتیں جو اس کی فطرت میں ودیعت کی گئی ہیں، حرکت کرتی ہیں اور اس کے سینہ کو پُر کر دیتی ہیں اور اس محسن حقیقی کے متعلق حد درجہ محبت و تعظیم اس کے دل کی گہرائی سے اٹھتی ہے اور ایسے اقوال وافعال کے ظہور کا تقاضا کرتی ہے جو اس کے شکر و تعظیم پر دلالت کریں اور اس کی بے نیازی و کمالات کے شایان شان ہوں نیز اس مال و دولت کے خرچ کا تقاضا کرتی ہیں جس سے اس کی رضا حاصل ہو۔

پھر تسبیحات، تحمیدات اور تکبیرات جو اعمال فروتنی اور افعال تعظیمی سے وابستہ ہیں، وہ شخص ان کے معانی و مطالب کا اس طرح پر دھیان کرتا ہے جو ابتدائے کلام میں ذکر کیا گیا، بالخصوص کلمۂ توحید "لا إلـه إلا الـلّٰه" کے معنی کا دھیان جو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت، الوہیت اور

ربوبیت پر مع اس کی انتہائی بے نیازی کے دلالت کرتا ہے، اس سے رونما ہوتا ہے، خاص طور پر اس کے کلام پاک (قرآن مجید) کا لحاظ جو فطری چاروں باتوں (۳۱) کی اس طرح سے تشریح وتفسیر کرتا ہے جس سے بہتر کا تصور نہیں کیا جاسکتا، حالاں کہ خود اس کلام پاک کے ساتھ محسن کے شعائر کی تعظیم بھی جڑی ہوئی ہے، یعنی قرآن مجید بھی شعائر اللہ میں سے ہے۔ لہٰذا اس کلام پاک کو وہ مومن پاک انتہائی ادب وتعظیم کے ساتھ اور اس طرح پر اس کے معانی میں غور وتدبر کرکے پڑھتا ہے جو اوپر مذکور ہوا تو ان اذکار کی لذت خصوصاً اس کلام پاک کی عظمت اس کے دل ودماغ کو مالا مال کردیتی ہے، مضامین کی دشواری میں الفاظ کی مٹھاس اس کے دل پر چھا جاتی ہے اور اس کی عقل وخرد کو روشن کردیتی ہے اور ادھر ادھر کے خیالات، پراگندہ افکار، باطل آرزوؤں، گناہوں کے عزائم اور اللہ کے سوا دوسرے کی تعظیم ومحبت کو پاش پاش کرکے بے حقیقت کردیتی ہے اور اس کی عقل ودل کو بہیمی آلودگیوں سے پاک کردیتی ہے۔ یہ ہے اس جماعت (اہل تصوف) کا ذکر اور ہم اس کو ذکر ایمانی کا نام دیتے ہیں۔

اور چوں کہ ابتدائی باتوں سے معلوم ہوا کہ اقوال لسانیہ اور افعال جسمانیہ سے احوال نفسانیہ کو تقویت پہنچتی ہے اور انھیں خوب ترقی حاصل ہوتی ہے، اس لیے یہ بیان کردہ ذکر فطری چاروں امور کی زیادتی کا سبب ہوگا اور نئی الفت وتعظیم ذاکر کے نہاں خانے سے فوارہ کی طرح جوش مارے گی اور اس محبت وتعظیم کی زیادتی دوسرے چند اور اقوال وافعال کا تقاضا کرے گی۔ اسی طرح معاملہ دونوں جانب سے چلتا رہتا ہے، یہاں تک کہ "لَا إِلٰـــہ إِلَّا اللّٰـہ" کا مطلب جو اللہ تعالیٰ کی ربوبیت والوہیت کے لحاظ سے اکیلا ہونے پر دلالت کرتا ہے اور ذاتی فضائل، متعدی فضیلتیں، اعلیٰ درجے کی بے نیازی، بے انتہا جود وسخا، تاثیرات وانعامات کے واسطوں کا سقوط اور ان کی طرف عدم التفات وبے توجہی اس کے دل میں جگہ پکڑ لیتی ہے اور مستحکم ہوجاتی ہے، اور یہاں تک کہ کل کائنات جو عالم کون میں ظہور پذیر ہیں یا آیندہ ظاہر ہونے والے ہیں ان سب کو اس کی قدرت کاملہ سے بغیر کسی

واسطے کے مربوط جانتا ہے اور ہر اس انعام کو جس سے وہ یا اس جیسے دوسرے افراد نوازے گئے ہیں ان سب کو بلاتر دد اس کی تربیت بالغہ میں سے شمار کرتا ہے اور ہر اس کمال کو جو موجودات کے ذرّوں میں سے کسی ذرّے میں دکھائی دیتا ہے، ان سب کو اس کے جمال لایزال کا عکس تصور کرتا ہے، پس بتدریج وہ اس کی قدرت کے عجائبات میں غور وفکر کرتا رہتا ہے، لیکن بلبلے کے مانند سوائے حیرانی کے اسے کچھ ہاتھ نہیں آتا، اور وقتاً فوقتاً اس کے انعامات میں غور کرتا رہتا ہے، لیکن بجز عاجزی، شرمندگی اور اس کی نعمتوں کے حقوق کی ادائیگی سے بے بسی کے اسے کچھ ہاتھ نہیں آتا، یہ ہے اس قوم (صوفیہ) کی فکر اور اس کو مراقبۂ صمدیت کہتے ہیں۔

## دوسرا افادہ: حبّ ایمانی پیدا ہونے کا بیان

جب یہ فکر اپنے کمال کو پہنچ جاتی ہے تو انتہائی محبت و تعظیم اس کے دل کی گہرائی سے اٹھتی ہے اور اس کی تمام باطنی قوتوں کو نیست ونابود کر دیتی ہے اور اس پر ایسی حالت طاری ہوتی ہے جس کو پانی میں نمک کے گھلنے یا دھوپ میں شبنم کے پگھلنے سے تشبیہ دی جاسکتی ہے کہ اگر وہ اوپر نظر اٹھاتا ہے تو عظمت واحسان کی نشانیوں کا مشاہدہ کرتا ہے اور اگر وہ نیچے کی طرف دیکھتا ہے تو عظمت واحسان کی نشانیوں کو دیکھتا ہے، اگر وہ اپنی ذات میں غور کرتا ہے تو یہی پاتا ہے اور اپنے علاوہ کسی کو دیکھتا ہے تو یہی باتیں نظر آتی ہیں، اور اگر وہ خدمت گزاری اور اس کے احسان کے شکر میں اپنے آپ کو خاک کے برابر کردے، بلکہ پائمال راکھ کے مانند بے کار کردے، پھر اپنے خیال میں اس سعی بلیغ کو اس کے احسان سے موازنہ کرے اور اس کی عظمت وبزرگی کو عقل کے ترازو میں تولے تو ضرور خجالت وشرمندگی اس کے دل کی جبیں سے ٹپکے گی، بلکہ وہ خود کو اس میں مستغرق سمجھے گا، بلکہ اپنے اعضا وجوارح کو بھی اس کی جملہ نعمتوں میں سے شمار کر کے اور اس کی قدرت کے عجائبات میں سے سمجھ کر اس سے بغایت محبت اور اس کی انتہائی تعظیم بجالائے گا۔

نازم بچشم خود کہ جمال تو دیدہ است

افتم بپائے خود کہ بکویت رسیدہ است

ہردم ہزار بوسہ زنم دست خویش را

کو دامنت گرفتہ بہ سویم کشیدہ است (۳۲)

اور جب اللہ کا اسم مبارک اپنی زبان پر لاتا ہے تو اس کا پورا اندرون اس عظیم نام کی حلاوت وعظمت سے ایسے لرزتا ہے جیسے بانس کا درخت نسیم سحری سے لچکتا ہے اور اس کے ہر مسام سے عاجزی ودرماندگی اور اللہ تعالیٰ کی بے نیازی واستغنا فوارے کی طرح ظہور میں آتا ہے، پس یہ الفت شدیدہ اور تعظیم مفرط مومن کے ظاہر وباطن پر مسلط ہوجاتی ہے۔ اس کو حب ایمانی کہتے ہیں اور چوں کہ اس محبت کا بیج مومن کی عقل کی پاک مٹی میں بویا گیا ہے جو خواہشات کی پیروی اور بدعات کی ایجاد سے خالی ہے اس لیے اس کو حب عقلی بھی کہتے ہیں، اور چوں کہ شارع نے اس محبت کی طرف دعوت دی ہے اور اس کو اپنے بندوں کے مدح کے مقام میں ذکر کیا ہے اور دین کے تمام ارکان وآداب کو اسی محبت کو حاصل کرنے کے لیے مقرر فرمایا ہے، اس لیے اس کو حب ایمانی کے لقب سے بھی ملقب کرتے ہیں۔

# دوسری ہدایت

## حبّ ایمانی کی تائید کرنے والی باتوں کا بیان

اس میں دو تمہید اور تین افادات ہیں:

### پہلی تمہید: حبّ ایمانی حاصل کرنے کے اساب کی اصل کا بیان

معلوم ہونا چاہیے کہ محبت ایمانی کے حصول کے اسباب کی اصل اور اس سعادت ابدی کی بنیاد اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کا انتخاب ہے جو ازل میں اس ذرّۂ ناچیز کے حصے میں آیا اور

اس کو مقبول بندوں کے زمرے میں شمار کیا، پس وہی انتخاب ازلی اس ذرّۂ ناچیز کو مٹی کی پستی سے آسمان کی بلندی کی طرف رفتہ رفتہ کھینچ کر لے جاتا ہے اور ہر مقام میں کوئی نئی بات اور مناسب تربیت اس کی طرف سے ظہور میں آتی ہے۔ لیکن چوں کہ وہ اجتباء ابتدائے آفرینش میں مستورالاثر (جس کا اثر پوشیدہ ہو) ہوتا ہے اور مفقودالخبر (جس کی خبر مخفی ہو) رہتا ہے اور بعض مناسب امور کے پیش آنے سے پردۂ خفا اس سے اٹھتا ہے اور اس کے آثار آہستہ آہستہ جلوہ گر ہوتے ہیں، اس لیے ان امور کو بھی مؤیدات واسباب میں سے شمار کر سکتے ہیں، اگر چہ مؤید حقیقی اور سبب اصلی وہی ازلی روشنی ہے جو ابتدائے تخلیق میں اس کی فطرت میں رکھی گئی، کیوں کہ ان امور مؤیدہ کے دوگنا چار گنا سے بھی ان آثار کے دسویں حصے کا بھی حصول بعید از قیاس معلوم ہوتا ہے چہ جائے کہ اس قسم کے الطاف وعنایات کا انحصار ان جیسی باتوں پر ہو۔

## دوسری تمہید: حبّ ایمانی حاصل کرنے کے اسباب کی کثرت کا بیان

واضح رہے کہ اگر چہ اس سرمایۂ سعادت (محبت ایمانی) کے مؤیدات کو تحریر وتقریر کی قید میں لانا اور اعداد وشمار کی چہار دیواری میں بند کرنا بہت مشکل کام ہے لیکن بحکم "ما لا یدرك كلّه لا یترك كلّه" (جو چیز مکمل حاصل نہیں کی جاسکتی وہ سراسر چھوڑی بھی نہیں جاسکتی) ان مؤیدات میں سے بعض تائید کرنے والی باتوں کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے، تاکہ اہل عقل ودانش غیر مذکور باتوں کو ذکر کردہ باتوں پر قیاس کر کے حقیقت تک رسائی حاصل کرسکیں۔

## پہلا افادہ: اتباع شریعت کا بیان

محبت ایمانی کی عمدہ اور اہم ترین مؤیدات میں سے اتباع شریعت پر دل کا جماؤ، سنت کی پیروی کا اشتیاق، بدعت سے انتہائی نفرت اور اللہ تعالیٰ کی مضبوط رسی کو پوری طاقت سے تھامنا ہے، یعنی کتاب وسنت کے ظاہر وباطن کی اقتدا، مرضیات خداوندی پر چلنے

کا عزم مصمم، اللہ تعالیٰ کی محبت وعظمت اور اس کے شعائر بالخصوص شریعت مطہرہ کی تعظیم کو بجالانا ہے جو اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سب سے بڑی نشانی ہے۔

تم یہ نہ سمجھو کہ اس بیان سے مقصود عبادات کی کثرت اور برے خیالات کا ازالہ ہے، جسے لوگ تقویٰ کہتے ہیں، بلکہ اس کلام سے مقصود اسلامی عقائد پر دل کا اطمینان اور دینی احکام کی نسبت انتہائی محبت وعشق اور اس کی تعظیم ہے۔ مزید برآں خالق کی رضا جوئی میں مخلوق کی موافقت ومخالفت کی کوئی پروا نہ کرنا اور رکاوٹوں کو دفع کرنے میں ارادے کو مضبوط کرنا ہے، اس طور پر کہ اپنی جان ومال کو محسن حقیقی کی خوشنودی کے واسطے قربان کردے اور اپنے ساز وسامان کو اس کے احکام کی تعمیل میں صرف کردے پھر ان سب کاموں کو اپنی بلند ہمتی کے سامنے ذرّہ برابر بھی نہ شمار کرے اور جس رکاوٹ کو اپنی ہمت کے ترازو میں اس کی رضا جوئی کی خاطر تولے اس کے وزن کو ذرّہ برابر بھی حیثیت نہ دے، بلکہ اپنی نگاہ بصیرت میں تنکے کا موازنہ پہاڑ سے سمجھے، اس رکاوٹ کو ہٹانے میں اپنے اندر دلیری پائے اور خود کو اپنی ہمت عالیہ کے لحاظ سے اس پر غالب گردانے، اگرچہ اس رکاوٹ کا ازالہ دشوار ہو، طاقتور پہلوان کی طرح جسے مخالفین کی دھمکی اور معاصرین کا نعرۂ مقابلہ میدان کارزار میں کھینچ لایا ہو، پھر وہ غضب ناک شیر شجاعت کے نشے میں چور ہو کر کسی کو اپنا ہم پلہ نہیں سمجھتا ہے بلکہ وہ اپنے دل میں قطعی طور پر جانتا ہے کہ میں جدھر رُخ کروں گا فریق مخالف کو چیونٹیوں کی طرح مَسل دوں گا اگرچہ وہ اپنے زمانے کا رستم (۳۳) اور افراسیاب (۳۴) ہی کیوں نہ ہوں۔ یہ ایک ایسا امر ہے جس کا تعلق وجدانیات سے ہے، تحریر وتقریر جس کے بیان سے قاصر ہے، عقل وفکر جس کی حقیقت تک رسائی نہیں حاصل کرسکتی، اس میں صرف وجدان صحیح کا دخل ہے اور قلب سلیم کے علاوہ کسی کا وہاں کوئی کام نہیں۔

لذت ایں مے نشناسی      بخدا تا نچشی (۳۵)

## دوسرا افادہ: حق تعالیٰ کے معاملات کو نفس کے معاملات پر ترجیح دینے کا بیان

محبت ایمانی کے جملہ مؤیدات میں سے اللہ تعالیٰ سے متعلق معاملے کو نفس سے متعلق معاملے پر ترجیح دینا ہے، اس طور پر کہ نفس کے اندر اس سے عجز وانکساری پیدا ہو اور بہیمیت کا ازالہ ہو، اور جو باتیں انکساری کے وجود اور بہیمیت کے زوال کے باعث ہوسکتی ہیں وہ اشخاص واوقات کے حسب حال بہت مختلف ہیں، مثلاً اس شخص کی بہیمیت کے ازالے میں جو کھانے پینے کا دلدادہ ہو اور مکھی کی طرح روٹی وحلوے پر گر پڑتا ہو، ان چیزوں کی خواہش کو چھوڑنا اور ان میں دوسرے فرد کو محض اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے لیے خود پر ترجیح دینا ہے، اور ایسے موقعے پر نہ ان جیسی دوسری چیزوں کے حصول کی طمع ہو اور نہ حق شناسی وخدمت گزاری وغیرہ کی امید اور نہ زہد وایثار وغیرہ کی شہرت کی تمنا، تو یہ باتیں اس قدر اس شخص میں اثر انداز ہوتی ہیں جس قدر کسی اور میں مؤثر نہیں ہوسکتیں۔

اسی طرح اس شخص کے دل کی صفائی وستھرائی میں جس کو کسی دوشیزہ سے عشق ہو گیا ہو اور وہ معشوقہ خوبصورت، مال دار اور حسب ونسب والی ہو اور حسن اتفاق سے رقیبوں کی نظر سے چھپ چھپا کر اس کے پاس پہنچ گئی ہو اور اس نے اس خوشی ومسرت کے موقع کو بہت زیادہ مال ودولت خرچ کر کے حاصل کیا ہو، ایسے شخص کا صرف اللہ تعالیٰ کی رضا کے حصول اور اس کی ناراضی کے خوف سے زنا سے باز رہنا، باوجود یہ کہ دونوں طرف سے خواہش ورغبت موجود ہے اور جوش جوانی سر پر منڈلا رہا ہے، نیز طبعی وعرفی کسی بھی طرح کی کوئی چیز اس سے مانع نہیں ہے اور اس عاشق نے اس معشوقہ کو حاصل کرنے کے راستے میں بڑی مشقتیں اٹھائی ہیں اور خوب مال ودولت صرف کیا ہے، تو نفس کی خواہش کو ترک کرنا اس شخص میں ایسا اثر کرتا ہے جیسا اثر کسی اور میں تصور نہیں کیا جاسکتا۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے مال ودولت خرچ کرنا اس طور پر کہ نام وری کی طلب، حق شناسی اور جس پر خرچ کیا ہے اس کی طرف سے تعریف وتوصیف کی تمنا یا

احسان کے بدلے کی امید یا اس سے کسی فائدے کے حصول کی آرزو یا اس قسم کی سخاوت کے ذریعے شہرت کی توقع نہ ہو، یہ بات بخیل، احسان جتلانے والے اور طالب عزت وجاہ کے حق میں ایسا کام کرتی ہے جو دوسرے کے حق میں نہیں کرتی۔

ایسے ہی تہی دستوں، فقیروں اور بے حیثیت مسکینوں کی تواضع وخاطر داری اور امداد ان معزز مالداروں کے حق میں جو عزت ومرتبے میں اپنے ہم عصروں میں ممتاز اور مشہور ہوں، بہت تاثیر رکھتی ہے۔

اور ایسے ہی جان ومال اور بال بچوں کی ہلاکت وبربادی کے علم کے ساتھ جنگ میں پیش قدمی کرنا ان لوگوں کے حق میں جو بزدل ہوں اور ان کا کبھی جنگ سے واسطہ نہ پڑا ہو، بڑی تاثیر رکھتا ہے۔

اسی طرح سچی بات میں خاموش رہنا، بحث وتکرار نہ کرنا اور اپنی غلطی ونا سمجھی کا اقرار کرنا ان علماء کے حق میں خوب تاثیر رکھتا ہے جو ذکاوت وتبحر علمی میں مشہور اور اپنی قوت مناظرہ سے فریق مخالف کو خاموش کر دینے میں نام ور ہوں اور فن توجیہ وتاویل میں ید طولیٰ رکھتے ہوں اور پیچیدہ سے پیچیدہ مسائل حل کرنے میں انھیں مہارت تامہ حاصل ہو۔

اور اسی طرح اپنے دور کے لوگوں پر حسد، اپنی نام وری کی طرف توجہ اور اہل زمانہ میں اپنے امتیاز کی تمنا نہ کرنا اور خوارق، کشف وکرامات اور دعا کی قبولیت کے اظہار میں کوشش نہ کرنا ان مشائخ کے حق میں بہت مفید ہے جو قوت تاثیر سے متصف اور کشف وکرامات سے موسوم ہیں۔

اور رہی بات اوقات کے اختلاف کے لحاظ سے عجز وانکساری کے صدور اور بہیمیت کو زائل کرنے کی، تو دیکھیے! یہی ایک گلاس پانی سیرابی کے وقت، خصوصاً آباد شہروں میں، یا بہتی نہروں کے کنارے پر ایک کوڑی سے زیادہ میں کوئی نہیں خریدتا اور کبھی ایسا وقت آ پہنچتا ہے کہ وہ بے آب وگیاہ چٹیل میدان میں گرفتار ہو جاتا ہے، شدت پیاس سے جان

لب پر آ چکی ہوتی ہے اور سوزشِ تشنگی اس کو قبر تک پہنچا چکی ہوتی ہے، اس حال میں اس نے بعد کوشش بسیار صاف وشفاف پانی کا پیالہ حاصل کیا ہو اور اپنی پوری رغبت سے اس کی طرف متوجہ ہو کر اور اپنی نجات کو اس میں منحصر جان کر اپنے ہاتھ میں پانی سے بھرا ہوا گلاس لے کر چاہتا ہو کہ لب کی خشکی اور سینہ کی سوزش کو اس آب زلال سے دور کرے اور اپنی جان کو ہلاکت سے بچائے، اسی اثنا میں اس نے کسی دوسرے شخص کو جو اسی حالت سے دوچار تھا، اپنے اوپر ترجیح دی، گویا اپنی جان نکال کر اور اپنا جگر کاٹ کر اس کو دے دیا، تو ایسے وقت میں یہ عمل اس قدر تاثیر رکھتا ہے کہ دوسرے اوقات میں اس کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔

اور اسی طرح امر بالمعروف اور نہی عن المنکر (اچھی باتوں کا حکم دینا اور بری باتوں سے روکنا) ایک کام ہے جسے ہر وہ طالب علم جو مدرسے میں پڑھتا ہے اور ہر وہ درویش جو خانقاہ میں رہتا ہے، بلکہ ہر وہ مسلمان جو مسجد میں آمد و رفت رکھتا ہے اپنی وسعت کے بقدر بجالاتا ہے، مگر کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ناگاہ ایسا وقت آ پہنچتا ہے کہ اس وقت کلمۂ حق کے اظہار سے جان جانے کا خطرہ اور بے عزتی و رسوائی کا اندیشہ ہوتا ہے، تو ایسے وقت میں کسی سنت کا زندہ کرنا یا کسی بدعت کا مٹانا ایسی تاثیر رکھتا ہے جس کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔

ان باتوں کا خلاصہ یہ ہے کہ یہی آسان کام جن کی طرف عام طور پر کوئی بلند ہمت شخص توجہ نہیں کرتا اور ان کاموں کو چنداں اہمیت نہیں دیتا اور یہ کام اپنے فاعل کے نفس میں کچھ اثر نہیں کرتے، پھر ایک وقت ایسا آ جاتا ہے کہ یہی کام افضل ترین عبادت اور مشکل ترین ریاضت بن جاتے ہیں اور کام کرنے والے کے نفس میں ایسی تاثیر بہم پہنچاتے ہیں کہ ان جیسے ہزار کاموں سے ویسی تاثیر حاصل ہونے کی امید نہیں ہوتی۔

## تیسرا افادہ: قبولیت کی جگہوں میں نیک کام بجالانے کا بیان

محبت ایمانی کو مضبوط کرنے والی باتوں میں سے اہم موقعوں پر شریعت کی تائید، احیائے سنت اور ازالۂ بدعت جیسا کوئی کام کرنا، یا صحیح سلوک میں سے کسی طریق کی

اشاعت، یا اللہ تعالیٰ کے مقبول بندوں میں سے کسی مقبول بندے کی مدد واعانت، یا مصائب وآزمایشوں میں گرفتار لوگوں میں سے کسی مصیبت زدہ اور ستم رسیدہ کی فریادرسی ونصرت، یا ضرورت مندوں وقرض داروں میں سے کسی بے بس کا تعاون یا کسی پریشان حال کی پریشانی دور کرنے یا کسی تنگ دست کی تنگ دستی زائل کرنے میں جدوجہد کرنا یا ایسی سعی وکوشش کرنا جس سے نفع عام ظاہر ہو، یا لوگوں کے درمیان اصلاح کا کام ہو اگرچہ یہ کوشش نفس پر بہت گراں نہ گزری ہو اور بہت سارے مال واسباب خرچ کرنے کا سبب نہ بنی ہو، یا قیمتی اوقات یا پسندیدہ چیزوں کے ترک کرنے یا مالوفات چھوڑنے کا باعث نہ ہو لیکن یہ مذکورہ بالا امور محبت ایمانی کو بہت تقویت پہنچاتے ہیں۔

سمجھ دار ماہرِ فن حدیث پر پوشیدہ نہ رہے کہ جو کچھ احادیث رسول امین صلی اللہ علیہ وسلم اور آثارِ سلف صالحین رحمۃ اللہ علیہم میں آسان اور تھوڑے کام پر بہت زیادہ اجر وثواب کا ذکر آیا ہے اجمالی طور پر اس کی وجہ یہی سمجھنی چاہیے، یعنی یہ اعمال دوسری یا تیسری قسم کے ہیں، اگر یہ افعال مع شرائط صادر ہوں تو اپنے فاعل کے نفس میں حب ایمانی کے پیدا ہونے کے موجب ہوتے ہیں اور حب ایمانی بحسب مراتب کمال ونقصان کے اعتبار سے نجات کا سبب اور رفع درجات کا ذریعہ ہوتی ہے۔

# تیسری ہدایت

## حبّ ایمانی کی علامتوں کا بیان

یہ ہدایت چھ افادات پر مشتمل ہے:

پہلا افادہ: اللہ تعالیٰ کی رضا کی تحصیل میں پوری توجہ لگا دینے کا ذکر

محبت ایمانی کے بہترین آثار میں سے ایک یہ ہے کہ فکر وخیال اللہ تعالیٰ کی

خوشنودی کی تلاش میں فنا ہو جائے، اور اللہ تعالیٰ کے احکام کی تعمیل، کسی مقبول طریقت کی اشاعت، لوگوں کو اللہ کی اطاعت و بندگی کی طرف بلانا اور انھیں بدعت وفساد چھوڑنے کی طرف رہنمائی کرنا یہ سب اعمال خیر اس کی رضا حاصل کرنے کے ذرائع ہیں۔ محبت ایمانی کے حامل اشخاص کے دل میں حق تعالیٰ سے ہم کلام ہونے اور اس کا مشاہدہ کرنے کی خواہش نہیں ہوتی ہے اور نہ ہی مقامات فنا اور رفنا کے حصول کی تمنا ہوتی ہے اور نہ ہی اشیاء کے منکشف ہونے کی طلب وآرزو۔

تم یہ نہ سمجھنا کہ اس کلام سے ہمارا مقصود یہ ہے کہ یہ حضرات اس مرتبے سے محروم ہوتے ہیں کہ وہ ان مقامات تک نہیں پہنچ سکتے اور ان درجات پر فائز نہیں ہو سکتے، حاشا وکلّا کیوں کہ وہ لوگوں میں سب سے زیادہ مشاہدہ ومکالمہ کی سعادت سے بہرہ ور ہوتے ہیں اور فنا کے میدانوں کے سب سے تیز وچالاک شہشوار ہیں اور حقائق اشیا کے انکشاف اور معارف کے سمندروں کے سب سے بہترین پیراک ہیں۔ بلکہ اس بیان سے مراد یہ ہے کہ ان کے عزم وارادہ اور فکر وخیال کا قبلہ وکعبہ صرف مولائے حقیقی کی رضا اور مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی ہوتی ہے، اگر چہ وہ مقامات عالیہ اور درجات رفیعہ کسبی یا وہبی طریقوں میں سے کسی دوسرے طریقے کے ذریعے ان کو نصیب ہو جائیں۔

فراق ووصل چہ باشد رضائے دوست طلب        کہ حیف باشد از وغیر ایں تمنائے (۳۶)

غرض اس محبت کے حامل شخص کے سامنے بجز مولیٰ کی رضا کی طلب اور اس کی اطاعت کے کوئی دوسرا مقصد نہیں ہوتا، اور اس عدم مشاہدہ سے جو اس کی فرماں برداری میں خلل انداز نہ ہو اور حق تعالیٰ کے غصہ کا سبب نہ ہو، اسے کچھ عار نہیں اور وہ حالات نفسانیہ وملکات قلبیہ جو طاعت وبندگی کے اضافے کے باعث نہ ہوں، اس کے کسی کام کے نہیں۔ اور اس توجہ وفکر اور رفنائے ارادہ کا نتیجہ ماسوا اللہ سے محبت ونفرت کے ان تعلقات کا ختم ہو جانا ہے جن کا منشا خدا کی رضا جوئی نہ ہو، نیز ایسا شخص پریشانیوں کے حل، مصیبتوں کے ٹلنے،

منفعتوں کے حصول اور اس طرح کی دوسری خوف و امید کی باتوں کو اللہ تعالیٰ کی محبت پر موقوف جانتا ہے۔ اور ان تمام امور کی بنیاد ایک قلبی حالت ہے جس کو اللہ تعالیٰ کی پرورش پر بھروسا کہتے ہیں جیسے فرماں بردار غلام اپنے آقا کی پرورش پر بھروسا کرتا ہے، اور وہ فرماں بردار غلام اسی اعتماد کی وجہ سے اپنی حاجت برآری کی فکر سے ہر حالت میں مطمئن رہتا ہے، رنجیدہ اور غمگین نہیں رہتا اور اپنے آقا کے سوا کسی اور سے کوئی ڈر اور امید نہیں رکھتا اور اس کے زیر ملکیت چیزوں جیسے رعایا اور چوپائے وغیرہ، ان میں بے دھڑک اس کی اجازت سے تصرف کرتا ہے اور اس کے نافرماں غلاموں اور باغی خادموں پر بڑی دلیری سے غضب ناک شیر اور غصہ ور ہاتھی کی طرح حملہ آور ہوتا ہے، اور یہی دل کا اعتماد توکل کی روح ہے اور دیگر ساری باتیں اس کے اجسام ہیں، تم یہ نہ سمجھنا کہ توکل کا مطلب ترک اسباب ہے، نہیں بلکہ اس کا مطلب اسباب پر بھروسا نہ کرنا ہے ؎

گفت پیغمبر بآواز بلند بر توکل زانوے اشتر بہ بند(۳۷)

دوسرا افادہ: مصائب پر دلیری کا ذکر

حبِّ ایمانی کی جملہ علامتوں میں سے ایک یہ ہے کہ مصیبتوں اور پریشانیوں کو خندہ پیشانی سے برداشت کرے، اور یہ امر صبر کی قسم سے نہیں ہے بلکہ اس کا مقام اس سے بلند ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ جیسے کوئی شخص اپنے محسن کی رضا جوئی کے لیے مشقتوں کو برداشت کرتا ہے اور ان مشقتوں کی تلخی اس کے دل و جان تک پہنچتی ہے اور کلفت و پریشانی اس کے چین وسکون کو غارت کر دیتی ہے لیکن چوں کہ وہ اپنے کرم فرما کی خوشنودی ان مشقتوں کے تحمل میں جانتا ہے، اس لیے وہ ان تمام سختیوں و تلخیوں کو اپنے اوپر روا رکھتا ہے۔ اس جفاکشی اور تحمل مشقت کو جسے اس شخص نے اپنے آقا کی رضا کے لیے بجالایا ہے، صبر کی قسم سے شمار کرنا چاہیے۔

اور دوسرا شخص جس کو اس کے محسن نے اپنی گوناگوں نعمتوں سے نوازا ہو، قسم قسم کی نعمتوں سے محظوظ کیا ہو مثلاً اس کے واسطے ایک بلند محل تعمیر کیا ہو، اس کے لیے خوشی و مسرت

کی محفل سجائی ہو، اس کے لیے عیش ونشاط اور موج ومستی والوں کو حاضر کیا ہو اور اس کے واسطے مسند شاہانہ اور شادی کا جوڑا تیار کیا ہو اور وہ فرماں بردار غلام پوری عزت وافتخار سے اس محفل میں رونق افروز ہو، پھر اگر اس سرور وشادمانی اور عیش ومستی کے موقع پر کوئی مچھر یا کھٹمل اسے کاٹ لے تو وہ فرماں بردار غلام جو سر سے پاؤں تک انعامات واکرامات میں ڈوبا ہوا ہے، اس گزند کو خوشی ومستی کی موجوں میں ذرّہ برابر بھی محسوس نہیں کرے گا اور ہرگز اس سے کوئی دکھ درد اس کے دل میں نہیں پہنچے گا، اور اگر کبھی اس سے کوئی ایسی حرکت صادر ہو جائے جو اس کی پریشانی وبے چینی کا پتا دے تو یقیناً وہ اپنے دل میں شرمندہ ہوگا اور اس نامناسب حرکت کے صادر ہونے کی وجہ سے خود کو بچوں اور بے وقوفوں کی فہرست میں شمار کرے گا۔

اسی طرح صاحب حب ایمانی نعمِ الٰہی کی کثرت اور حق تعالیٰ کی گوناگوں تربیت کے دھیان کے سبب کسی بھی مصیبت کو اگرچہ وہ بہت بڑی ہو، ایک جو کے برابر بھی نہیں سمجھتا ہے اور اس مصیبت کا دکھ درد اس کی فرحت وسرور میں کچھ بھی خلل وخرابی نہیں ڈالتا ہے۔ پس مصیبتوں کی طرف بے اعتنائی، سختیوں کے تئیں بے توجہی اور محسن کی نعمتوں پر انتہائی خوشی ومسرت کو مصائب پر دلیری جاننا چاہیے۔

یہاں سے معلوم ہوا کہ حب ایمانی والے کا کام شکر در شکر ہے اور کبھی بھی اس کا کام صبر تک نہیں پہنچتا ہے۔ اور شکر کی روح وہی سرور قلبی ہے جو بے شمار نعمتوں اور بے حد وحساب بخششوں کے دھیان کی وجہ سے حاصل ہوئی ہے، اور تمام تعظیمی اقوال وافعال اس کے قالب ہیں، اور مصائب پر دلیری کے فروعات میں سے دائمی فرحت وراحت ہے کیوں کہ اس دلیری کی بنیاد وہی خوشی ومسرت ہے جو محسن حقیقی کی نعمتوں کے تصور کے سبب سے ہے، باوجود اس کے کہ اس محسن کی ذات والا صفات پوری کائنات سے بے نیاز ہے جن میں یہ مشت خاک وذرۂ بے مقدار (انسان) بھی شامل ہے۔

اور یہ بالکل ظاہر ہے کہ اس بے شمار برکتوں والی ذات کا استغنا ہمیشہ سے ہے اور

ہمیشہ رہے گا، اوراس کی نعمتوں کا فیضان ہر وقت جاری رہتا ہے۔اوراسی دلیری کی شاخوں میں سے تقدیر پر رضامندی ہے، لہٰذا وہ مومن خالص اور محبّ حقیقی جب خود کو باوجود عدم استحقاق کے ہر حالت میں قسم قسم کی نعمتوں اور بخششوں سے مالا مال دیکھتا ہے تو ضرور اس کی عقل خالص جو نورِ ایمان سے روشن ہے ہر بلا و مصیبت کو جو اسے پیش آتی ہے اس کو تربیت وتادیب کی قبیل سے شمار کرے گا۔اوراس سے قطع نظر جب وہ خیال کرے گا کہ وہ کسی بھی صورت میں کسی نعمت کا مستحق نہیں ہے تو وہ بعض نعمتوں کی کمی کی شکایت نہیں کرے گا بلکہ حرف گلہ وشکوہ اس کے ذہن میں کوئی جگہ نہیں پائے گا۔

بدرد و صاف ترا حکم نیست دم درکش

کہ ہرچہ ساقی ماریخت عین الطاف است (۳۸)

اسی لیے صاحب حب ایمانی کو اشعار شوقیہ اور مضامین عشقیہ سے بالکل لطف حاصل نہیں ہوتا ہے، کیوں کہ ان کلمات کی بنیاد زیادہ تر شکوہ وشکایت پر ہوتی ہے، بلکہ اس طرح کے اشعار سننے سے اسے اذیت ہوتی ہے۔

## تیسراافادہ: دشوارریاضتوں کی طرف اصحابِ حبّ ایمانی کی بےتوجہی کا ذکر

حبّ ایمانی کی جملہ علامتوں میں سے کھانے، پینے، پہننے اور ان جیسی دوسری جائز نفسانی لذتوں میں ریاضات شاقہ کی طرف بے توجہی ہے یعنی وہ ان دشوار ریاضتوں کو اپنی مکمل کرنے والی باتوں میں سے نہیں جانتا ہے اور ان کا تحمل جان بوجھ کر نہیں کرتا ہے، البتہ اگر درست مقاصد میں سے کوئی مقصد جو اس کے کمال کے لوازمات اور اس کی حالت کی علامات میں سے ہے، ان مصیبتوں پر مرتب ہو تو وہ ضرور ان امور شاقہ کو آسان بلکہ لذیذ جان کر انتہائی جرأت مندی اور کشادہ قلبی سے برداشت کرے گا جیسے جہاد اور اس جیسے دوسرے مؤیدات دینِ متین اور متممات شرع مبین میں مشقتوں کو برداشت کرنا، اور جیسے کسی ایسی پسندیدہ چیز کے چھوڑنے میں مشقت اٹھانا جس کی رغبت دل کی تہہ میں جاں گزیں ہوگئی ہو اور جیسے بھوک،

پیاس اور برہنگی کی تکلیف کوخود پر ضرورت مندوں کوترجیح دینے کی وجہ سے جھیلنا۔

ان جیسے اور بھی بہت سے امور ہیں جو محنت کشی کے سبب بن سکتے ہیں، غرض یہ کہ صاحب حب ایمانی ایسی ریاضتوں کو بلا سبب قصداً نہیں اختیار کرتا ہے بلکہ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ حظوظ نفسانیہ اور لذائذ جسمانیہ اس کو بڑی ترقی عطا کرتے ہیں چناں چہ اس آیت میں اس بات کی طرف اشارہ ہے۔" یٰاَیُّھَا الرُّسُلُ کُلُوْا مِنَ الطَّیِّبَاتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا" (۳۹) اس کی تفصیل یہ ہے کہ جیسے کوئی آقا اپنے کسی برگزیدہ غلام کو اپنے ساز و سامان میں تصرف کی مطلق اجازت دے دیتا ہے، پھر اگر وہ غلام محض تعلق کے اظہار کے لیے (بلکہ اپنی سخت ضرورت کو ظاہر کرنے کے لیے، کیوں کہ اس کا کوئی دوسرا سرپرست نہیں ہے جو اس کی حاجتوں کا کفیل ہو یا کوئی دوسرا آقا نہیں ہے جو اسے نفسانی لذتوں سے بہرہ ور کرے)، ضرورت سے زیادہ بعض سامانوں میں تصرف کرتا ہے تو یقیناً اس عمل سے اس کے تعلقات مضبوط ہوں گے، اور اگر وہ اس کام سے اجتناب کرتا ہے تو لامحالہ وہ اپنے اور اپنے آقا کے درمیان اجنبیت و بے گانگی کا پردہ ڈالے گا، بلکہ اگر تم آقاؤں اور مخلص غلاموں کے معاملات میں خوب غور کرو تو معلوم ہو جائے گا کہ بعض اوقات ایسے غلاموں کا اپنے آقاؤں سے نفسانی لذتوں اور جسمانی راحتوں کا درخواست کرنا بلکہ فرمائش کر کے مانگنا علاقۂ غلامیت کو ایسی ترقی عطا کرتا ہے کہ اس کے حصول کا تصور ہزار خدمتوں سے بھی نہیں کیا جا سکتا ہے، بلکہ بسا اوقات وہ محبوب غلام جانتا ہے کہ عیش و عشرت کے تمام اسباب اور آرام و راحت کے تمام سامان اسی غلام کے واسطے اس کے مالک نے تیار کیے ہیں، لیکن آقا نے محض اپنے احسان کے اظہار یا صرف اس کی حاجت کے اظہار یا فقط خوش طبعی کے لیے ان کے استعمال کی اجازت کو اس غلام کی درخواست پر موقوف کر دیا ہے، پھر ایسی حالتوں میں درخواست و طلب اپنے اندر ایسا لطف رکھتی ہے جو بیان سے باہر ہے۔

خلاصۂ کلام یہ کہ جب حظوظ نفسانیہ اور لذائذ جسمانیہ کا حصول اکثر اوقات حب

ایمانی کے معاملات میں جو کہ مقصود شریعت ہے، باعث خلل نہیں ہوتا، بلکہ بعض اوقات بڑا نفع بخشتا ہے اور شکر کا دروازہ جو حب ایمانی کی سب سے بڑی نشانی ہے، اس پر کھول دیتا ہے، اسی لیے کلام ربانی اور آیات قرآنی ان لذتوں کی اباحت پر دلالت کرتی ہیں اور ان خوش مزہ چیزوں سے لطف اندوز ہونے والوں پر اعتراض کرنے سے خاموش ہے۔

چناں چہ حق تعالیٰ نے فرمایا:

"یٰاَیُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا کُلُوۡا مِنۡ طَیِّبَاتِ مَارَزَقۡنٰکُمۡ (۴۰) یٰاَیُّھَا الرُّسُلُ کُلُوۡا مِنَ الطَّیِّبٰتِ وَاعۡمَلُوۡا صَالِحًا (۴۱)، قُلۡ مَنۡ حَرَّمَ زِیۡنَۃَ اللّٰہِ الَّتِیۡۤ اَخۡرَجَ لِعِبَادِہٖ وَالطَّیِّبَاتِ مِنَ الرِّزۡقِ قُلۡ ھِیَ لِلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا خَالِصَۃً یَّوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ". (۴۲)

چوتھا افادہ: سرگوشی کی چاشنی کا ذکر

حبّ ایمانی کے جملہ آثار میں سے دعا و مناجات کی حلاوت اور طاعات وعبادات کی لذت کا پانا ہے اور اس امر کی حقیقت شروع کلام میں گزر چکی ہے، کیوں کہ حب ایمانی ایسی محبت کا نام ہے جو بے حد تعظیم سے جڑی ہوئی ہے اور یہ چیز تعظیمی اقوال وافعال کے صدور کا باعث ضرور بنتی ہے، بلکہ حمد وثنا اور تعظیم وتکریم کا اس قدر مطالبہ کرتی ہے کہ ان کو عمل میں لائے بغیر اس محبت والے کے دل کو قرار نہیں ملتا ہے جیسے غصہ ور شخص کو غصہ والے کام کیے بغیر اور خوش وخرم شخص کو خوشی والے کام کیے بغیر چین نہیں آتا ہے، چناں چہ ابتدا میں اس پر بالتفصیل کلام کیا گیا ہے۔

الغرض شریعت کا باطن جس کو تعلق مع اللہ کہتے ہیں اور اس کا ظاہر جس کو اعمال کہتے ہیں یہ دونوں اس صاحب حال کے حق میں ہمیشہ ایک دوسرے سے مربوط رہتے ہیں اس کے باطنی احوال اس کے ظاہری اعمال سے وابستہ رہتے ہیں؛ لہٰذا احوال، افعال کے صدور کا تقاضا کرتے ہیں اور افعال احوال کو خوب ترقی وقوت بخشتے ہیں۔ اس محبت کا حامل

شخص طاعت وعبادت میں لذت وحلاوت پانے کی وجہ سے خشک زہد سے دوراور الحاد سے مبرّا ہوتا ہےاور تقویٰ وعبادات کے معاملے میں افراط وتفریط سے محفوظ رہتا ہے۔

## پانچواں افادہ: ذاتی فضائل پر متعدی منافع کو ترجیح دینے کا ذکر

حبّ ایمانی کی جملہ نشانیوں میں سے اپنی ذات کی تکمیل پر متعدی فوائد کو ترجیح دینا ہے، مثلاً صاحب حب ایمانی لوگوں کے درمیان صلح وصفائی کرنے گھریلو وملکی تدبیر انجام دینے، اللہ کی مخلوق کی خدمت میں مشقتوں کو برداشت کرنے، ان کی تربیت میں زحمت اٹھانے اوران جیسے لوگوں سے ملنے جلنے کے کام کو مخلوق سے دوری وعزلت نشینی، جنگلوں وبیابانوں میں سکونت گزینی اوراپنے اوقات کواذکار واشغال سے معمور رکھنے پر ترجیح دیتا ہے۔ مذکورہ باتیں اگرچہ مشاہدہ ومکالمہ کی تحصیل میں قوی تاثیر رکھتی ہیں، لیکن پہلی قسم کواللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے حصول میں دوسری قسم سے زیادہ دخل ہےاوراس محبت کا حامل شخص کسی بھی کمال کواللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کےاسباب کے برابر نہیں شمار کرسکتا ہے۔

## چھٹا افادہ: حقیقتِ تقویٰ کا ذکر

حبّ ایمانی کی اہم ترین علامتوں اورافضل ترین لوازم میں سے حقیقی تقویٰ ہے جس کو عرف شرع میں ''صلاح'' سے تعبیر کیا گیاہے، چناں چہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَاۗءِ وَالصّٰلِحِيْنَ" (۴۳) اورحدیث میں وارد ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: "اَلتَّقْویٰ ھٰهُنَا" (۴۴) (تقویٰ یہاں ہے)۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ ضرر رساں امور کی مضرت کا یقین کہیں زیادہ ہوتا ہےاور کہیں کم ہوتا ہے، جو شخص نفس یقین میں کمی وبیشی کا قائل نہیں ہے، اس کی بات وجدان ودلیل کے خلاف ہےاوراس کے کلام کی تاویل کی گئی ہے، چناں چہ اس کی تفصیل اس کے مقام پر کی گئی ہے۔

بہر کیف جو شخص نقصان دہ امور کی مضرت کا اعتقاد رکھتا ہے لیکن اس کا نفس ان

کے چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہوتا، تو اس کو یقین کا سب سے کمزور ترین درجہ حاصل ہے، اس درجہ کو ''اذعان عقلی'' کہتے ہیں۔

دوسرا شخص جس کو ان نقصان دہ چیزوں کے نقصان کا یقین اس حد تک ہو کہ اس کی وجہ سے وہ اپنے نفس کو ان ضرر رساں چیزوں کے ارتکاب سے روک سکتا ہے، اگر چہ ان نقصان دہ امور کی خواہش اوران کی طرف میلان اس کے دل کی تہہ میں پوشیدہ ہو، لیکن اس کی مضرت کا یقین اس سے مقابلہ کرتا ہے اوراس کو نہیں چھوڑتا ہے کہ وہ اپنے اعضاو جوارح کو ناپاک اور گناہ کے کاموں سے آلودہ کرے، تو اس شخص کو پہلے کی بہ نسبت زیادہ مضبوط اور بلند درجہ یقین کا حاصل ہے، اس مرتبہ کو ''اذعان افعالی'' سے تعبیر کرتے ہیں۔

اور تیسرا شخص جس کو ان امور ضارہ کی مضرت کا یقین اس درجہ ہوتا ہے کہ جب وہ اموراس کے سامنے آتے ہیں تو اس کو خیال ہوتا ہے کہ ان کا اثر اس کے دل میں پہنچے گا، یا کوئی ایسا واقعہ پیش آتا ہے جواس کے ان کاموں پر پیش قدمی کا باعث ہوتا ہے تو یقیناً اس کے باطن میں اس سے ایسا ڈر اور رکاوٹ پیدا ہوتی ہے جواس کے امور طبیعیہ کے نظام کو تہس نہس کر دیتی ہے۔ مثلاً اس کا رنگ اڑ جاتا ہے، اس کی آنکھیں پتھرا جاتی ہیں، اس کے پٹھوں میں سستی اوراس کے ہاتھ پاؤں وغیرہ میں کپکپی طاری ہونے لگتی ہے، اس مقام کو ''اذعان قلبی'' سے نامزد کرتے ہیں۔

پس یقین کے انھیں تینوں مراتب کو شرعی گناہوں، ترک فرائض وواجبات اوران جیسی دوسری ممنوع چیزوں جیسے صورت ولباس میں کافروں کی مشابہت، ان کے تہواروں میں شرکت، اہل بدعت وخرافات سے میل جول اوران کی بدعات کی ترویج میں اعانت کے مقابلے میں قیاس کرنا چاہیے، الغرض یقین کا پہلا درجہ عین ایمان ہے، اس کے بغیر دوزخ کے عذاب سے نجات ممکن نہیں ہے اور دوسرے درجہ کو ظاہری اعتبار سے پرہیز گاری کی روح سمجھنا چاہیے کیوں کہ ظاہر تقویٰ معاصی ومنکرات سے پرہیز اور نفوس امّارہ سے

مجاہدہ ومقابلہ کا نام ہے اور اس کی روح یقین کا یہی درجہ ہے جس کے ذریعے نفس وشیطان سے لڑائی کی جاسکتی ہے۔ اور یقین کے تیسرے درجہ کو حقیقی پرہیز گاری کی روح تصور کرنا چاہیے کیوں کہ حقیقی تقویٰ ممنوعات شرعیہ کی نسبت طبعی کراہت کا نام ہے اور اس کی روح وہی مرتبۂ یقین ہے جو ایمان کی چاشنی ہے اور جسے احسان کے مراتب میں سے شمار کیا جاتا ہے۔ یہ سب اس صاحب مقام کے آثار کے تھوڑے بہت نمونے ہیں، ہر صحیح وسالم وجدان والا اور درست ذہن والا جب اپنی نگاہ بصیرت سے ان بیان کردہ امور میں غور کرے گا، تو وہ ضرور ان تھوڑی علامتوں سے بہت سی علامتوں کا استنباط کرلے گا۔

# چوتھی ہدایت

## حبّ ایمانی کے نتائج کا بیان

**یہ ہدایت پانچ افادات اور دو فوائد پر مشتمل ہے:**

### افادہ اوّل: شہداء اور محدثین کے مقام کا بیان

جب حبّ ایمانی جس کی حقیقت انتہائی تعظیم ومحبت ہے، اپنے کمال کو پہنچتی ہے اور منعم حقیقی کی رضا جوئی مومن کے ظاہر و باطن اور اس کے اعضا وقویٰ کو اپنے آثار وانوار سے روشن وآراستہ کردیتی ہے اور شکر، توکل اور پرہیز گاری اس کے تہہ دل میں جا گزیں ہوجاتی ہے اور اللہ تعالیٰ کا تنہا تمام موجودات کو وجود بخشنے اور پوری کائنات میں طرح طرح کے تصرف کرنے کا دھیان اس کے ذہن میں مستحکم ہوجاتا ہے، جس کا ایک نمونہ اس کا اس ذرّۂ بے مقدار اور مشت غبار کی قسم قسم کی نعمتوں سے پرورش کرنا اور گوناگوں مصیبتوں سے اس کی حفاظت کرنا ہے، اور جب توحید افعالی جس کا خلاصہ تقدیر پر ایمان لانا ہے اس کے دل میں بیٹھ جاتی ہے، یہاں تک کہ وہ اپنے تمام ساز وسامان کو بھی اپنی ملکیت نہیں جانتا ہے

بلکہ خود کو اس جانور کی طرح سمجھ کر جو اپنے مالک کے چراگاہ میں چرتا ہے دنیا کی آرائشوں اور اسباب زندگی سے فائدہ اٹھاتا ہے، اور اپنے اعضا وقویٰ کو اور اپنی نیکیوں وعبادتوں کو بھی اپنا نہ جان کر خود کو اس لکڑی یا پتھر کے مانند قرار دیتا ہے، جس کی حیثیت اس کے مالک کے ہاتھوں سے افعال صادر ہونے کے آلہ وواسطہ کی ہے، اور پروردگار عالم کی ربوبیت پر اس کا سینہ کھل جاتا ہے کہ "رَضِینَا بِاللّٰہِ رَبًّا" (۴۵) اسی مقام کی طرف اشارہ ہے اور شرعی مشقتوں کے برداشت کرنے پر اس کا دل کشادہ ہوجاتا ہے کہ "وَبِالْاِسْلَامِ دِیْنًا" اسی حقیقت کی ترجمانی کرتی ہے اور اسی طرح "اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰہُ صَدْرَہٗ لِلْاِسْلَامِ" (۴۶) سے بھی اسی بات کی طرف رہنمائی کی گئی ہے، اور اتباع سنت میں ایسی لذت پاتا ہے کہ "وَبِمُحَمَّدٍ نَبِیًّا" ایسے بزرگوں کے احوال کا بیان ہے تو ضرور بحکم وعدۂ الٰہی "وَالَّذِیْنَ جَاھَدُوْا فِیْنَا لَنَھْدِیَنَّھُمْ سُبُلَنَا" (۴۷) اور "وَاَنَا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِیْ بِیْ" (۴۸) "وَ مَنْ یَّتَوَکَّلْ عَلَی اللّٰہِ فَھُوَ حَسْبُہٗ" (۴۹) "وَ اِنْ تَشْکُرُوْا یَرْضَہُ لَکُمْ" (۵۰) "وَ ھُوَ یَتَوَلَّی الصَّالِحِیْنَ" (۵۱) اور "ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰہَ مَوْلَی الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا" (۵۲) اللہ تعالیٰ کی محبت کے آثار ظاہر ہونے لگتے ہیں اور اس کی خوشنودی کے انوار کہ آیت کریمہ "اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰہُ صَدْرَہٗ لِلْاِسْلَامِ فَھُوَ عَلٰی نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّہٖ" میں اس کی طرف اشارہ ہے، جلوہ گر ہونے لگتے ہیں اور حق تعالیٰ اس کو اپنی ولایت وکفالت کے سایہ میں لاکر اپنی تکوینی وتشریعی تدبیر کا ایک آلہ بنا دیتا ہے۔

الغرض اس کو حظیرۃ القدس سے تعلق ہوجاتا ہے اور سرچشمۂ ایجادات وتشریعات سے اسے فیض حاصل ہوتا ہے خواہ وہ علوم عقلیہ کے سلسلے میں ہو یا احوال قلبیہ کے سلسلے میں، اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ روحانی قانون دانوں نے انسان کے باطن میں دو قوتیں معلوم کی ہیں، ایک قوت درّاکہ (معلوم کرنے والی قوت) ہے جو جاننے اور معلوم کرنے کا آلہ ہے یعنی اس قوت سے ظاہر یا پوشیدہ چیزوں کو دریافت کر سکتے ہیں اور اس کا نام عقل ہے۔

دوسری قوّت عازمہ (ارادہ کرنے والی قوت) ہے جو علوم و معارف کے سوا تمام نفسانی کیفیتوں کی حامل ہے مثلاً خوشی، غصہ، بہادری، ڈر، محبت، نفرت، رضامندی، ناپسندیدگی اور عزم وشوق وغیرہ، اس قوت کا نام قلب ہے۔

دونوں قوتوں کے درمیان فرق بالکل ظاہر ہے، اس لیے کہ بہادری کا مطلب جاننا اور اس کی حقیقت کی تہہ تک پہنچنا ایک الگ چیز ہے اور نفس بہادری ایک دوسری شے ہے۔ کیوں کہ بہت سے لوگ دلیری کے مفہوم کو جاننے والے اور اس کے انواع واقسام اور اس کے حاصل کرنے کے طریقوں سے واقف ہیں، مگر وہ کسی ڈاکو بلکہ ایک چور کا بھی مقابلہ نہیں کر سکتے، اور کتنے مضبوط دل والے ہیں جو جنگ آزمائی اور معرکہ آرائی میں یکتائے روزگار ہیں مگر وہ دلیری کا مطلب نہیں جانتے اور تمام نفسانی کیفیتوں سے اس کو الگ کرنا ان کے لیے مشکل بلکہ محال معلوم ہوتا ہے۔

اور اسی طرح اس چیز کا ادراک کرنا جس سے ڈرا جاتا ہے جیسے پاگل ہاتھی یا غصہ ور شیر کا احساس اور جیسے ضرر رساں چیزوں کی مضرت کا یقین خواہ وہ دنیوی اعتبار سے ہو یا اخروی اعتبار سے، دوسری چیز ہے اور خود ڈر کی کیفیت کا پیش آنا جس کی علامتوں میں سے چہرہ کی زردی، آنکھوں کی بے رونقی، ہونٹوں کی خشکی اور اعصاب کی سستی ہے، ایک الگ شے ہے۔

اس لیے کہ خوفناک چیز کو تو بہادر و بزدل دونوں جانتے ہیں لیکن بزدل پر ایسی حالت طاری ہوتی ہے جس کا دسواں حصہ بھی بہادر پر طاری نہیں ہوتا۔ اسی طرح کسی حسن وجمال والی دوشیزہ کی خوبصورتی کو جاننے اور اس کے خدوخال کو معلوم کرنے میں عاشق وغیر عاشق دونوں برابر ہوتے ہیں، لیکن عاشق کے دل پر جو بے چینی و بے قراری گزرتی ہے وہ غیر عاشق کے دل پر نہیں گزرتی۔

جب یہ تمہید مکمل ہو چکی اور عقل ودل کے درمیان فرق ذہن نشیں ہو گیا تو جاننا چاہیے کہ بعض اشخاص آغاز پیدائش ہی سے عقل کے تیز اور دل کے کند ہوتے ہیں اور بعض اس کے

برعکس، چناں چہ اہل تجربہ پر یہ امر پوشیدہ نہیں ہے۔ پس جو لوگ ابتداے آفرینش ہی میں تیز ذہن پیدا ہوئے ہیں، جب عنایت ازلی ان لوگوں کو اس مقام تک پہنچاتی ہے اور غیبی تاثیروں کی وساطت سے ان کو معزز و مشرف کرتی ہے تو ادراک کے پہلو سے امورِ غیبیہ کی تدبیر میں اس کو خادم بناتے ہیں اور شعور کے پہلو سے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور اس کی ولایت و کفالت کے آثار اس پر ظاہر کرتے ہیں۔ مثلاً ایسا شخص خواب میں دیکھتا ہے کہ اللہ جل شانہ کی طرف سے یا معزز فرشتوں یا پیغمبروں یا ولیوں کی طرف سے کسی کام کو انجام دینے کا حکم اس کو ہوتا ہے، یا کسی معاملہ میں کلام کے ذریعے اس کام کی طرف شوق دلایا جاتا ہے، یا کشف کے راستے سے اس واقعے کا پورا حال اوّل سے آخر تک اس کے سامنے ظاہر ہو جاتا ہے، یا غور و فکر کے وقت مامور بہ کو انجام دینے پر آمادگی اور اس کے چھوڑنے کے مقابلے میں اس کو عمل میں لانے کے رجحانات اس کے ذہن میں آتے ہیں، اور ایسے ہی ان واقعات کے انکشاف کو جو تدبیرِ جہاں سے متعلق ہیں یا ان امور کے انکشاف کو جو طالبین کی تربیت سے تعلق رکھتے ہیں یا اجتہادی مسائل یا گھریلو انتظامات یا ملکی سیاسیات کے انکشاف کو بھی انھیں پر قیاس کرنا چاہیے۔

اور اسی طرح وہ اپنے بھلے اور برے کاموں کو جن کی پسندیدگی و ناپسندیدگی کے متعلق شبہ ہوتا ہے، روشنی و تاریکی کی صورت میں دیکھتا ہے اور زبانی شاباشی و نفرت کو خوشنما و بدنما شکلوں میں مشاہدہ کرتا ہے اور اس قسم کے لوگوں کو عرف و شریعت میں ''مُحَدَّثین'' کہتے ہیں۔

جو لوگ ابتداے آفرینش میں صاف دل پیدا ہوئے ہیں، یہ مذکورہ امور ان کے دل سے سرزد ہوتے ہیں، خواہ ان کی عقل ان امور کی حقیقت سے واقف ہو یا نہ ہو، مثلاً ان واقع ہونے والی چیزوں پر جن کے متعلق غیب میں لکھا جا چکا ہے کہ ان کا وقوع اس شخص کے ذریعے سے ہوگا، ایسی دلیری و جرأت پاتا ہے اور ایسا داعیہ و ارادہ اس کے دل سے اٹھتا ہے کہ اس کو ان کے کرنے پر مجبور کرتا ہے اور یہ شخص اس عزم و ارادہ کے پیدا ہونے کے سلسلے میں ششدر رہتا ہے اور اس کی وجہ نہیں سمجھ پاتا ہے۔ اور جو چیزیں وجود میں آنے والی نہیں

ہیں یا جن چیزوں کا وقوع تقدیر میں اس کے واسطے سے متعین نہیں ہے ان کی نسبت اپنے دل میں بزدلی، رکاوٹ اوران کے واقع ہونے کو محال محسوس کرتا ہے۔ نیز ان کے واقع ہونے کی کوشش میں سستی وکمزوری اور ان کے منظر عام پر آنے کے تئیں مشقتوں کی برداشت میں تکلیف وتکان اس کے باطن میں پیدا ہو جاتی ہے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ کے دشمنوں پر اس کے دل سے غصہ فوارہ کی طرح پھوٹتا ہے اور اس کے محبوب بندوں پر اس کے دل سے شفقت ورحمت کا صاف وشفاف پانی بارش کی طرح برستا ہے اگر چہ وہ ان امور پر جو خدا کے غضب سے ہمکنار لوگوں کی مغضوبیت یا اللہ کی رحمت سے مستفیض بندوں کی مہربانی کے باعث ہیں، مطلع نہ ہو، اور وہ اچھے و برے کام کر گزرنے کے بعد اپنے اندر خوشی یا گرانی پاتا ہے اگر چہ ان کے جائز و ناجائز ہونے کا علم اس کو نہ ہو۔

اور اس حلال وطیب کھانے کی طرف جو غیب میں اس کے کھانے کے لیے تیار کیا گیا ہے، اس کے دل میں رغبت پیدا ہوتی ہے اور حرام کھانے یا اس کھانے سے جو اس کے لیے تیار نہیں کیا گیا ہے، اسے نفرت وکراہیت ہوتی ہے گو کہ ظاہر میں وہ حلال معلوم ہوتا ہو اور بہت ایسا ہوتا ہے کہ ان بزرگوں کی عقلیں ان امور کی حقیقت تک نہیں پہنچتی ہیں اور ان عوارض قلبیہ کے پیش آنے سے انھیں حیرت ہوتی ہے۔ اس قسم کے اشخاص کو شریعت کی رو سے ''شہداء وحواریّین'' کہتے ہیں۔

محدّثین اور حواریّین کا وطیرہ کسی چیز کی طلب میں صرف دعا وتوجہ الی اللہ ہے نہ کہ اس چیز کی وقوع پذیری کی طرف پوری توجہ لگانا یا از خود کوئی نقصان یا نفع پہنچانے کے درپے ہونا جیسا کہ اہل قرب بالنوافل کا طریقہ ہے، لہٰذا دشمنوں سے انتقام لینے اور دوستوں کی غمخواری کے موقع پر ان اکابرین سے بجز دعا کے اور کوئی امر صادر نہیں ہوتا ہے۔ اقطاب واوتاد میں سے بعض حضرات دونوں طرح کے ہوتے ہیں۔

اس مقام کی ضروری باتوں میں سے یہ ہے کہ اس مقام پر فائز شخص کے واسطے

خواہ وہ مُحدَّث ہو یا شہید، وہ دعا جو مدعولہ کی حالت کے انکشاف یا اس چیز کے حصول کی سچی نیت کے بعد صادر ہو اس کا قبول ہونا ضروری ہے، اس لیے کہ وہ دعا بھی تقدیر کے ظہور کی جملہ شکلوں میں سے ایک شکل اور غیبی فیوض کی صورتوں میں سے ایک صورت ہے۔

لہٰذا جو شخص اس چیز کے ابطال میں جس کے متعلق دعا کی گئی ہے کوشش کر کے ان بزرگوں کے مقابلے میں کھڑا ہو وہ یقیناً ناکام و نامراد ہوگا اور جو شخص اس چیز کو حاصل کرنے اور اس کو ترقی دینے کی کوشش کرے گا جس کے لیے دعا کی گئی ہے تو وہ ضرور کامیابی و کامرانی سے ہمکنار ہوگا۔ اس مقام کی تحقیق اور اس مقصود کی تفصیل سلف صالحین کی سیرتوں جیسے صحابۂ کرام و تابعین عظام کے حالات زندگی سے معلوم کرنی چاہیے۔

غرض اس طریقت کے ائمہ حضرات اور اس جماعت کے اکابرین ان مدبّرات الامور فرشتوں کے گروہ میں شامل ہیں جن کو ملأ اعلیٰ کی طرف سے تدبیر امور کے سلسلے میں الہام ہوتا ہے اور وہ اس کو جاری کرنے میں جدوجہد کرتے ہیں، لہٰذا ان بزرگوں کے حالات کو فرشتوں کے احوال پر قیاس کرنا چاہیے۔

دوسرا افادہ: صدّیقین کے مقام کا بیان

اس مقام سے اعلیٰ و افضل ایمان حقیقی کا مقام ہے، بعض لوگ اسی خوبی پر پیدا ہوتے ہیں اور حب ایمانی اس دلکشا مقام کے چہرے سے پردہ اٹھاتا ہے اور اس کے انوار و آثار صدفی صد رونق و چمک کا جلوہ بکھیرتے ہیں۔ اس کی توضیح یہ ہے کہ جس طرح افراد انسانی نفسانی لیاقتوں کے اعتبار سے مختلف طبقوں میں بٹے ہوئے ہیں، بعض اچھی استعداد والے ہیں اور بعض بری استعداد والے۔ بعض لوگوں میں وہ لیاقتیں فطری طور پر پائی جاتی ہیں جیسے شجاعت کے متعلق اگر تم چھان بین کرو گے تو پاؤ گے کہ بعض لوگ پیدائشی طور پر بہادر اور مضبوط دل والے ہوتے ہیں اور وہ ہم عمروں سے مقابلے کے خواہاں اور بہادروں کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں، اگرچہ انھوں نے کبھی جنگ کا منھ تک نہ دیکھا ہو اور رستم و اسفندیار (۵۳) کا قصہ تک نہ

سنا ہو اور جنگ کے اسباب و آلات اور سواری و شکاری کی مشق نہ کی ہو، لیکن بہادری و دلاوری کا دریا ان کے دل سے جوش مارتا ہے اور وہ لڑائی کرنے والوں کے ساتھ رہنے بسنے کی کوشش کرتے ہیں اور جنگ آزمودہ لوگوں کو پسند کرتے ہیں، اسی طرح صورت ولباس میں ان کے عادات واطوار کو جیسے عمامہ باندھنے، قبا پہننے اور جوتا استعمال کرنے نیز نشست و برخاست، گفت وشنید اور سواری میں ان کے طرز زندگی کو تہہ دل سے پسند کرتے ہیں اور ہر وہ چیز جس کا تعلق جنگ سے ہو قبولیت و پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور ہر اس قصے کو جو حرب اور اہل حرب کی کہانیوں پر مشتمل ہو قبولیت کے کان سے سنتے ہیں۔

غرض وہ امور جو جنگ سے متعلق ہوں ان کے دل میں گھر کر جاتے ہیں اور انھیں جنگجو افراد سے طبعی تعلق ہو جاتا ہے، اور ان کے برعکس لوگوں اور ان کے برخلاف امور سے طبعی نفرت ہو جاتی ہے؛ لہٰذا وہ لوگ عورتوں، ہیجڑوں اور اس طرح کے بزدل و کمزور دل والوں کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے اور صورت ولباس میں ان کی مشابہت سے نفرت کرتے ہیں اور جس کاریگری کا جنگ سے ادنیٰ تعلق ہوتا ہے اس کو تھوڑی توجہ سے کمال تک پہنچا دیتے ہیں اور جو فن اس سے متعلق نہیں ہوتا ہے، اگرچہ انھوں نے اس کے حاصل کرنے کے راستے میں بڑی مشقتیں اٹھائی ہوں، لیکن وہ فن ان کے دماغ میں مستحکم نہیں ہوتا ہے اور دل اس سے دوری اختیار کر لیتا ہے۔

اور جب تک انھیں آلات حرب میسر نہ ہوں اور مشفق استاد ان کو قوانین جنگ کی تعلیم نہ دے اور وہ معرکہ ہائے کارزار میں شریک نہ ہوں، تب تک وہ تنگ دل اور پراگندہ خیال ہو کر اپنی زندگی کو نہایت بے چینی میں گزارتے ہیں، اور جوں ہی یہ باتیں انھیں حاصل ہوتی ہیں از خود بے قراری واضطراب اور غم واندوہ ان سے زائل ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا ایسے لوگ دلیری کی حقیقت اپنی فطرت کے خزانے میں پوشیدہ رکھتے ہیں اور صرف بہادری کی صورتوں کی تحصیل کے لیے اسباب جنگ کی دستیابی، اساتذۂ فن کی تعلیم اور میدان جنگ میں

حاضری کے محتاج ہوتے ہیں۔ اور مزید غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان کے دل میں شجاعت کے قالبوں کے حصول کا شوق کسی شخص کی تقلید یا تعلیم کے ذریعے سے پیدا نہیں ہوا، بلکہ اس کا پیدا ہونا بھی اضطراری امور کے پیدا ہونے کی قبیل سے ہے، اس لیے کہ وہ اپنے دل میں بہادری کا جوش رکھتے ہیں اور اس کو پایۂ تکمیل تک پہنچانا بجز ان تصور میں آنے والی صورتوں کے حصول کے، ممکن نہیں، اور ان صورتوں کا حصول سوائے آلات جنگ کی مشق اور اس فن کے استادوں کے ساتھ نشست و برخاست اور معرکوں میں حاضر ہونے کے ناممکن ہے۔ پس وہ مجبوراً خود بخود ہتھیاروں کی طلب، اساتذہ کی تلاش اور میدان جنگ کی چھان بین کریں گے، بعد ازاں ان کی قلبی صلاحیت انتہائی آب و تاب کے ساتھ ظاہر ہوگی کہ ان کے ہم عمروں و ہم جولیوں میں سے کوئی بھی ان سے لڑائی و مقابلہ آرائی میں برابری نہ کر سکے گا۔

بعض دوسرے لوگ دلیری کی مخالف باتوں سے، استعداد کی پاکی اور لوح فطرت کی صفائی پر پیدا ہوتے ہیں، لہٰذا اگر ان حضرات کو مشفق مربی مل جائے تو وہ قوت و تربیت، استاد کی تعلیم اور زمانے کی موافقت کے بقدر جنگ سے متعلق امور سے اپنا حصہ لے لیں گے اور استاد محترم کا کمال، انعکاس کے طور پر ان میں جلوہ گر ہوگا۔

اور دوسرا آدمی جو عورتوں اور ہیجڑوں جیسی فطرت پر پیدا ہوا ہو، اگر فن حرب کے ہزار اساتذہ بھی طرح طرح کی تربیت و تادیب کے ساتھ اس کو جنگ کی تعلیم دیں تو وہ ہرگز کبھی بھی جنگ و جدال کے قابل نہیں ہوگا اور پورے شاہنامہ سے بجز اس شعر کے کچھ بھی یاد نہیں کر پائے گا۔ ؎

منیزہ منم دخت افراسیاب　　　برہنہ تنم را ندید آفتاب (۵۴)

اسی طرح سے لوگ فیض ربّانی و نور یزدانی کے اعتبار سے (جس کو شرع رحمانی کہتے ہیں) تین طبقوں میں بٹے ہوئے ہیں، اس کی حقیقت عموماً افراد انسانی کی ان کی نوعیت کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ کے قرب اور اس کی رضا حاصل کرنے کے راستے کی طرف رہنمائی کرنا ہے،

نیز لوگوں کو دنیا و آخرت میں نقصان پہنچانے والے عقائد اور افعال واخلاق سے پرہیز کا حکم دینا اور گھر اور باہر کی سیاست میں صالح نظام قائم کرنے کی ہدایت کرنا ہے، اس سے زیادہ کچھ نہیں۔

لہٰذا جو لوگ طبقہ اولیٰ میں شامل ہیں ہم ان کی فطری اجمالی کمال کو ایمان حقیقی کا لقب دیتے ہیں اور جب وہ فطری اجمالی کمال نبی وقت کے اتباع کی وجہ سے تفصیلی قوانین کے ساتھ واضح ہو جاتا ہے اور وہ باطنی صلاحیت ملت کا سانچہ اختیار کر لیتی ہے تو یہ ملت حقہ اس کے فطری چراغ پر جو صرف ازل میں عنایات ربانی کے تیل سے روشن ہوا تھا صاف وشفاف شیشے کی طرح چھا جاتا ہے اور اس کے بسیط نور کو اپنا جیسا بنا دیتا ہے اور عجیب وغریب چمک اس کو عطا کرتا ہے، پس فطری وشرعی روشنی کے اکٹھا ہونے کی وجہ سے شریعت مطہرہ جو اس صاحب کمال کے باطن سے خوب رونق پائی ہے، ستاروں کی طرح عالم ملک وملکوت کے ستارہ شناسوں کی نگاہ بصیرت کو خیرہ کر دیتی ہے، اور کمالات کے میدانوں کے شہسواروں اور احوال ومقامات کے دریاؤں کے پیراکوں کے نہاں خانے سے ”هُوَ سَيِّدُنَا وَاعْتَقَ سَيِّدَنَا“(۵۵) کی آواز سرزد ہونے لگتی ہے۔

اس قسم کے اہل کمال کو شریعت کی زبان میں ”صدّیقین“ کہتے ہیں، اہل ذہانت وفطانت پر جو ذہن کی لطافت اور طبیعت کی صفائی کے باعث اس کلام کے مغز اور اس مقام کے خلاصے تک رسائی حاصل کر چکے ہوں، مخفی نہیں ہوگا کہ صدیق ایک طرح سے انبیاء کا پیروکار ہوتا ہے اور ایک طرح سے شریعتوں میں تحقیق کرنے والا ہوتا ہے، لہٰذا اگر صدیق صاف وستھرے دل والا ہے تو مخصوص اقوال افعال میں اللہ تعالیٰ کی خوشنودی وناراضگی اور خاص عقائد میں صحت وبطلان اور ذاتی اخلاق وعادات میں اچھائی وبرائی کو نیز صلاح وفساد کو اور واقعات وجزئی معاملات میں ضروری ودرست نظام کو اپنی فطری روشنی سے معلوم کر لیتا ہے۔

مثلاً وہ اپنے دل کی گواہی سے جان لیتا ہے کہ فلاں مخصوص قول یا مخصوص فعل اللہ تعالیٰ کو پسند ہے یا ناپسند، اور فلاں خاص عقیدہ حق ہے یا باطل، اور فلاں مخصوص عادت اچھی

ہے یا بری، اور فلاں خاص معاملہ جو گھر والوں یا شہر والوں کے درمیان واقع ہے یا فلاں مخصوص رسم جو فلاں قوم میں رواج پذیر ہے وہ اسلام کے کامل نظام کے موافق ہے یا مخالف۔ پس ان ذکر کردہ امور کے احکام اس کو دو ذرائع سے معلوم ہوتے ہیں۔

۱۔خصوصاً وہ اپنے دل کی شہادت سے معلوم کرتا ہے۔

۲۔عموماً شریعت کی کلیات میں اس کے اندراج کی وجہ سے جانتا ہے، اور جو علم پہلے ذریعے سے حاصل ہو وہ تحقیقی ہے اور جو دوسرے ذریعے سے حاصل ہو وہ تقلیدی ہے۔

اور اگر صدیق زکیّ العقل ہے تو شریعت کی کلیات کی طرف اس کی فطری روشنی کی رہنمائی کی جاتی ہے جو حظیرۃ القدس میں بنی نوع انسان کی تربیت کے لیے مقرر ہوئی ہیں۔ وہ کلیات اس کے ذہن میں ہمیشہ محفوظ رہتی ہیں اور وہ ان کلیات سے جزئیات کا استنباط کرتا ہے، لہٰذا علوم کلیہ شرعیہ اس کو دو راستوں سے حاصل ہوتے ہیں۔

۱۔فطری راستے سے۔ ۲۔انبیاء علیہم الصلاۃ والسلام کے واسطے سے۔

مثلاً وہ اپنے دل کی گواہی کی روشنی سے جانتا ہے کہ جو فعل ایسا ہو اور فلاں چیز پر مرتب ہو اور اس سے فلاں نتیجہ حاصل ہو وہ کام اللہ کو پسند ہے یا ناپسند۔

اور جو عقیدہ فلاں حقائق سے متعلق ہو، یا اللہ تعالیٰ کے فلاں اسماء وصفات کو بیان کرتا ہو، یا فلاں واقعات پر دلالت کرتا ہو اور فلاں طریقے سے حاصل ہوا ہو، تو وہ عقیدہ درست ہے اور وہ دنیوی یا اخروی لحاظ سے افراد انسانی کی تربیت میں دخل رکھتا ہے۔

اور جو عقیدہ فلاں امور سے متعلق ہے، یا فلاں اسماء وصفات یا فلاں واقعات سے متعلق ہے، یا فلاں راستے سے ماخوذ ہے تو وہ عقیدہ باطل ہے، یا دنیا وآخرت کے لحاظ سے بنی نوع انسان کی تربیت میں اس کا کوئی رول نہیں ہے اور اس کا سیکھنا سکھانا فضول معلوم ہوتا ہے۔

اور جس خُلق وعادت کا نتیجہ فلاں ہو اور اس کو حاصل کرنے میں فلاں فلاں امور کی ضرورت پڑتی ہو تو وہ اچھا ہے ورنہ برا، اور جو معاملہ، رسم اور سیاست فلاں فلاں مصالح

کے باعث ہوں تو مقبول اور کامل ترین نظام کے موافق ہیں، ورنہ رد کردینے کے قابل اور نظام کے مخالف ہیں۔ لہٰذا کلیات شریعت اور احکام دین میں اس کو انبیاء علیہم السلام کا شاگرد بھی کہہ سکتے ہیں اور ہم استاذ بھی۔

نیز اس کے حاصل کرنے کا طریقہ بھی وحی کے شعبوں میں سے ایک شعبہ ہے جس کو عرف میں "نفث فی الروع" سے تعبیر کرتے ہیں اور بعض اہل کمال اس کو وحی باطن سے نامزد کرتے ہیں۔ پس ان بزرگوں اور انبیاء کرام علیہم الصلاۃ والسلام کے درمیان فرق صرف اتنا ہے کہ یہ حکم کے گمان اور صورت کو قائم کرتے ہیں اور وہ قوموں کی طرف مبعوث ہوتے ہیں، اور انبیاء کرام کے ساتھ ان کی وہی نسبت ہے جو چھوٹے بھائیوں کو بڑے بھائیوں سے اور بڑے بیٹوں کو اپنے باپ سے ہوا کرتی ہے کہ ان کے درمیان ایک طرح سے بنوت کا علاقہ ہے اور ایک طرح سے اخوت کا تعلق ہے۔ اور یہ اشخاص، انبیاء کی خلافت کے سب سے زیادہ حقدار ہوتے ہیں گو کہ ظاہری تسلط انھیں نصیب نہ ہو اور گو کہ ملت کے جہلاء ان کی حکومت کو تسلیم نہ کریں، اسی بات کو ''امامت وصیت'' سے تعبیر کرتے ہیں اور ان کے علوم کو جو کہ بعینہ انبیاء کا علم ہے لیکن وہ وحی ظاہری سے حاصل نہیں ہوا ہے، ''حکمت'' کا نام دیتے ہیں۔ اور وہ مخصوص عنایت وولایت جو انبیاء کرام کو میسر ہوئی اور اس کی وجہ سے انھیں اپنے ہم عصروں میں امتیاز حاصل ہوا، مندرجہ ذیل آیات کریمہ اس امر کی وضاحت کرتی ہیں، "اَللّٰہُ یَصۡطَفِیۡ مِنَ الۡمَلٰٓئِکَۃِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ" (۵۶) "اِنَّ اللّٰہَ اصۡطَفٰۤی اٰدَمَ وَنُوۡحًا وَّاٰلَ اِبۡرٰہِیۡمَ وَاٰلَ عِمۡرٰنَ عَلَی الۡعٰلَمِیۡنَ" (۵۷) "وَ کُلًّا فَضَّلۡنَا عَلَی الۡعٰلَمِیۡنَ وَمِنۡ اٰبَآئِہِمۡ وَذُرِّیّٰتِہِمۡ وَاِخۡوَانِہِمۡ وَاجۡتَبَیۡنٰہُمۡ وَہَدَیۡنٰہُمۡ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ" (۵۸) اور "وَاذۡکُرۡ عِبٰدَنَاۤ اِبۡرٰہِیۡمَ وَاِسۡحٰقَ وَیَعۡقُوۡبَ اُولِی الۡاَیۡدِیۡ وَالۡاَبۡصَارِ، اِنَّاۤ اَخۡلَصۡنٰہُمۡ بِخَالِصَۃٍ ذِکۡرَی الدَّارِ، وَاِنَّہُمۡ عِنۡدَنَا لَمِنَ الۡمُصۡطَفَیۡنَ الۡاَخۡیَارِ" (۵۹) اسی انتخاب کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی

خوشنودی ان کی خوشنودی پر موقوف ہوئی اور اللہ تعالیٰ کی پیروی ان کی پیروی میں منحصر ہوئی اور اللہ تعالیٰ کی ناراضگی ان کی ناراضگی کے ساتھ وابستہ ہوئی، اس عنایت وولایت کا نمونہ اور اس عزت وشرف کا پرتو ان حکمائے ربانیین اور وارثین انبیاء ومرسلین کو بھی نصیب ہوتا ہے جس کو صوفیہ کی اصطلاح میں ''وجاہت'' کہتے ہیں اور عقل کی ذکاوت سے ملی ہوئی صدیقیت کو جس کے لوازم میں سے حکمت ووجاہت ہے، سیّد الحکماء وسید العلماء یعنی حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ ''قرب الوجوذ'' سے تعبیر فرماتے ہیں۔

یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ ''قرب الوجوذ'' محض وہبی اور فطری چیز ہے، اس کا کسب واکتساب اور حدوث وتجدد سے کوئی تعلق نہیں ہے؛ البتہ اس فطری روشنی کی علامتوں کا ظہور اس کے اسباب ومؤیدات کے پائے جانے کے وقت رفتہ رفتہ ہوتا ہے، جیسا کہ انسان کی انسانیت محض پیدایشی چیز ہے، لیکن جو چیز اس کو تمام حیوانوں سے ممتاز کرتی ہے وہ قوت عاقلہ ہے جو ابتدائے آفرینش میں چھپی رہتی ہے، اسی لیے چھوٹے بچے اور جانور میں کوئی فرق معلوم نہیں ہوتا ہے، بلکہ چھوٹا بچہ احساس کے معاملے میں جانور سے بھی زیادہ کمزور ہوتا ہے اور کچھ عرصہ گزرنے کے بعد اس امر مخفی یعنی عقل وسمجھ کی قوت کا اثر علوم وادراکات کا سامنا ہونے کی وجہ سے معرض وجود میں آتا ہے، اور جیسا کہ شروع کلام میں مذکور ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی وہ مخصوص عنایت جو ازل میں اس صاحب کمال کی طرف مبذول ہوئی وہ ہر وقت اور ہر مرتبہ اس کو جدید شفقت اور تازہ تربیت کے ساتھ اچھے اعمال، صحیح عقائد، پسندیدہ اخلاق اور درست امور کی طرف کشاں کشاں لے جاتی ہے اور اس کو برے کاموں، باطل عقیدوں، خراب عادتوں اور غیر شرعی معاملات سے مختلف واقعات اور گوناگوں تصرفات کے ذریعے محفوظ رکھتی ہے تو گویا وہ انبیاء علیہم السلام کی حفاظت جیسی حفاظت سے جس کو عصمت کہتے ہیں، نوازا جاتا ہے!

اس کی توضیح یہ ہے کہ جیسے بعض اشخاص کو بعض عوارض قلبیہ میں جیسے کسی دوشیزہ

سے عشق یا ہنر وکمال کی طلب یا جاہ ومال کی جستجو میں ایسا استغراق وانہماک ہو جاتا ہے کہ اس استغراق کی وجہ سے اس کے قوائے بہیمیہ میں سستی وخلل واقع ہو جاتا ہے اور وہ اس اضمحلال کی وجہ سے عرفی وشرعی برائیوں کی طرف تہہ دل سے متوجہ نہیں ہوتا ہے اور ان قباحتوں کے ارتکاب کا ارادہ اس کے دل میں پختہ نہیں ہوتا ہے۔

اور بعض دوسرے اشخاص جو عقل کی تیزی، طبعی نزاکت اور فطری پاکیزگی پر پیدا ہوئے ہیں اور مشفق والدین اور اساتذہ کی تربیت سے آراستہ ہوئے ہیں، ان کا ان بیان کردہ قباحتوں سے پرہیز کرنا عقل کی ذکاوت اور طبیعت کی نزاکت کی بنا پر ہوگا اور ان برائیوں کی نسبت نفرت ان کی عقل سے رونما ہوگی جیسے کہ پاکیزہ طبیعت کا آدمی نجاستوں اور آلودگیوں سے گھن کرتا ہے، اور اگر کبھی ان کی طرف سے قبائح مذکورہ کی رغبت ومیلان واقع ہوگا تو بالضرور وہ مشفق مربی ہزار تدبیر سے اس کو ان ناپاکیوں میں ملوث ہونے اور ان آلودگیوں سے آلودہ ہونے سے روکے گا، اسی طرح بعض اہل کمال عشق الٰہی کے غلبے، حضرت ذوالجلال کے مشاہدے میں استغراق، مقامِ فنا وبقا، معرفت وآگہی اور حقائق اشیاء کے انکشاف میں انہماک کی وجہ سے مختلف ارادوں کے فنا ہونے اور متفرق عزائم کے مٹنے کے مقام پر فائز ہوتے ہیں، اور اسی فنائے عزم وارادہ کی بنا پر وہ غیر مشروع کاموں باطل عقیدوں، بری عادتوں اور خراب معاملات سے محفوظ رہتے ہیں اور یہ حفاظت ارباب قرب النوافل کا حصہ ہے۔

اور بعض کاملین فطری نور اور ازلی عنایت کی وجہ سے بھلے اور برے میں فرق کر کے خود کو مذکورہ بالا برائیوں سے دور رکھتے ہیں اور اگر کبھی ان ذکر کردہ غیر شرعی امور کی طرف ان کے دل کا میلان ہوتا ہے تو ازلی عنایت ان کے ارادہ کے دامن کو پکڑ کر عجیب وغریب واقعات ومعاملات کے ذریعہ ان کو گناہوں کے ارتکاب سے باز رکھتی ہے، اور آیت "وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا لَوْ لَا اَنْ رَّاٰى بُرْهَانَ رَبِّهٖ، كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْءَ وَالْفَحْشَاءَ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ" (۶۰) اس خامہ فرسائی کی

توضیح ہے۔ یہ حفاظت انبیاء اور حکماء کا حصہ ہے اور اسی کو عصمت کہتے ہیں، تم یہ نہ سمجھنا کہ وحی باطن، حکمت وجاہت اور عصمت، غیر انبیاء کے لیے ثابت کرنا مخالف سنت اور بدعت ہے، اس لیے کہ اس طرح کی بہت سی حدیثیں رسول مقبول علیہ الصلاۃ والسلام کی صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے مناقب میں منقول ہیں جیسا کہ ماہر محدثین پر پوشیدہ نہیں۔

اور اگر طول کلام کی وجہ سے اکتاہٹ کا خوف نہ ہوتا تو ان احادیث میں سے چند حدیثیں یہاں پر ذکر کی جاتیں۔ اور تم یہ نہ خیال کرنا کہ ایسے اہل کمال دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں اور قرب الوجود صفحۂ ہستی سے مٹ چکا ہے، بلکہ جب تک رات و دن کی گردش رہے گی تب تک ایسے حال و مقام والے کا وجود مسعود رہے گا، البتہ صاحب کمال کے کمال پر علم قطعی کے حصول کی سبیل مخبر صادق صلی اللہ علیہ وسلم کے خبر دینے میں منحصر ہے جو زمانۂ نبوت کے گزر جانے کے بعد منقطع ہوگئی۔ جیسے کہ غیر منصوص مسائل میں شریعت کے حکموں میں سے کسی حکم پر قطعی علم کا حاصل ہونا ممکن نہیں، حالاں کہ استنباط کرنے والوں کے استنباط اور مجتہدین کے اجتہاد تابعینؒ اور تبع تابعینؒ کے عہد میں اس قدر رونما ہوئے کہ ان کا عشر عشیر بھی صحابہؓ کے زمانے میں وقوع پذیر نہیں ہوا تھا۔

اس مقام کے لوازمات میں سے اس صاحب کمال پر اللہ تعالیٰ کی غیرت ہے، جس کی تفصیل یہ ہے کہ جب اس ازلی مہربانی نے آغاز پیدائش میں بغیر کسی استحقاق اور اکتساب کے اور بغیر کسی واسطے اور حجاب کے اس صاحب کمال کو مقبول بندوں کے زمرے میں شامل کر دیا اور ہر وقت بغیر کسی واسطے کے اس مقبول بندے کی تربیت کی ذمہ دار ہوئی تو پھر اگر کبھی بتقاضاے بشریت غیر اللہ کی طرف اس کا دل متوجہ ہوتا ہے اور تہہ دل میں اس چیز سے تعلق ہو جاتا ہے یا وہ ان امور میں سے کسی امر کو جن کے پائے جانے کی وجہ سے اس کی جبلّی روشنی ظاہر ہوئی، اپنی تربیت کا واسطہ سمجھتا ہے تو وہی عنایت ازلیہ اس لگاؤ کو کسی نہ کسی تدبیر سے ختم کر دیتی ہے اور اس خیال کو پاش پاش کر دیتی ہے۔

اس مقام کی جملہ علامتوں میں سے نیک لوگوں کے دلوں میں قبولیت کا نزول ہے کہ حدیث "اِذَا اَحَبَّ اللّٰهُ عَبۡدًا نَادیٰ جِبۡرِیۡلَ اِنِّیۡ اُحِبُّهٗ فُلَانًا فَاَحِبَّهٗ فَیُحِبُّهٗ جِبۡرِیۡلُ ثُمَّ یُنَادِیۡ فِیۡ السَّمَاءِ اِلیٰ اَنۡ قَالَ حَتّٰی یُوۡضَعُ لَهُ الۡقُبُوۡلُ فِیۡ الۡاَرۡضِ" (۶۱) اس کلام کی طرف اشارہ ہے۔

اور اس مقبولیت کی حقیقت، اس صاحب کمال کی وجاہت کا عکس صاف ستھرے دلوں میں پڑنا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ جیسے انسان کے اعضا وجوارح ان کے قلوب کے آئینہ دار ہوتے ہیں اور جو پیش آمدہ چیز دل پر طاری ہوتی ہے مثلاً محبت، غصہ اور خوشی یقیناً اس پیش آنے والی چیز کے آثار اعضا پر ظاہر ہوتے ہیں، اسی طرح نیک لوگوں کے دل جو غفلت اور غیر اللہ کی طرف التفات کے زنگ سے صاف ہوتے ہیں، وہ حظیرۃ القدس کی نسبت آئینہ کا حکم رکھتے ہیں۔ مثلاً ایسی چیز جس کا وقوع حظیرۃ القدس میں طے شدہ ہوتا ہے اکثر نیک بخت لوگ اس کو واقع ہونے سے پہلے خواب یا کسی معاملہ میں دیکھ لیتے ہیں ورنہ کم از کم اس کے وقوع کی طرف رغبت یا اس کے اسباب کی جمع آوری کی طرف ہمت اپنے اندر پاتے ہیں۔ پس جب اس صاحب کمال نے اپنے محسن کے پاس عزت وشرف حاصل کرلیا ہے اور حظیرۃ القدس میں قدر ومنزلت پالی ہے اور رفیق اعلیٰ کے پاس مقام صدق پر فائز ہوگیا ہے تو بالضرور اس کی عزت وشرف کا پرتو بنی آدم کے صلحاء کے دلوں میں پڑے گا، لہٰذا جو نیک بندہ اس کو دیکھتا ہے یا اس کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا ہے یا اس کے حال وکمال پر مطلع ہوتا ہے وہ ضرور تہہ دل سے اس سے محبت کرتا ہے اور دل سے اس کے علوم ومعارف کو تسلیم کرتا ہے بلکہ ان کے وضع قطع پر فریفتہ ہوجاتا ہے گو کہ وہی طور طریق اس کے علاوہ میں بھی موجود ہوتا ہے، لیکن کوئی نیک بندہ اس کی طرف تھوڑا بھی توجہ نہیں کرتا ہے۔

تم یہ نہ سمجھنا کہ اس کلام کا مطلب یہ ہے کہ اس صاحب کمال سے تمام لوگ محبت کرتے ہیں کیوں کہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ "اِنَّهُمۡ شُهَدَاءُ اللّٰهِ عَلَی الۡاَرۡضِ" (۶۲)

اور یہ بالکل ظاہر ہے کہ اہل شہادت سے مراد عقلمند، عادل اور اہل مروّت ہیں نہ کہ غافل بے وقوف اور بے حیاو بدکار لوگ، بلکہ اگر تم خوب غور کرو گے تو سمجھ جاؤ کہ ایسے بزرگانِ دین کی محبت بذات خود محبت کرنے والے کے ایمان کی نشانی اور اس کی پرہیز گاری کی علامت ہے، آیت "ذٰلِكَ وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَائِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوىٰ الْقُلُوْبِ" (۶۳) اس امر کی طرف اشارہ کرتی ہے لہٰذا ایسے اللہ والوں سے نفرت وعداوت نفرت کرنے والے کے نفاق کی علامت اور اس کی بدبختی کی پہچان ہے، اور حدیث "لَا يُحِبُّهٗ إِلَّا مُؤْمِنٌ تَقِيٌّ وَلَا يُبْغِضُهٗ إِلَّا مُنَافِقٌ شَقِيٌّ" (۶۴) سے بھی اس بات کی طرف اشارہ ملتی ہے۔

## تیسرا افادہ: قرب الفرائض کا بیان

اور اس مقام سے اعلیٰ وارفع مقام شرعی حدود کو نافذ کرنے، مظانّ حکم کو ان کے حقائق کی جگہ پر رکھنے اور علی العموم نوع انسانی کی تربیت کے ارکان وآداب اور شروط ومفسدات کی تعیین میں اللہ تعالیٰ کی نیابت کا مقام ہے۔ یہ مقام درحقیقت اصحاب شریعت یعنی انبیاء ومرسلین کو حاصل ہوتا ہے اور ان کی متابعت سے ظلی طور پر یہ مقام انبیاء کے بعض بڑے پیرو کاروں کو بھی نصیب ہوتا ہے، جن کو صوفیہ کی اصطلاح میں ''مفہمین'' کہتے ہیں اور اس مقام کو رہبر اہل علم ودانش حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہٗ کی اصطلاح میں ''قرب الفرائض'' سے تعبیر کرتے ہیں۔

## چوتھا افادہ: قرب الملکوت کا بیان

اور اس مقام سے بھی بلند وبرتر مقام غافلوں کو بیدار کرنے، جاہلوں کے عذر دور کرنے اور اہل کفر وعناد پر صرف دلیل وبرہان یا (بوقت ضرورت) تیر وتلوار سے حجت تمام کرنے میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی قائم مقامی کا درجہ ہے، جن کے بابرکت وجود سے "قُلْ فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ" (۶۵) کا مضمون ثابت ہوتا ہے۔ اور یہ مقام دراصل اولوالعزم انبیا کا مقام ہے، لیکن طاقت والے اور بصیرت والے انبیا کی متابعت کے نتیجے میں بعض

اکابرین اس مقام بلند کے سائے اور اس سرمایۂ افتخار کے پرتو سے بہرہ ور ہوتے ہیں۔ ان کو اہل تصوف کی اصطلاح میں ''حجج اللہ'' کہتے ہیں اور حضرت شاہ صاحبؒ کی اصطلاح میں ان کو ''قرب ملکوت'' سے نامزد کرتے ہیں۔

## پانچواں افادہ: مقام فردانیت کا بیان

اور اس مقام سے بھی اعلیٰ وافضل مقام زمانوں اور طریقوں کی صدارت کا مقام ہے، اس کی توضیح یہ ہے کہ جس طرح سے کسی دور میں انسانیت کی پرورش، معاش کے معاملے میں اللہ تعالیٰ کے فیض سے کسی صورت میں ظاہر ہوتی ہے اور وہ عنایت الٰہی جو عموماً افراد انسانی کی طرف مبذول ہے، اس شکل میں ظاہر ہوتی ہے، اور جو صاحب کمال نوع انسانی کی پرورش میں اللہ تعالیٰ کا قائم مقام ہوتا ہے وہ اس صورت کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے خوب جدوجہد کرتا ہے اور جب وہ صورت اپنی انتہا کو پہنچ جاتی ہے تو نئی مہربانی اور تازہ عنایت، ابدی رحمت کے دریا سے جاری ہوتی ہے اور معاشی لحاظ سے تربیت کی دوسری صورت سامنے لاتی ہے اور اس طریقہ کو جاری کرنے میں اولاد آدمؑ کے نفوس کاملہ کو متوجہ کرتی ہے کہ آیت کریمہ ''یُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَاءِ اِلَى الْاَرْضِ ثُمَّ یَعْرُجُ اِلَیْهِ فِیْ یَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ'' (۶۶) میں اسی راز کا انکشاف ہے۔

مثلاً حضرت آدم صفی اللہ علیہ الصلاۃ والسلام سے لے کر حضرت ادریس علیہ الصلاۃ والسلام تک انسانوں کی رہنمائی کے سلسلے میں فیض ربّانی، اسباب زندگی کی بنیاد کی طرف مثلاً، زراعت، کاشتکاری، آٹا پسائی، گوندھائی اور ہر طرح کا کھانا پکانے، پوشاک بنانے اور مکانات تعمیر کرنے کی طرف متوجہ تھی۔

جب یہ پرورش اپنی حد کو پہنچ گئی تو حضرت ادریس علیہ السلام کے زمانے سے دقیق فنون اور عمیق علوم جیسے سلائی، لکھائی، آہن گری اور رنگریزی جیسی لطیف کاریگری اور اجسام سفلیہ اور اجرام علویہ کی خاصیتوں پر اطلاع جو کہ طب اور نجوم کا حاصل ہے، منصۂ شہود پر آئیں۔

اور ذوالقرنین اوّل کے عہد سے سلطنت وحکومت کی عمارت کی پہلی اینٹ رکھی گئی، حکومت وعدالت کے قوانین وضع کیے گئے اور فوجوں ولشکروں کی جمع آوری کا کام عمل میں آیا۔

اسی طرح آخرت کے تعلق سے بھی بنی نوع انسان کی تربیت میں زمانے اور طریقے بدلتے رہتے ہیں اور اہل کمال حضرات جس دور میں کمال حاصل کرتے ہیں اس دور کے مناسب علوم ان کے دلوں میں ڈال دیے جاتے ہیں اور ان کو ان علوم کی تکمیل کا خادم بنایا جاتا ہے، پھر جب وہ تربیت مکمل ہو جاتی ہے تو دوسری تربیت کی بنیاد رکھی جاتی ہے اور ایک نئی ہدایت کی بنیاد کو مضبوط کیا جاتا ہے۔ مثلاً اس امت کا پہلا دور فقہاء کا دور تھا، اس کے بعد متکلمین کا دور آیا، اس کے بعد صوفیہ کا دور آیا اور یہ برائے تمثیل ذکر کیا گیا ہے نہ کہ حصر کے طور پر۔

غرض جب ایک دور ختم ہوتا ہے تو دوسرے دور کا آغاز ہوتا ہے اور ایک ایسے شخص کا جو لوگوں میں سب سے زیادہ کامل اور فیض رحمانی کا سب سے زیادہ مستحق ہوتا ہے، اس زمانے میں صدور ہوتا ہے اور اس کے وجود کی برکت سے سابقہ دور کی رہنمائی کو انتہا تک پہنچایا جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس کو اپنا ترجمان بنا کر اس کی زبان مبارک سے اپنے بندوں کو تازہ الطاف وعنایات کی طرف بلاتا ہے اور اس کو اس دور کی امامت بخشی جاتی ہے اور یہ مقام دراصل حضرت خاتم النبوت وفاتح الولایت علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کی برکت سے اس مقام کا نمونہ آپ ﷺ کے بعض متبعین کو بھی عطا کیا جاتا ہے، جنھیں ''فاتحین وخاتمین'' کا لقب دیا جاتا ہے یعنی اس شخص کے وجود کی برکت سے پہلے دور کا اختتام ہوتا اور دوسرے دور کا آغاز ہوتا ہے اور اس مقام کو حضرت شاہ صاحبؒ کی اصطلاح میں ''مقام فردانیت'' کہتے ہیں۔

اور تمام اہل کمال جو اس دور میں موجود ہوتے ہیں وہ درحقیقت اس دور کے امام کے پیروکار ہوتے ہیں، اگرچہ وہ اس امام کو جانیں یا نہ جانیں اور اس امام دوراں کے اتباع کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ اہل کمال حضرات اس امام کی تقلید کرتے ہیں یا ان کی اصلاح

وتربیت کا سلسلہ اس تک پہنچتا ہے بلکہ اتباع کا مطلب یہاں پر یہ ہے کہ وہ حضرات اس شان الٰہی کی خدمت میں جو اس عہد میں ظاہر ہوئی ہے، دل وجان سے کوشش کرتے ہیں اور اس شان عالی کے مناسب تمام علوم جو اوّلاً اس امام کے دل میں ڈالے گئے تھے، ثانیاً وہ علوم، مخزن غیب اور پردۂ لاریب سے ان اکابرین کے قلوب میں بھی القا کیے جاتے ہیں اور جس طرح ان علوم کی نشر واشاعت کا عزم وارادہ سب سے پہلے اس امام کے دل میں پیدا ہوا تھا اسی طرح وہ ہی ارادہ ان بزرگوں کے دلوں میں بھی انگڑائی لیتا ہے۔

## فائدہ:۱۔ بعض مہتم بالشان چیزوں کے انبیاے عظام علیہم الصلاۃ والسلام کے ساتھ خاص ہونے کا بیان

چوں کہ یہ مقامات ثلاثہ حقیقی طور پر انبیاء کے لیے تسلیم کیے گئے ہیں اور ان کے علاوہ دوسروں کو بجز ان کمالات کے سایے اور ان مقالات کے نمونے کے کچھ حاصل نہیں، باوجود یہ کہ ایسے بزرگوار جو ان بلند مناصب پر فائز ہوتے ہیں کبریت احمر (٦٧) اور اکسیر اعظم (٦٨) کی طرح نادرالوقوع اور کمیاب ہیں۔ اسی لیے ان تینوں مقامات کے مباحث میں اجمالی اشارہ پر اکتفا کیا گیا ہے اور اس کی تفصیل کو دوسرے مقام کے حوالے کر دیا گیا ہے، نیز ان مقامات کی حقیقت تک رسائی حاصل کرنا، بلکہ تمام کمالات کی تحقیق کرنا، اِن قابل فخر باتوں اور خوبیوں کے حصول کے بغیر نہیں ہوسکتا، لہٰذا ان مخفی بھیدوں کے ظاہر کرنے میں کوشش کرنا اور تکلیف اٹھانا لاحاصل اور بے فائدہ معلوم ہوتا ہے۔

در نیابد حال پختہ ہیچ خام ‏ ‏ ‏ ‏ پس سخن کوتاہ باید والسلام (٦٩)

البتہ اس قدر سمجھنا چاہیے کہ حب ایمانی حیرت انگیز ثمرات اور عجیب وغریب نتائج سامنے لاتی ہے جس کا بیج حق تعالیٰ کی عنایت ومہربانی اور اس کا انتخاب ہے اور جواد مطلق کی عنایت واجتبا کی کوئی حد نہیں۔

داغ غلامیت کرد پایۂ خسرو بلند ‏ ‏ ‏ ‏ صدر ولایت بند کہ سلطان خرید (٧٠)

## فائدہ:۲۔راہِ ولایت اور راہِ نبوت کے درمیان دوری نہ ہونے کا بیان

تم یہ نہ سمجھنا کہ راہِ ولایت اور راہِ نبوت کے درمیان دوری ہے، یہاں تک کہ راہِ ولایت طے کرنے والے ہرگز مقامات راہِ نبوت پر فائز نہیں ہوسکتے یا طالبان راہِ نبوت حالاتِ ولایت کے حامل نہیں ہوسکتے یا ارباب حب عشقی حب ایمانی سے خالی ہوتے ہیں اور اصحاب حب ایمانی احوال عشقیہ سے غافل ہوتے ہیں، ہرگز نہیں اس لیے کہ کتاب ''فتوح الغیب'' جو پیشوائے اولیاء اور قدوۂ اصحاب فنا و بقا، صاحب مناقب و مفاخر شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ (۱۷) کی کتاب ہے تم نے اس کو دیکھا ہوگا کہ وہ شروع سے آخر تک فنائے ارادی جو حب ایمانی کا مغز ہے، اس سے پُر ہے۔ اور سلسلۂ وحی بند ہونے کے زمانے میں اس بے چینی و پریشانی اور قلق و اضطراب کی حکایتیں تم نے سنی ہوں گی جو حضرت سید الانبیاء والمرسلین علیہ افضل الصلاۃ والتسلیم کے مبارک دل پر گزرا کرتی تھیں، اور وہ عجز و نیاز اور بے پروائی و ناز کے معاملے جو درمیان میں گزرے، لیلیٰ اور مجنون کی داستانوں کے لیے قابل رشک ہیں، بلکہ حب ایمانی کا بیج اور اس پائیدار سعادت کا نور، ایمان کے ارکان اور اسلام کے شرائط میں سے ہے؛ لہٰذا حب ایمانی کو مقبول طریقوں کے سلوک میں تیز رفتار گھوڑے کی طرح سمجھنا چاہیے اور حب عشقی کو اس راستے کے جنگل یا سرائے کے درجے میں رکھنا چاہیے۔

بہرکیف حب ایمانی طریق رحمانی کے سالک کی جان کا پیوند ہے اور حب عشقی حالات و واردات کی قبیل سے ہے؛ البتہ بعض نفوس میں طبعی مناسبت کی وجہ سے حب عشقی خوب اثر کرتی ہے اور رفتہ رفتہ کھینچ کر راہِ ولایت میں لے جاتی ہے اور حب ایمانی حب عشقی کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے، اور بعض نفوس میں عشق کے جوش فرو ہونے کے بعد صرف حب ایمانی ہی باقی رہ جاتی ہے اور طریق راہِ نبوت کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ خلاصۂ کلام یہ کہ حب ایمانی کو عمارت سلوک کی بنیاد بلکہ لکڑی، مٹی اور پتھر کے مانند جو کہ مادّۂ عمارت ہے سمجھنا چاہیے اور حب عشقی اور اس کے ثمرات کو اصل عمارت تعمیر ہونے کے بعد جلد زائل

ہونے والے خوش رنگ بیل بوٹے اور دلکش نقش ونگار کے مانند تصور کرنا چاہیے۔ اسی بنا پر چوں کہ انبیاء علیہم الصلوات والتسلیمات عام طور پر ہدایت کی بنیاد کے استحکام اور تربیت انسانی کی عمارت کی تعمیر کے واسطے مبعوث ہوئے ہیں، اس لیے انھوں نے اسی محبت اور اس کے ثمرات کی دعوت دی اور اس راستے کے حاصل کرنے کے طریقے کو مضبوط اور واضح کیا اور حب ایمانی کے طریقوں کی وضاحت پر اکتفا کیا، اور حب عشقی اور اس کے نتائج کے بیان اور اس کے حاصل کرنے کے طریقے کی طرف بجز باریک ودقیق اشارات کے کچھ توجہ نہیں فرمائی۔

جب اصحاب طریقت میں سے اولیائے کبار نے جو فن شریعت میں باطنی امامت کا درجہ حاصل کر چکے تھے اور دل کی اصلاح کے قواعد میں جو کہ دین متین کا مغز ہے، اجتہاد کا درجہ پا چکے تھے، اور جب انھوں نے ایمانی محبت کو متواترات دینیہ سے جانا اور اس کے حاصل کرنے کے طریقوں کو اکثر مسلمانوں میں مضبوط پایا، یہاں تک کہ ہر ایک مسلمان جو ان کے بابرکت زمانے میں تھا، وہ اللہ تعالیٰ کی فرماں برداری، اس کے احکام کی تعمیل، شریعت اسلامیہ کو اختیار کرنے اور دین محمدی سے بہر صورت قطعی وابستگی کو اپنے اوپر فرض سمجھتا تھا اور محسن کے شکر ومحبت کی اچھائی اور محسن کی ناشکری ومخالفت کی برائی کو قطعی باتوں میں سے جانتا تھا، تو انھوں نے حب ایمانی اور اس کے متعلقات کو مکمل سمجھ کر اور اپنے پیروکاروں کے اذہان میں اس کو پختہ اور مسلم الثبوت جان کر اپنا رُخ حب عشقی کے احکام کی تفصیل، اس کے ثمرات کی توضیح اور اس کے حاصل کرنے کے طریقوں کے ضبط وترتیب کی طرف کیا، اور اس کام میں بڑی جدوجہد کی اور مسلمانوں کی ایک بڑی جماعت کو نفع عظیم پہنچایا اور اس سبب سے انھوں نے پروردگار عالم کی بارگاہ میں بڑی عزت پائی "شکر اللّٰہ مساعیھم ورفع درجاتھم فی اعلیٰ علیین" پھر ان بزرگوں کی رحلت کی کچھ مدت بعد جاہلوں اور بے وقوفوں کی ایک ٹولی نمودار ہوئی اور آیت "فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوۃَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوَاتِ" (۷۲) ان کے بدانجام حال پر فٹ ہے، وہ لوگ حب ایمانی کی

تحصیل کے طریقوں کو برباد کر کے حب عشق اور اس کے نتائج حاصل کرنے کے پیچھے پڑ گئے، حالاں کہ یہ محض باطل خیال اور محال کی طلب ہے اس لیے کہ حدیث میں آیا ہے "اٰمِنْ ثُمَّ جَاهِدْ" (۷۳) اور "ثَبِّتِ الْعَرْشَ ثُمَّ انْقُشْ" (پہلے تخت تیار کر لے پھر اس کی نقش نگاری کے درپے ہو) ایک مشہور مثل ہے۔ ایک جلیل القدر عارف باللہ شیخ ابوسعید ابوالخیرؒ (۷۴) اس بدانجام گروہ کی حالت کی خبر دیتے ہوئے کہتے ہیں۔

تقلید دو سہ مقلد بے معنی — بدنام کند رہ جواں مردان را (۷۵)

اس مطلب کو واضح مثال کے ساتھ لوگوں کے سامنے رکھنا چاہیے مثلاً اللہ تعالیٰ کی جو فیض وعنایت ازل الآزال میں افراد انسانی کی طرف متوجہ ہوئی تھی، وہ ایک وقت ایسا تقاضا کرتی ہے کہ عقائد، احکام، معاملات اور سیاسیات میں سے کچھ حصے جو لوگوں کی ہدایت، دنیوی اور دینی نقصانات سے ان کی نجات اور برزخ وحشر کی آفتوں سے ان کی خلاصی میں قوی دخل اور بڑی تاثیر رکھتے ہیں، معجز عربی زبان میں انھیں تعلیم کی جائے اور اس کی شرح افصح العرب والعجم کی زبان مبارک سے بالتفصیل کی جائے، لہٰذا اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس معجز عربی کلام کو شرح وبسط کے ساتھ تمام حاضرین تک پہنچا دیا، پس اس فیض قدسی کی تکمیل جو غیب الغیب سے نازل ہوا ہے، دو وجہ سے ہو سکتی ہے:

ایک تو یہ کہ وہ باتیں جو دنیوی اور اخروی لحاظ سے انسانیت کی اصلاح میں اثر رکھتی ہیں اور اس کی نجات و رفع درجات میں ان کا دخل ہے، ان باتوں کے حاصل کرنے کا ارادہ کر کے قرآن وحدیث کی طرف متوجہ ہو اور عقائد صحیحہ کی تصدیق، احکام دینیہ کی تعمیل، اخلاق حسنہ کی تحصیل اور معاملات سیاسیہ کی تنفیذ میں خوب جدوجہد کرے اور ان امور کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دے، اور یہی صورت کتاب وسنت سے شارع کا مقصود ہے اور یہی ہدایت کی بنیاد اور سعادت کی کلید ہے اور شارع علیہ الصلاۃ والسلام نے اس کو وضاحت کے ساتھ مفصل بیان فرمایا۔ اور اس کی بنیادی باتوں اور اس

کے حاصل کرنے کے طریقوں کو پوری توجہ سے واضح فرمایا۔

دوسری صورت کلام اللہ کے وجوہِ بلاغت کا علم، عقائد حقہ کے دلائل سے واقفیت اور احکام منصوصہ کے حِکَم، اخلاق حمیدہ سے آراستگی کے طریقے اور سیاسی معاملات کی منفعتوں پر اطلاع کو اپنا مطمح نظر بنا کر اور اس کو اپنا مقصود زندگی قرار دے کر کتاب وسنت میں غور وخوض کرے، یہ صورت حقیقی لحاظ سے شارع کا مقصود نہیں ہے، اسی لیے اس نے اس کی صراحت نہیں فرمائی اور اس کے مبادی اور اس کے حاصل کرنے کے طریقوں کو بیان نہیں کیا، مثلاً فنون عربیہ جیسے صرف ونحو اور معانی وبدیع کے قواعد کی تفصیل اور استدلال مسائل کی بنیاد یعنی منطق، فلسفہ اولیٰ اور مناظرہ کے مسائل، اور قوانین اجتہادیہ کا بیان، یعنی قیاسی مباحث، علتوں کی تعیین، اور مسائل ترجیح وقواعد جدل اور انسان کی باطنی قوتوں کی تشریح جو اخلاق اور ملکات کی حامل ہیں اور حکمت عملیہ یعنی گھر اور باہر کی سیاست کے اصول کی تفصیل شارع سے منقول نہیں ہے، بلکہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے جو کچھ ثابت ہے وہ یہی قرآن وحدیث ہے اور بس۔ اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت حجت وبرہان اور سیف وسنان کے ساتھ صرف انھیں دونوں چیزوں کی تھی اور انھیں دونوں چیزوں کی نشر واشاعت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کس قدر مشقتیں اور تکلیفیں اٹھائیں، البتہ وہ نازک اور دقیق علوم، کتاب وسنت کے علوم کے حصول کے بعد بعض اشخاص کی نسبت اکسیر اعظم کا حکم رکھتے ہیں کہ ان کے نفوس کو منصبِ امارت اور مقام وراثت نبوت عطا کرتے ہیں اور اسی لیے جب یہ کتاب وسنت حد تواتر اور شہرت کی انتہا کو پہنچ گئی اور ہر عام وخاص نے اس میں سے اپنے نصیب کے مطابق اخذ کرلیا اور ان دونوں کو تمام مسلمانوں نے دل سے اوّل درجہ میں تسلیم کیا، تو وہ دقیق علوم فنون عربیہ کے اساتذہ، ائمہ مجتہدین، متکلمین، ارباب تہذیب اخلاق اور اصحاب حکمت ایمانیہ کی کوششوں کے نتیجے میں معرض وجود میں آئے۔

اوران حضرات نے اس جد و جہد کی وجہ سے "عُلَمَاءُ اُمَّتِی کَأَنْبِیَاءِ بَنِیْ إِسْرَائِیْلَ" (۷۶) میں بلند مقام حاصل کیا، ان کے متبعین نے ان مباحث کو آگے بڑھانے میں جد و جہد کی، یہاں تک کہ دقیق اور طویل علوم وجود میں آ گئے اور ان کا مبارک زمانہ ختم ہونے کے بعد بے کار مقلدوں کی ایک جماعت نمودار ہوئی جس کے اندر حبّ جاہ اور طلب ریاست کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے، انھوں نے اسی قیل وقال، ناپسندیدہ امور اور بحث وتکرار کو اپنا فضل وکمال سمجھ کر کتاب وسنت کو پس پشت ڈال دیا اور ان جیسی فضول چیزوں کی تحصیل میں اپنی پوری عمر گنوادی، اور فلسفہ واعتزال کا راستہ اختیار کر لیا اور دنیائے فانی سے حسرت وندامت کے سوا کچھ حاصل نہیں کیا، بالآخر وہ اپنی تنگ قبر میں بجز ناکامی وگھاٹے کے کچھ اور نہیں پائیں گے۔ "قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِیْنَ اَعْمَالًا اَلَّذِیْنَ ضَلَّ سَعْیُهُمْ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَهُمْ یَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ یُحْسِنُوْنَ صُنْعًا" (۷۷) اَعَاذَنَا اللّٰهُ وَجَمِیْعَ الْمُسْلِمِیْنَ مِنْ حَالِ اُوْلٰئِكَ الْجَاهِلِیْنَ". (۷۸)

باب دوم

# بدعات سے اجتناب، عبادات کی ادائیگی کے طریقے
# بری عادتوں سے پرہیز اور اچھی خصلتوں سے آراستگی کا بیان
# یہ باب ایک مقدمہ، چار فصول اور ایک خاتمے پر مشتمل ہے

**مقدمہ: اس میں ایک افادہ ہے:**

**افادہ: آثارِ اشغال کے ظہور کی رکاوٹوں کا ذکر**

اذکار واشغال اور مراقبات ومقامات جن کا خلاصہ اولیاے کرام نے تحریر کیا ہے۔ بہت ایسا ہوتا ہے کہ سلوک کا راستہ طے کرنے والوں کو بیان کردہ امور پیش آتے ہیں اور وہ ان ہی اذکار واشغال اور مراقبات کے ذریعے ان مقامات تک رسائی حاصل کرتے ہیں، البتہ وہ عنایات وبرکات جو بارگاہِ خداوندی کی طرف سے اولیاے عظام کو پے در پے پہنچتی ہیں ان میں سے تھوڑا بھی سالکین کو میسر نہیں ہوتا اور وہ آثار بالکل مترتب نہیں ہوتے۔ اگرچہ حضرت خالق الأرض والسمٰوات کے نزدیک قبولیت اور اس کی برکات وعنایات کے ظہور میں تمام اہل کمال کے درمیان برابری ممکن نہیں ہے، لیکن ہر ایک کے حسب حال ان کا ظہور ضرور ہوتا ہے اور ان آثار کے نہ پائے جانے کی صورت میں اس چیز کی تحقیق وجستجو ضروری ہے جو ان سے مانع ہو، تاکہ اس رکاوٹ کو دور کیا جائے اور مقصود حقیقی تک پہنچا جائے۔

اکثر وبیش تر لوگوں میں عبادتوں کے ان آثار کے ظاہر نہ ہونے کی وجہ ان کا بدعات میں ملوث ہونا، برے عادات واطوار کو اختیار کرنا اور عبادتوں کی ادائیگی کی طرف بے توجہی کے باعث ان کو اس طریقے کے مطابق ادا نہ کرنا ہے جو شارع کو مقصود ہے، اور عبادتوں میں خلل ڈالنے والی چیزوں کا عبادات میں سرایت کرنا ہے؛ لہٰذا اس باب کو ضرورتاً چار فصلوں میں تقسیم کیا گیا۔

# پہلی فصل

## بدعات سے بچنے کا بیان

اس میں تین ہدایات ہیں:

**پہلی ہدایت:** ان بدعات کے بیان میں جو صوفیۂ کبار قدس اللہ اسرارہم کا لبادہ اوڑھنے والے ملحدوں اور صوفی نما مشرکوں سے میل جول کے سبب عام مسلمانوں میں پھیلی ہوئی ہیں، یہ ہدایت دو تمہید اور چھ افادات پر مشتمل ہے:

**پہلی تمہید:** کشف وشہود کے بیان میں جو اللہ کے مقبول اور مردود بندوں کے درمیان مشترک ہے۔

کشف وشہود جو سلوک کے اعمال واشغال اختیار کرنے کے نتیجے میں سامنے آتے ہیں وہ کافر ومسلمان اور بدعتی ومتبع سنت کے درمیان مشترک ہوتے ہیں، لیکن مومن کا ایمان اور اس کا اتباع سنت کا عزم اس کی مقبولیت کا سبب ہے اور کافر کا کفر، ملحد کا الحاد اور بدعتی کی بدعت اس کی دھتکار کا باعث ہے۔

لہٰذا صرف اسی کشف وشہود کو وہ خوبی جاننا جو انسان سے مطلوب ہے، سراسر غلطی ہے، البتہ مومن کے حق میں ایک مفید چیز ہے، اس لیے کہ وہ مطلوب کمال کا راستہ اور وسیلہ ہے۔ پس انسان دو چیزوں سے کامل بنتا ہے۔ پہلی چیز معرفت الٰہی ہے اور یہاں معرفت الٰہی سے مراد وہ مجمل معرفت نہیں ہے، جس سے ہر کس وناکس واقف ہوتا ہے، یعنی یہ کہ اللہ تعالیٰ تمام اوصاف میں سب سے بزرگ وبرتر ہے، اس کی حیات تمام زندوں کی زندگی سے بڑی اور قدیم ہے اور اس کا علم تمام اہل علم کے علم سے زیادہ اور وسیع ہے اور انھیں پر اس

کے دوسرے اوصاف کو قیاس کرلو۔ کیوں کہ اس قدر معرفت اگر کمال کا موجب ہوتی تو ناقص آدمی ناپید ہوجاتا، اگر چہ اس قدر معرفت بھی فائدہ سے خالی نہیں ہوتی ہے۔

اور نہ یہاں پر معرفت الٰہی سے اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کی حقیقت کی تہہ تک پہنچنا مراد ہے کہ انسان کی قوت احساس ان کا بالکل احاطہ کرلے، کیوں کہ یہ بات ممکن نہیں ہے، مثلاً اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی صفت رزّاقیت جیسا کہ چاہیے اگر کسی فرد بشر پر منکشف ہوجائے تو کوئی انسان اس کے مبادی کا تحمل نہیں کرسکتا، چہ جائے کہ وہ اس کی انتہا تک پہنچے، اگر یہ معرفت انسان کے کمال کے واسطے مقصود ہوتی تو کامل انسان کا وجود عنقا ہوجاتا، اس لیے یہاں پر معرفت الٰہی سے مراد وہ معرفت ہے جو خدا تعالیٰ کو انسان کی تخلیق سے مطلوب ومقصود ہے اور وہ قرآن وحدیث سے معلوم ہوتی ہے، اور اسی معرفت کے نتیجے میں آدمی کو بارگاہِ الٰہی میں عزت واعتبار حاصل ہوتا ہے اور کچھ لوگوں کو یہ معرفت بغیر عزت واعتبار کے میسر ہوتی ہے جیسے حکماء وغیرہ۔

پس وہ غیبی معرفت والا اور کامل انسان اس خدمت گار اور خواص کے مانند ہوجاتا ہے جو اپنے آقا اور بادشاہ کی نظر میں معزز ومعتبر ہو اور اس کی عزت واعتبار کے آثار نمایاں ہوں، مثلاً امانتیں اس کے سپرد کی جاتی ہوں اور وہ انھیں بعض رعایا، فوجیوں، ضرورت مندوں اور گداؤں کو پہنچانے پر مامور ہوتا ہو اور اس کی بات قابل اعتبار اور سچ تسلیم کی جاتی ہو، نیز لوگوں کے حق میں اس کی سفارش قبول کی جاتی ہو، جب ایسی عزت واعتبار حق تعالیٰ کی ذات وصفات کی معرفت کے نتیجے میں کسی شخص کو حاصل ہوجائے تو وہ ہی کامل انسان ہے۔ اور ان اوصاف کی حصول یابی کے باوجود کاملین مراتب میں ایک دوسرے پر اس قدر فوقیت رکھتے ہیں کہ ان کا شمار ناممکن ہے، ولایت کے ادنیٰ درجے سے لے کر خاتم النبیین حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے مرتبے تک باہم فرق مراتب کو سمجھنا چاہیے۔

اور راہِ خدا کے سلوک کو سلوک کے اسی مقررہ طریقہ میں منحصر نہ سمجھیں، بلکہ اس کے اور

بھی بہت سے راستے ہیں جن میں سے یہ بھی اس کا ایک مقبول راستہ ہے اور اس مقررہ طریقے کا دارومدار اس طریقے والے کے احوال وافعال پر ہے جو کتاب وسنت کے مطابق ہیں۔

## دوسری تمہید: راہِ حق میں خلل ڈالنے والے صوفی نما ملحدین کا بیان

راہِ حق میں سب سے زیادہ خلل ڈالنے والے صوفی نما ملحدین ہیں جو شریعت کی مخالفت سے بالکل نہیں ڈرتے ہیں، بلکہ اس کی مخالفت کے التزام کو اپنا طریقہ جانتے ہیں اور مشرکانہ ومبتدعانہ برے اشغال سیکھتے اور سکھاتے ہیں اور الحاد و بے دینی کی باتیں لوگوں میں پھیلاتے ہیں۔ ان کے اقوال وافعال کے مطابق ان کے ساتھ معاملہ کرنا چاہیے جو قتل کے قابل ہو اسے قتل کر دیں اور جو تعزیر وتنبیہ کے لائق ہو اس کی تعزیر وتنبیہ کریں اور اگر ان پر احکام شرعیہ جاری کرنے سے عاجز ہوں تو ان سے بہت دور رہیں، ہرگز ان سے ملاقات نہ کریں اور ان سے ملنے جلنے کو نہایت بری بات تصور کریں، اور اگر ملاقات کرنے سے ان میں سے کسی کی ہدایت کا گمان دل میں آئے تو ایک دو بار اس سے مل لیں، اگر وہ ہدایت پالے تو اس بات کو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سے شمار کریں ورنہ اس کو چھوڑ دیں، پھر کبھی دوبارہ اس کے پاس نہ جائیں، کیوں کہ اللہ جل شانہ کے طالب کے حق میں برے آدمی کی صحبت سے پرہیز کرنا انتہائی ضروری ہے ؎

نخست موعظت پیر صحبت ایں حرف است　　که از مصاحب ناجنس احتراز کنید (۷۹)

## پہلا افادہ: ملاحدہ کی طرف سے بے ادبی کے کلمات صادر ہونے کا ذکر

صوفی نما بددینوں کی جملہ بدعات میں سے جو بدعت عوام الناس میں جاری وساری ہے، بلکہ بعض خواص بھی اس میں مبتلا ہو گئے ہیں، وہ حضرت حق تعالیٰ کی شان میں بے ادبی کے کلمات کو زبان پر لانا ہے۔ لہٰذا طالب حق کو چاہیے کہ ایسی باتیں سننے سے پرہیز کرے اور خود بھی نہ کہے اگرچہ ان کلمات کے کہنے والے کے متعلق نیک گمان بھی ہو، کیوں کہ بے ادبی کا نتیجہ کبھی بھی اچھا نہیں ہو سکتا، اگر کسی سے ایسے نامناسب جملے سرزد ہوں تو وہ

پیروی کے لائق نہیں

حافظا علم وادب ورز کہ در مجلس شاہ ہر کہ را نیست ادب لائق صحبت نبود(۸۰)

مثلاً کسی نے کہا کہ میں نے ایک کوڑی کے عوض خدا کو خرید لیا ہے، کسی وقت ایک کوڑی کا پانی اللہ کے یہاں مقبول ہوا اور اس کی ترقی کا ذریعہ بنا تو اس نے اس بات کو اس جملہ سے تعبیر کیا، اگرچہ مطلب درست ہے لیکن طریقۂ ادا غلط ہے، اگر وہ کہتا کہ ایک کوڑی دے کر میں اس کے (مقبول) بندوں کے زمرے میں شامل ہو گیا ہوں تو اچھا ہوتا، اس طرح کی تعبیرات صحیح ہیں اور ان میں ادب ہے۔ اور خود کو خوب رحم کرنے والے، بے پایاں شفقت وتوجّہ فرمانے والے، سخت سزا دینے والے اور بہت جلد انتقام لینے والے بے نیاز شہنشاہ عالی جاہ کے بندوں، بلکہ اس کے کمترین بندوں میں سے ایک بندہ جانے اور ہمیشہ ہر حرکت وسکون میں اس سے ڈرتا اور کانپتا رہے، اگرچہ اس پر عجیب حالتیں وارد ہو کر بے ادبانہ کلمات بولنے پر اس کو آمادہ کریں۔

دوسرا افادہ: وحدۃ الوجود کا ذکر

وجودی ملحدوں کی جملہ بدعات میں سے جو بدعت عوام وخواص ہر دو طبقے میں مشہور ہو گئی ہے اور اکابرین طریقت کی باتوں کے مشابہ ہو گئی ہے، وہ ملحدانہ توحید وجودی کی باتیں ہیں یعنی کہ وہ خدا تعالیٰ کے ساتھ اپنے اتحاد کے گمان پر نفسانی لذتیں حاصل کرتے ہیں اور شیطانی بہکاوے اور ناپاک نفوس کے مکر وفریب کی وجہ سے اس طرح کی گفتگو کو معارف وحقائق تصور کرتے ہیں۔ ان باتوں کا سب سے چھوٹا نقصان یہ ہے کہ وہ اپنے قیمتی اوقات کو بے فائدہ کاموں میں صرف کرتے ہیں۔ ہمارے پیشوا حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا حکم نہیں دیا اور ہرگز اس کے بیان کے واسطے لب کشائی نہیں فرمائی؛ لہٰذا ہمیں اس سے کیا واسطہ! اگر یہ معاملہ نماز وروزے کی طرح ہمارے لیے مفید ہوتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ضرور اس کی تعلیم دیتے کیوں کہ "حَرِيصٌ عَلَيْكُم بِالْمُؤْمِنِينَ

رَءُوۡفٌ رَّحِیۡمٌ" (۸۱) آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان ہے۔لہٰذا اس سے خاموشی بہتر ہے، کیوں کہ ہماری کوئی غرض اس سے وابستہ نہیں ہے، اور چوں کہ اس گفتگو کے رائج ہونے کی وجہ سے لوگ اس کے صحیح اور غلط ہونے کے بارے میں سوالات کرتے ہیں، تو اس قدر معلوم ہونا چاہیے کہ یہ مخلوقات عین خدا تعالیٰ نہیں ہیں، اگر چہ ان کا قیّوم (سنبھالنے والا) اسی کی پاک ذات ہے، لہٰذا ان مخلوقات کی تمثیل اس کی صفات سے کرنی چاہیے کیونکہ صفات الٰہی نہ عین ذات ہیں اور نہ اس کا غیر، بلکہ اس کے ساتھ قائم ہیں، اسی طرح مخلوقات بھی نہ عین صفات ہیں اور نہ ان کا غیر، بلکہ ان صفات کے مظاہر ہیں۔ پس صفات اگر چہ بذات خود مظاہر سے مستغنی ہیں لیکن حکمتِ الٰہیہ کے تقاضے کی بنا پر استغنا کے باوجود مختلف مظاہر یعنی مخلوقات میں جلوہ گر ہوئی ہیں۔

اکابرین طریقت کے نزدیک وحدۃ الوجود کا بس یہی مفہوم ہے، اس زمانے کے ملحدوں نے ان بزرگوں کے اقوال کو ان کے مقصود کے خلاف پر محمول کر کے تحریف و تلبیس کا نیا دروازہ کھول دیا ہے۔ بس اس قدر معلومات حاصل کرنے میں کوئی حرج نہیں، لیکن اپنے اوقات کو اس قسم کی باتوں میں صرف کرنا محض بے فائدہ ہے، بلکہ انبیائے کرام علیہم الصلوٰات والتسلیمات کی کامل پیروی سے محرومی کا سبب ہے۔

## تیسرا افادہ: مسئلہ تقدیر کا ذکر

تقدیر کے مسئلے میں کہنا سننا اور بحث و مباحثہ صوفی نما بددینوں کی ان بدعات میں سے ہے جو عام مسلمانوں میں پھیل گئی ہیں۔ معلوم ہونا چاہیے کہ ایمان بالقدر (تقدیر پر ایمان لانا) اسلام کا اہم ترین عقیدہ اور دین کی ضروری باتوں میں سے ہے، اور چوں کہ بادی النظر میں ایک طرح سے تقدیر کا مسئلہ تکلیف (انسان کے مکلّف ہونے) کی بحث کا معارض و مخالف معلوم ہوتا ہے، اس لیے شارع علیہ الصلاۃ والسلام نے اس دقیق مسئلے کی گہرائی و گیرائی میں جانے اور اس پر غور و خوض کرنے سے بہت تاکید کے ساتھ منع فرمایا ہے۔

لہٰذا تمام مسلمانوں پر یہی واجب ہے کہ وہ مجملاً تقدیر پر ایمان لانے پر بس کریں اور ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر میں گھسنے یعنی اس مسئلے کی تفصیل و تنقیح کے پیچھے پڑنے کی ناکام کوشش نہ کریں؛ لیکن ان دنوں تقدیر کے منکر رافضیوں سے رابطے اور تکلیف کے منکر ملحدوں سے میل جول کی وجہ سے جنھوں نے احکام شرعیہ کو تقدیر کا مخالف سمجھ لیا ہے اور مسئلہ تقدیر کا سہارا لے کر امور شرعیہ کو باطل اور بے بنیاد قرار دینے کی کوشش کرتے ہیں مجبوراً بحکم "الضرورات تبیح المحظورات" (۸۲) اس مسئلے کی تحقیق کی طرف کچھ اجمالی اشارہ ضروری معلوم ہوا، اس کے باوجود اس کتاب کا مقصود فقط اسی اجمالی ایمان کا اہتمام ہے۔ اس کی تفصیل سیدھے سادے مسلمانوں کو گمراہ کن شیاطین یعنی شیعوں اور ملحدوں کے اتباع سے بچانے کے لیے کی جارہی ہے۔

پس میں کہتا ہوں کہ سارے بندوں کے تمام اقوال وافعال اور ان کی حرکات وسکنات، معلومات وارادے، تمام عادتیں اور صفتیں خواہ وہ اچھی ہوں یا بری یہ سب کے سب اللہ عزوجل کے پیدا کئے ہوئے اور اسی قادر مطلق کے بنائے ہوئے ہیں، ہاں! مگر بعض افعال کو بعض بندوں میں پیدا کرنے اور بعض دوسرے افعال کو کچھ اور بندوں میں ایجاد کرنے میں تخصیص کرنا جیسے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے دل میں ایمان اور ابوجہل کے دل میں کفر پیدا کرنا ایک مخفی حکمت پر مبنی ہے جس کا شرح وبسط کے ساتھ کوئی بھی شخص احاطہ نہیں کرسکتا۔ البتہ اس قدر معلوم ہے کہ وہ حکمتِ ازلی استعدادوں کے فرق کی رعایت ہے اور فطری استعدادوں کے اختلاف کی حقیقت کو ایک مثال سے سمجھو! مثلاً ایک عظیم الشان درخت ہے جس میں ہزاروں قسم کی لکڑیاں موجود ہیں، ان میں سے بعض جلانے کی قابل ہیں اور بعض پانی پینے کے برتن بنانے کے لائق ہیں اور جو لکڑیاں جلانے کی قابل ہیں ان میں بھی باہم بہت فرق ہے، مثلاً درخت کاٹتے وقت بعض چھوٹے چھوٹے ہلکے اور بے کار ٹکڑے نکلیں گے جو آگ جلانے کی ابتدا میں آگ سلگانے کے کام میں آتے ہیں، بلکہ سچ پوچھو تو

ان کے بغیر آگ جلتی ہی نہیں اور بعض اس قدر سخت گرہیں نکلیں گی جنھیں آگ کے شعلہ زن ہونے پر اس میں ڈالا جاتا ہے تاکہ آگ خوب بھڑک جائے۔ اور بعض لکڑیاں عمارت میں کام آتی ہیں کہ کسی کو کڑی بناتے ہیں اور کسی کو تختہ، پھر ان میں بھی بہت فرق ہے بعض بادشاہ کے محل خاص کی چھت کے تختے ہیں اور بعض قیدیوں کے بیت الخلاء میں پاؤں رکھنے کی جگہ پر نصب ہیں، ایک وہ تختی ہے جس پر کسی حق پرست اور کامل انسان کے ہاتھ سے کلام الٰہی کے حروف منقش ہیں اور ایک وہ تختہ ہے جو بے کار ہونے کی وجہ سے عقلمند کاریگر کے ہاتھ سے راستہ میں پھینکا ہوا پائمال پڑا ہے، بالکل اسی طرح استعدادوں کے اختلاف کو جو افراد انسانی میں بے شمار ہیں، سمجھنا چاہیے۔ اسی مثال کو حضرت شیخ الاسلام خواجہ عبداللہ انصاری ہروی قدس اللہ سرہ (۸۳) نے اپنی بہتر اور مختصر عبارت میں یوں بیان کیا ہے:

ہائے ہائے راستہ کا یہ اختلاف عجیب وغریب ہے کہ ایک ہی کان سے نکلے ہوئے دو ٹکڑوں میں سے ایک گھوڑوں کا نعل بنا اور دوسرا بادشاہ کا آئینہ۔

اگرچہ اصل تخلیق میں ساری استعدادوں کے درمیان اچھائی یا برائی میں مساوات یا پیدایش کے بعد ہر فاسد استعداد کی اصلاح اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی قدرت کاملہ کے سامنے بالکل ہیچ اور انتہائی آسان ہے، لیکن حکمتِ خداوندی اصل پیدایش میں صالح وفاسد فطری استعدادوں کے اختلاف، بعض خراب استعدادوں کی اصلاح اور بعض کو ازلی خرابی پر باقی رکھنے کی متقاضی ہے، تاکہ الوہیت جو کہ تمام صفاتِ کمال کی جامع ہے، اس کے کارخانوں میں سے دو عظیم الشان کارخانے رونما ہوں۔

اوّل عفو ودرگزر کا نظام ہے۔ اگر تمام فطری صلاحیتیں ایک جیسی ہوتیں یا اللہ تعالیٰ محض اپنے فضل وکرم سے فاسد استعدادوں میں سے کسی ایک کی بھی اصلاح نہ فرماتا تو ہرگز اس کی صفت عفو وحلم جلوہ گر نہ ہوتی اور دوسرا حکومت کا نظام ہے جس سے مراد فرماں برداروں کو نوازنا اور نافرمانوں کو سزا دینا ہے، پس اگر تمام استعدادیں برابر ہوتیں یا اللہ

تعالیٰ ہر ایک فاسد استعداد کو سنوار دیتا تو صفت حکومت ختم و بے فائدہ ہو جاتی یعنی تعذیب وکرم فرمائی ظہور میں نہ آتی، کیا تم نہیں دیکھتے ہو کہ سلطنت کا نظام بغیر جیل، قیدیوں، جا گیر اور جا گیر داروں کے اپنے کمال کو نہیں پہنچتا ہے۔ اگر چہ اللہ تعالیٰ کے ذاتی کمالات اور اس بے نیازِ مطلق کی صفات کاملہ ظہور سے مستغنی اور مظاہر کی احتیاج سے پاک ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "اِنَّ اللّٰهَ لَغَنِیٌّ عَنِ الْعٰلَمِیْنَ" (۸۴) اس آیت میں اسی مفہوم کی طرف اشارہ ہے۔ لیکن جس طرح ہر صاحبِ کمال کا کمال اپنی نمایش چاہتا ہے اور اس کی رونمائی سے صاحب کمال کو انتہائی خوشی حاصل ہوتی ہے، اگر چہ وہ صاحب کمال اپنے کمال میں اس کے آثار کے ظہور سے بے نیاز ہو، مثلاً خوش نویس کاتب کو دیکھو! کہ اگر چہ بالفعل تحریر کا صدور کسی بھی طرح سے اس کے کمالات میں سے شمار نہیں ہوتا ہے، بلکہ اس کا کمال وہی کتابت کا ملکہ ہے جو ہمیشہ اس کے نفس جوہر میں موجود رہتا ہے، لیکن ملکہ خوش نویسی عمدہ تحریر کا جلوہ بکھیرنا چاہتا ہے اور وہ کاتب اچھی تحریر کے ظہور سے بہت خوش ہوتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کی ازلی اور واجبی صفات مظاہر سے استغنا کے باوجود ظہور کا تقاضا کرتی ہیں اور اللہ تعالیٰ کو گونا گوں مظاہر اور رنگا رنگ نشانیوں کے صدور سے انتہائی خوشی حاصل ہوتی ہے۔

اس تقریر سے اس شبہ کا ازالہ ہو گیا جو اکثر عوام الناس کے دل و دماغ میں پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اکثر عوام کو سرسری نظر میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے تمام بندوں کو دونوں جہاں میں بہتری کی غرض سے ایک جیسی استعداد والا کیوں نہیں بنایا، تا کہ اس کے سارے بندے دنیا و آخرت ہر جگہ عیش و آرام کے ساتھ زندگی گزارتے، یا تمام فاسد استعدادوں کی کیوں نہیں اصلاح فرمائی کہ اصلاح ان بندوں کے حق میں لطف وکرم ہے اور حضرت حق تعالیٰ کی قدرت اور اس سخیٔ مطلق کی سخاوت کی کوئی انتہا نہیں۔

اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام صفات کمالیہ کا جامع ہے جن میں سے ایک صفت حکومت ہے اور حکومت کا ایک شعبہ، ایک وسیع نظام ہے جو نافرمانوں سے انتقام

لینے اور باغیوں کو سزا دینے پر مشتمل ہے۔ پس اگر یہ شعبہ واضح اور ظاہر نہ ہوتا تو امور مملکت اپنے کمال کو نہیں پہنچتے۔ ؎

در کارخانۂ عقل از کفر ناگزیر است　　　دوزخ کرا بسوزد گر بولہب نباشد (۸۵)

اور باقی رہا یہاں پر ایک سوال جو جواب طلب ہے وہ یہ کہ جب افعال واقوال فطری استعدادوں پر موقوف ہیں اور استعدادیں بشری طاقت سے خارج ہیں تو پھر سرکش کافروں اور ہٹ دھرم فاسقوں پر الزام وسرزنش کا کوئی جواز نہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے دو طرح کی مخلوق پیدا فرمائی ہے، مخلوق کی ایک قسم وہ ہے جس کے اندر علم وارادہ کی صلاحیت نہیں ہے، جیسے درخت اور پتھر وغیرہ اور دوسری قسم وہ ہے جس کے اندر یہ دونوں صفتیں رکھی گئی ہیں جیسے انسان وجنات، پس وہ ہستیاں جن میں علم وادراک کی صلاحیت ودیعت کی گئی ہے وہ چوں کہ اپنی ذات وصفات، اعضا وجوارح اور اقوال وافعال کا علم رکھتی ہیں، اس لیے وہ ان ذکر کردہ امور کو اپنی طرف منسوب کرتی ہیں، مثلاً وہ جانتی ہیں کہ یہ ہاتھ، پاؤں ہمارے ہیں اور یہ قول وفعل ہم سے صادر ہوئے ہیں، لہٰذا وہ کام جن میں انسان کے ارادے کا دخل ہو اگر چہ ان کا خالق اللہ تعالیٰ ہے لیکن ان کاموں کو انجام دینے والا یقینی طور پر جانتا ہے کہ وہ کام ہم سے سرزد ہوئے ہیں، اور چوں کہ انسان کی طرف افعال مذکورہ کی نسبت سارے احکام شرعیہ کی طرح قرآن مجید سے صراحتاً ثابت ہے، اس لیے مسلمانوں پر واجب ہے کہ جیسے انھوں نے تمام شرعی احکام کو قرآن کریم سے سمجھ کر قبول کیا ہے اسی طرح اس حکم کو بھی قبول کریں اور برے وگندے کاموں کو اپنی طرف منسوب کریں، اس یقین کے ساتھ کہ یہ کام ہمارے اختیار سے صادر ہوئے ہیں، ان شاء اللہ اتنی واقفیت کافروں وفاسقوں کی سرزنش وسزا کے درست ہونے میں کافی ہوگی۔

اور رہی یہ بات کہ علم ان میں کیوں ودیعت کیا گیا، یا صفت ارادہ ان میں کیوں پیدا کی گئی یا ان کے ارادے کو ان افعال واقوال کی طرف کیوں پھیرا گیا؟ تو اس کا جواب یہ

ہے کہ یہ سب باتیں فطری استعدادوں کے آثار کے سلسلے سے ہیں اور جہاں تک ازلی استعدادوں کے اختلاف کی بات ہے تو اس کا سبب ابتدائے کلام میں ذکر کر دیا گیا ہے، اور اگر کسی کے دل و دماغ میں یہ سوال انگڑائی لے رہا ہو کہ جب یہ تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ:

ہر یکے بہر کارے ساختند میل اورا در دلش انداختند (۸۶)

تو پھر رسولوں کی بعثت، آسمانی کتابوں کا نزول، دلائل و براہین کی اقامت، دعوت و تبلیغ کی جدو جہد، تعلیم و تعلم کی کوشش اور مشروعیت جہاد و حدود کی حکمت کیا ہے؟ تو میں عرض کروں گا کہ اگر چہ پوری کائنات بغیر کسی واسطے اور وسیلے کے محض خالق الارض والسمٰوات کی بنائی ہوئی ہے، لیکن اس حکیم مطلق نے اپنی شاندار حکمت کے تقاضے کی بنا پر بعض چیزوں کو بعض موجودات سے مربوط کر دیا ہے اور اسباب و مسببات کا سلسلہ شروع کیا ہے، مثلاً سورج اور اس کی روشنی اگر چہ یہ دونوں بلا شرکت غیرے پروردگار عالم کی مخلوق ہیں، لیکن اس نے سورج اور اس کی شعاعوں کے درمیان ایک خاص ربط پیدا فرما دیا ہے، اسی وجہ سے آفتاب کو سبب اور روشنی کو مسبّب کہتے ہیں۔ لہٰذا ایسے ہی قیاس کرنا چاہیے کہ اگر چہ تمام باتیں اور کارنامے جو ارادہ والی مخلوق سے صادر ہوئے ہیں، وہ قادر مطلق کے پیدا کیے ہوئے ہیں، لیکن اس قادر مطلق نے اپنی حکمت باہرہ کے تقاضے کی بنا پر ان کاموں اور ارادوں کے درمیان سببیت و مسببیت کا تعلق جوڑ دیا ہے۔ ٹھیک اسی طرح اس نے افکار و ارادے اور بیان کردہ امور یعنی رسولوں کی بعثت اور کتابوں کے نزول وغیرہ کے درمیان سببیت کا تعلق مستحکم کر دیا ہے۔

مثلاً کہا جا سکتا ہے کہ فرماں بردار بندوں کے دلوں میں ان کاموں کا ارادہ جن کی بجا آوری کا حکم دیا گیا ہے ہدایت کرنے والوں کی ہدایت اور تعلیم کرنے والوں کی تعلیم کے نتیجے میں پیدا ہوا اور بت پرستی، زنا اور شراب پینے کا ارادہ جہاد اور حدود کے نفاذ کے ڈر سے ختم ہوا۔

یہ بھی جاننا چاہیے کہ تمام اقوال و افعال اگر چہ ازلی استعدادوں کے آثار ہوتے

ہیں مگر صرف چھپی استعداد پر سزا نہیں دی جاسکتی، کیوں کہ صرف پوشیدہ استعداد قابل گرفت نہیں ہے، بری استعداد والے کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی برائی سے انکار کرے اور نیک شخص کو اپنے برابر خیال کرے، اپنی سزا اور اچھی استعداد والے کے ثواب کو بلاوجہ ظلم وناانصافی گردانے، نیز عدل وانصاف اور حکمت ومروّت سے متصف بادشاہوں کا طریقہ بھی یہی ہے کہ کبھی بھی اپنے علم کی بنیاد پر خواہ وہ علم یقینی ہی کیوں نہ ہو انعام اور سزا کو عمل میں نہیں لاتے ہیں، اس کی مثال یہ ہے کہ صاحب اقتدار حاکم اپنے دوست کو جانتا ہے کہ وہ سب سے بڑا بہادر ہے کسی جنگ میں پیچھے نہیں ہٹے گا اور خوب بہادری کا جوہر دکھلائے گا لیکن وہ حکمراں اپنے اس رفیق کو میدان جنگ میں نمایاں کارکردگی پیش کیے بغیر ایسا انعام نہیں دے گا جس سے اس کو دوسروں پر ترجیح حاصل ہو۔

اور اس کی ضد کی مثال میں صرف اتنا عرض کرنا کافی ہے کہ جیسے کوئی شخص کسی بھیڑیئے کے بچے کو پالتا ہے اور وہ یقین کے ساتھ جانتا ہے کہ اس کی فطرت انسانوں پر حملہ آوری اور درندگی ہے، لیکن اس کی فطرت کے ظہور کے بغیر اس شخص کا غصّہ نہیں بھڑکے گا اور وہ اس بھیڑیئے کو ہلاک کرنا نہیں چاہے گا، لیکن جوں ہی وہ انسان پر حملہ آور ہوگا اس کو اس قدر غصہ آئے گا کہ اس کے قتل کے علاوہ کوئی دوسری سزا اس کے حق میں تجویز نہیں کرے گا اور اس کے قتل کے بغیر اس کو سکونِ دل میسر نہیں ہوگا۔

اللہ تعالیٰ کے جزا وسزا کے نظام کو یک گونہ ان ہی مثالوں سے سمجھنا چاہیے کہ اگرچہ وہ علام الغیوب (غیب کی باتوں کا خوب علم رکھنے والا) فطری استعدادوں کے ذرّے ذرّے سے واقف ہے لیکن گناہ وبرائی کے ارتکاب کے بغیر اس کا غصّہ سزا کا موجب نہیں ہوتا ہے اور اسی طرح نیکی وعبادت کے ظہور کے بغیر اس کی رحمت کا دریا جوش نہیں مارتا ہے۔

بحر بخشایش نمی آید بجوش     تانگرید کودکے حلوا فروش (۸۷)

## چوتھا افادہ: مرشد کی حد سے زیادہ تعظیم کا ذکر

صوفی نما مشرکوں کی بدعتوں میں سے جو بدعت عموماً اس دور کے عوام وخواص میں اور خصوصاً ملک ہندوستان میں رائج ہوگئی ہے یہاں تک کہ بہت سے نیک بندے بھی اس کا شکار ہیں، وہ مرشد کی حد سے زیادہ تعظیم وتوقیر ہے یعنی اس کی ایسی تعظیم کرنا جس سے اس کے خدا یا نبی ہونے کا عقیدہ ظاہر ہوتا ہو، لہٰذا ضروری ہے کہ اس معاملے کی حد اعتدال کو سمجھا جائے۔

اس کی توضیح یہ ہے کہ بے شک مرشد اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کا وسیلہ ہے، حق تعالیٰ نے فرمایا: "یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اتَّقُوا اللّٰہَ وَابْتَغُوْا اِلَیْہِ الْوَسِیْلَۃَ وَجَاھِدُوْا فِیْ سَبِیْلِہٖ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ" (۸۸) ترجمہ: اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور اس کی طرف وسیلہ ڈھونڈو اور اس کے راستے میں جہاد کرو تا کہ تم کامیاب ہو جاؤ۔

اس آیت میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے کامیابی کے لیے چار چیزیں مقرر فرمائی ہیں (۱) ایمان (۲) تقویٰ (۳) وسیلہ کی طلب (۴) اور اس کے راستہ میں جہاد۔ اہل سلوک اس آیت کو سلوک کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں اور وسیلہ مرشد کو خیال کرتے ہیں لہٰذا حقیقی فوز وفلاح اور اصلی کامیابی وکامرانی کے حصول کے لیے مرشد کی تلاش مجاہدہ سے پہلے ضروری ہے اور سنۃ اللہ (اللہ کا نظام) اسی طریقے پر جاری ہے، کیوں کہ بغیر مرشد کے راستہ پالینا نہایت کم یاب ہے۔ لہٰذا مرشد ایسے شخص کو بنانا چاہیے جو کسی بھی صورت میں شریعت کی مخالفت نہ کرتا ہو اور صراط مستقیم جس سے مراد قرآن وحدیث کی پیروی ہے اس پر ثابت قدم ہو، اسی کو اپنا پیر بنائے، لیکن اس طور پر نہیں کہ ہر حالت میں اس کے اتباع کو پیش نظر رکھے، بلکہ اصل مقتدا شریعت مطہرہ کو جانے اور در حقیقت خدا ورسول کا فرماں بردار ہو اور مرشد کا جو حکم شریعت کے مطابق ہو اس کو دل وجان سے قبول کرے اور شرعی مباح کو اس کے حکم سے ضروری سمجھے، اور اس کا جو حکم خلافِ شریعت ہو ہرگز اس پر عمل نہ کرے بلکہ اسے ردّی کی ٹوکری میں ڈال دے، کیوں کہ حدیث شریف میں وارد ہے "لَا طَاعَۃَ لِمَخْلُوْقٍ فِیْ

مَعۡصِيَةِ الۡخَالِقِ "(۸۹) یعنی خالق کی نافرمانی میں مخلوق کی اطاعت نہیں کرنی چاہیے۔

اور مرشد کی محبت اس طرح پر ہونی چاہیے کہ اپنی جان و مال کو اس کی رضا اور آرام کے واسطے قربان کر دے اور حقیر دنیا کو اس کی رضا مندی سے زیادہ عزیز نہ جانے، کیوں کہ جو فائدہ مرشد سے حاصل ہوتا ہے وہ پوری دنیا سے ہزار درجہ بہتر ہے۔

اور مرشد کی محبت اس حد تک ممنوع ہے کہ اس کی محبت کے پہلو میں خدا اور رسول کی نافرمانی گوارہ کرلے، کیوں کہ یہ بات بارگاہِ خداوندی سے دوری کا سبب ہے، ساری محبتوں اور حقوق کی اصل اللہ تعالیٰ کی محبت اور اس کا حق ہے، اس کی محبت اور حق کے سامنے کسی اور کی محبت و حق کو خاطر میں لانا اللہ جل شانہ سے دوری اور اس کی عنایتوں سے محرومی کا سبب ہے۔

اور اگر مرشد سے بیعت کے بعد طالب حق کو اس مرشد میں کوئی برائی نظر آئے تو اس کو نصیحت کرے اور اس کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا کرے، اگر وہ باز نہ آئے اور اس برائی کو نہ چھوڑے تو اگر وہ برائی عقیدے کی خرابی کے سلسلے سے ہو تو اس سے بیعت کو توڑ دے اور اس کو اپنا پیرو مرشد نہ جانے اور اگر وہ منکر عقیدے کی خرابی کی قبیل سے نہ ہو، بلکہ گناہ کبیرہ ہو تو اس مرشد سے تعلق ختم نہ کرے بلکہ اس کو مصیبت میں مبتلا جان کر اس کام میں اس کی پیروی کو حرام سمجھے اور اس مصیبت سے اس کی نجات کی خاطر مناسب طور پر ظاہری اور باطنی کوشش کرے۔

## پانچواں افادہ: ان بدعات کا ذکر جنھیں بزرگوں کی قبروں پر انجام دیا جاتا ہے

صوفی نما مشرکوں کی جملہ بدعات میں سے جو بدعات اس ملک کے لوگوں کے سامنے نیک کاموں کی صورت میں ظاہر ہوئی ہیں، وہ اولیاء اور بزرگوں کی قبروں پر بدعتوں کی گرم بازاری ہے، اگرچہ وہ بدعات بہت سی ہیں، لیکن یہاں پر بطورِ مثال دو تین انتہائی برے کاموں کا ذکر کیا جاتا ہے تاکہ انھیں پر دوسرے خراب کاموں کا قیاس کیا جا سکے:

۱- ان برے کاموں میں سے لوگوں کا کئی کئی دن اور رات سفر کی پریشانیوں اور مصیبتوں کو جھیل کر ملک کے گوشے گوشے سے اولیاء اللہ کی قبروں کی زیارت کے لیے آنا

ہے اور یہ اسفار باوجود یہ کہ بڑے صبر آزما ہوتے ہیں، ان کو شرک کی تاریکیوں میں لے جاتے ہیں اور اللہ کے غضب کی وادی میں پہنچا دیتے ہیں۔

عوام الناس اس سفر کو سفر حج کے برابر بلکہ بعض وجوہات کی بنا پر اس سے افضل جانتے ہیں اور احرام و محرموں کی صورت سن کر بعینہ یا اس جیسا احرام باندھتے ہیں اور علاوہ ازیں وہ بدانجام مسافر کچھ دیگر قیود اور واہیات کا اپنے سفروں میں اور ان کے متعلقین اپنے گھروں میں التزام کرتے ہیں۔ اگر چہ صاف باطن والوں کو اہل اللہ کی قبروں کی طرف سفر کرنے اور ان کی زیارت کرنے سے تھوڑا بہت فائدہ ہوتا ہے، لیکن عام مسلمانوں کو اس قدر نقصان عظیم ہوتا ہے جو نا قابل بیان ہے، لہٰذا خاص و عام تمام مسلمانوں پر واجب ہے کہ وہ اس کام سے اعراض کریں اور اس سے بالکل کنارہ کش ہو جائیں۔

۲- اور ان ہی برے کاموں میں سے اہل قبور سے استعانت کرنا اور مدد مانگنا ہے کہ وہ ان کو مطلق حاجت روا سمجھ کر ان سے دعا والتجا کرنے کی وجہ سے شرک کے مرتکب ہوتے ہیں اور اس بنا پر ان کا توحید کے سیدھے راستے سے دور جا پڑنا بالکل ظاہر ہے، لیکن یہاں پر ان خواص، اہلِ قلوب سے خطاب مقصود ہے جو فیض باطنی حاصل کرنے کی غرض سے دور دراز مزاروں کا قصد کرتے ہیں۔

پس معلوم ہونا چاہیے کہ اگر چہ اولیاء اور مقبول بندوں کے واسطے موت کی حیثیت ایک پل کی ہے جو محبوب تک پہنچاتی ہے، اور انھیں ایسے انعامات الٰہیہ اور معارف ربانیہ عطا ہوتے ہیں کہ اس عالم کے زندوں کو بہت کم نصیب ہوتے ہیں، اس بنا پر انھیں زندہ کہا جا سکتا ہے، لیکن بلاشبہ وہ اس دنیاوی احکام کے تحت مردے ہیں اور وہ قوت وطاقت جو زندوں کو حاصل ہے انھیں ہرگز میسر نہیں۔ اور اگر فی الواقع اس طرح کی طاقت وقوت ثابت ہوتی اور مزاروں کی مجاوری سے مدعا حاصل ہوتا تو پوری دنیا مدینہ منورہ کو چل پڑتی اور تربیت وارشاد کا سلسلہ لغو اور بے فائدہ ہو جاتا، لہٰذا واضح ہو گیا کہ لوگوں کی تربیت وارشاد کے سلسلے میں

عادت اللہ اسی طرز پر جاری ہے کہ فیوض باطنی، زندوں سے حاصل کیے جائیں۔

اور اگر کبھی کسی کو ایسا زندہ شخص نہ مل پائے جس سے مشکل حل ہونے کی امید ہو تو وہ دور دراز علاقوں سے مزاروں کی طرف قصد نہ کرے بلکہ قرآن وحدیث کی اطاعت کو لازم پکڑے جو مشکلات ختم کرنے کی کنجیاں ہیں۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"وَتَرَكْتُ فِيكُمُ الثَّقَلَيْنِ مَا اِنْ تَمَسَّكْتُمْ بِهِمَا لَنْ تَضِلُّوا بَعْدِيْ كِتَابَ اللّٰهِ وَ عِتْرَتِيْ اَهْلَ بَيْتِيْ" (۹۰) یعنی میں نے تمھارے درمیان دو عظیم الشان چیزیں چھوڑی ہیں جب تک تم ان دونوں کو مضبوطی کے ساتھ پکڑے رہو گے ہرگز میرے بعد گمراہ نہیں ہو گے (۱) اللہ کی کتاب (۲) اور میری اولاد۔ ایک دوسری روایت میں ہے: "تَرَكْتُ فِيكُمْ اَمْرَيْنِ لَنْ تَضِلُّوا مَا اِنْ تَمَسَّكْتُمْ بِهِمَا كِتَابَ اللّٰهِ وَسُنَّةَ رَسُوْلِهٖ" (۹۱) ترجمہ: میں نے تم میں دو چیزیں چھوڑی ہیں جب تک ان دونوں کو مضبوطی کے ساتھ تھامے رہو گے ہرگز راہِ راست سے نہیں بھٹکو گے (۱) اللہ کی کتاب (۲) اوراس کے رسول کی سنت۔

لہٰذا اگرچہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاکیزہ خانوادہ میں مقبول اور متبوع شخص کی پہچان اوران کی دریافت دشوار ہے، کیوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد میں مقبول ومتبوع اوراس حدیث شریف کا مصداق وہی شخص ہوگا جس کے تمام اقوال، افعال اوراحوال کتاب وسنت کے مطابق ہوں، اورظاہر ہے کہ اس زمانے میں ایسے بزرگوں کا ملنا اکسیر اعظم اور کبریت احمر کی طرح نادر وکمیاب ہے، لیکن قرآن مجید جو کہ بہترین ذریعۂ نجات ہے، وہ ہر جگہ موجود ہے اوراسی طرح حدیث شریف بھی ہر وقت میسر ہے۔ لہٰذا ان دونوں کی پیروی کو بڑی غنیمت جانے اور انھیں کو اعلیٰ درجے کی ولایت تصور کرے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ مقدور بھر قرآن وحدیث کی اطاعت بھی ولایت ہے۔

اور اگر بفرض محال ان اصحاب قبور کو طاقت وتوانائی حاصل ہوتی تو انبیاء علیہم الصلاۃ والسلام کے علاوہ دوسرے بزرگوں میں شیطان کی دھوکا دہی کا موقع ہے، کیونکہ

روحوں کے آثار کا ظاہر ہونا ایک مخفی امر ہے اس لیے بہت ممکن ہے کہ شیطان ان کی آواز یا ان کی صورت کی نقالی کر کے خلاف شریعت کسی کام کا حکم دے دے اور یہ بیچارہ نادان انتہائی محبت و عقیدت کی بنا پر اس کو دل و جان سے قبول کر لے اور جو کچھ قرآن و حدیث سے ثابت ہے اس سے چشم پوشی کر کے ہلاکت کے گڑھے میں گر جائے۔

اور شیطان کو بھی قبر والے کی صورت یا اس کی آواز کی نقالی کی زحمت اس وقت اٹھانی پڑتی ہے جب فیض حاصل کرنے والا اس صاحب قبر کی آواز یا اس کی شکل کو پہچانتا ہو، اور جو شخص اس کی آواز یا شکل سے واقف نہ ہو تو اثنائے مراقبہ حالات و کیفیات کی تبدیلی اور توجہات کے ظہور میں صرف (شیطانی) آواز یا اس کی طرف سے دل میں القاء اس کو سیدھے راستے سے ہٹانے کے لیے کافی ہے۔ اور کبھی کبھی بہت سے بے وقوف سوچتے ہیں کہ روزی کی تلاش میں نوکری یا تجارت کی غرض سے دور دراز کا سفر کرنا یقیناً جائز ہے تو پھر دینی مقصد حاصل کرنے کے لیے اس طرح کے سفر مذموم کیوں ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ طریقہ دینی مقصد کے حصول کا نہیں ہے بلکہ یہ راستہ چوروں، قزاقوں اور شیطانوں کی دست درازی سے اصل پونجی کے ضائع ہونے اور مایۂ ایمان کے برباد ہونے کا مقام ہے۔

۳- اور ان ہی بدعتوں میں سے قبروں اور مزاروں پر چراغ جلانا ہے جس کو چراغاں کرنا کہتے ہیں، یہ کام بلاشبہ حرام ہے اور صحیح صریح حدیث میں اس پر لعنت آئی ہے۔ یہی لوگ ہیں جو اس کو شب قدر اور شب براءت میں انوار کے ظہور کے وقت کی مانند قبولیت دعا کی گھڑی جانتے ہیں اور اس وقت میں دعا کرنے کے منتظر رہتے ہیں اور چراغوں کے روشن کرنے کے ساتھ ہی دعا کرنے کو اہم مقاصد میں سے سمجھتے ہیں۔ معاذ اللہ! حدیث شریف میں وارد ہوا ہے کہ زانی کا ایمان زنا کے وقت اور چور کا ایمان چوری کے وقت ان سے جدا ہو جاتا ہے (۹۲)، اس سے زیادہ ان کا ایمان دعا کے وقت صرف اس دعا کی وجہ سے تباہ ہو جاتا ہے، بلکہ اگر جہالت کا عذر نہ ہوتا تو یہ صاف کافر ہو جاتے اور جو شخص جاہل

نہیں ہے وہ تو یقیناً کافر ہے کیونکہ اس نے شرعی محرمات کو عمدہ عبادات سمجھا حالاں کہ صرف حرام کو حلال جاننا بھی کفر ہے چہ جائے کہ اس کو عبادت جانے۔

**چھٹا افادہ: ان بدعات کا ذکر جن کا ارتکاب بزرگانِ دین کی نذروں میں کیا جاتا ہے**

صوفی نما مشرکوں کی جملہ بدعات میں سے جو بدعت ملت اسلامیہ کے خاص وعام بلکہ اکثر افراد میں خوب شہرت پا گئی ہے، وہ اللہ والوں کی نذر و نیاز ہے۔ یہ کام اس طریقے پر انجام دیا جاتا ہے کہ اس میں شرک خفی، فضول خرچی اور نت نئی بدعات متعدد وجوہ کی بنا پر سرایت کر گئی ہیں۔

اس کی تشریح یہ ہے کہ اگر چہ اس کام کی اصل شریعت کے موافق اور بہتر ہے لیکن جب عوام نے اس میں اپنے وہم وگمان کو داخل کیا اور ان کے بعد والوں نے اپنے اگلوں کی پیروی کر کے اس میں نئے نئے اضافوں اور حد بندیوں کا کام کیا اور جو آیا وہ اس قاعدہ کو "ہر کہ آمد براں مزید کرد" (جو شخص آیا وہ اس میں اضافہ کرتا چلا گیا) کو اپنا معمول بنایا تو یہ اصل اور حقیقت چھپ گئی اور ناپاک فروع جو لوگوں کی کوشش و دخل اندازی سے پیدا ہوئی تھیں، ظاہر و رائج ہو گئیں۔

اور فروع اپنی ناپاکی میں ایک دوسرے پر فوقیت رکھتی ہیں، ان میں سب سے چھوٹی برائی رسوم وعادات کی تقلید ہے یعنی ان کا ایسا اہتمام کرنا کہ ان کو چھوڑنا دشوار ہو اور غیر ضروری کو ضروری سمجھنا ہے، یاد رکھیے! ان باتوں میں شیطانی فریب اور اللہ تعالیٰ کی مرضیات سے دوری ہے۔ اس کی واضح دلیل نماز کے بعد داہنی طرف اہتمام کے ساتھ رُخ کر کے بیٹھنے کی ممانعت ہے (۹۳)، جب اس قدر معمولی کام کہ نماز سے فارغ ہو کر داہنی طرف رُخ کرنا ضروری تصور کیا جائے، اس میں شیطان کا حصّہ ہو سکتا ہے تو بڑے کام اور ان کے اہتمام کو نصیبۂ شیطانی سے تعبیر کرنا بدرجۂ اولیٰ درست معلوم ہوتا ہے۔

اور ان زوائد میں سب سے بڑی برائی شرک ہے، جس کا مشاہدہ دورِ حاضر میں اس ملک کے عوام کی طرف سے حضرت سید احمد کبیر (۹۴) کی گائے ذبح کرتے وقت کیا جاتا ہے۔ اس

اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ بے شک زندوں کی عبادت کا ثواب مردوں کو دو راستوں سے پہنچتا ہے۔

**پہلا راستہ:** جو عمدہ اور بہتر ہے وہ یہ کہ زندہ اور مردہ کے درمیان کوئی نسبت ہو، اس تعلق کی وجہ سے میت کا حصہ زندہ کی عبادت میں ثابت ہو، مثلاً باپ، بیٹے کا تعلق ہو اور یہ نسبت پدری و پسری خواہ ولادت کے اعتبار سے ہو یا تعلیم وارشاد کے لحاظ سے، جو شخص عبادت کرتا ہے اس کے آبا کو وہ جس قسم کے بھی ہوں، ثواب پہنچتا ہے اور انھوں نے اس کی ظاہری و باطنی تربیت میں جس قدر کوشش کی ہوگی اس محنت ومشقت کے بقدر اور اس کے مطابق ثواب میں کمی وزیادتی ہوتی ہے۔

لہٰذا مسلمان جس قدر نیک کام میں کوشش کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی رضا کی خالص نیت رکھتا ہے اس قدر اللہ جل شانہ کا حق جو تمام حقوق سے بڑھ کر ہے اور پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا حق اور سارے اساتذہ، مرشدین اور ماں باپ کا حق جو ایمان کی حالت میں دنیا سے رخصت ہوں، اس کے ذمے سے ادا ہو جاتا ہے، انھیں نیک اعمال سے اللہ تعالیٰ کے حضور میں عبادت اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے جناب میں اطاعت اور تمام اہل حقوق کے روبرو سعادت مندی و نیک بختی معرض وجود میں آتی ہے اور یہی وہ باریکی ہے جو احکام شرعیہ کے واقف کاروں پر واضح اور ان کے ناواقفوں پر پوشیدہ ہے اور اسی سبب سے جو لوگ معمول کے مطابق مروّجہ فاتحہ اور ایصال ثواب نہیں کرتے ہیں ان کو ناخلف اور اہلِ حقوق کے حق کا منکر سمجھا جاتا ہے، اگر وہ اشخاص ان مروّجہ فاتحہ وایصال ثواب کے ترک کی وجہ سے ناخلف اور حق داروں کے حق کے منکر ٹھہرتے ہیں تو لازم آتا ہے کہ تمام اہلِ بیتِ عظام، صحابۂ کرام، اور مسلمانوں کے سارے طبقات (تابعین، تبعِ تابعین، مفسرین، محدثین اور مجتہدین) صلحاء، علماء اور اولیاء جو ان رسموں کی ایجاد سے پہلے گزر گئے ہیں معاذ اللہ! وہ سب اپنے اسلاف کے ناخلف اور ان کے حقوق کے منکر ہوئے۔ بلکہ یہ بات افضل المرسلین محبوب ربّ العٰلمین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں امام الانبیاء خلیل اللہ

ابراہیم علیہ الصلاۃ والسلام کی نسبت دل ودماغ میں آئے گی، معاذ اللّٰہ من ذلك ثم معاذ اللّٰہ من ذلك (اس سے اللہ تعالیٰ کی ہزار دفعہ پناہ)۔

پس اس بیان سے واضح ہوگیا کہ یہ رسوم فاتحہ خوانی نئی اختراع ہونے کی وجہ سے دین متین کے ارکان ولوازمات سے زائد چیزیں ہیں اور کمال ایمانی ان پر موقوف نہیں ہے۔

اگرچہ یہ بات اجمالی طور پر سب کے نزدیک مسلم ہے لیکن بسا اوقات کسی نیک اور کامل شخص کی طرف سے اس رسم کے چھوڑنے کے وقت وہ اجمالی یقین عادت کے دبیز پردے میں چھپ کر اغراض کی بنا پر اس صالح اور کامل شخص کے حق میں بدظنی کا باعث ہوتی ہے، اس لیے اس حقیقت کو تفصیل سے ذہن نشیں کرکے ان رسوم ورواج کے چھوڑنے والے کو اس معاملے میں سلف صالحین کا سب سے زیادہ نمونہ ہونے کا اعتقاد کرنا چاہیے۔

**دوسرا راستہ:** یہ ہے کہ زندہ شخص ایسا کوئی کام کرے جس سے مردے کو ثواب پہنچانا مقصود ہو اور اس کا سب سے مشہور اور واضح طریقہ حدیث شریف میں دعا ہے اور دعا کی ایک صورت نماز جنازہ ہے جو واجب ہے اور اس کی دوسری صورتیں جو پنج وقتہ نمازوں اور برکت والے اوقات وغیرہ میں بالعموم یا بالخصوص دور یا نزدیک سے منصۂ شہود پر آتی ہیں۔ بلاشبہ یہ طریقہ مسنون ومستحب اور حدیث کی کتابوں میں مشہور ومعروف ہے۔ اور ان حدیثوں کی تشریحات، طوالت کا موجب جان کر یہاں پر ذکر نہیں کی گئیں، ان کے لیے کتب حدیث سے رجوع کرنا چاہیے۔

لیکن یہاں پر ایک مفید نکتہ بھی سن لینا چاہیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کے کئی درجے ہیں اور اس میں افراط وتفریط ہوجایا کرتی ہے، اگرچہ اس کمی یا زیادتی میں کوئی حرج نہیں ہے، لیکن جو چیز راہِ اعتدال پر ہو وہ بلاشبہ دونوں جانب یعنی افراط وتفریط سے افضل ہے۔ پس وہ دعائیں جو مردوں کے حق میں قبروں پر حاضری کے وقت یا ان کی غیبت میں جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہیں، اسی طرح واقع ہوں، یہ

صورت دوسری صورتوں سے افضل ہے۔ مثلاً آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم شبِ برأت میں تنہا بغیر کسی کو اطلاع دیے اور خبر کیے جنت البقیع تشریف لے گئے اور دعا فرمائی اور صحابۂ کرامؓ میں سے کسی کو حکم نہیں دیا کہ اس رات میں قبرستان جانا چاہیے اور دعا کرنی چاہیے چہ جائے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی تاکید فرمائیں۔

لہٰذا اب اگر کوئی شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع کو پیش نظر رکھ کر شبِ برأت میں قبرستان میں نیک افراد کو اپنے ساتھ جمع کر کے خوب دعا کرے تو اس کو پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کی وجہ سے ملامت کرنا درست نہیں ہوگا، لیکن اس قدر سمجھنا چاہیے کہ یہ کام ہوتے ہوتے رسم بن جائے گا پھر اس وقت کام کی اصل باقی نہیں رہے گی، اس کی واضح مثال یہ ہے کہ فقہی مسئلہ ہے کہ نفل نماز کی جماعت مکروہ نہیں ہے لیکن اگر تداعی اور اہتمام پایا جائے تو مکروہ ہے۔ اور دعا کے علاوہ جو دوسری صورتیں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہیں ان میں سے کنواں کھودنا ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے سعد بن معاذ کو ان کی اس گفتگو کے بعد کہ میری والدہ اچانک انتقال کر گئیں اور بول نہ سکیں اور اگر وہ کچھ بولتیں تو کچھ وصیت کرتیں تو کیا اگر میں ان کے واسطے کوئی کام کروں تو اس کا فائدہ ان کو پہنچے گا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کنواں کھودو اور کہو کہ یہ سعد کی ماں کے لیے ہے۔ (۹۵) اسی طرح جمعہ کے دن سورہ یٰسین کا پڑھنا اور والدین کی قبروں کی زیارت کرنا ثابت ہے۔ (۹۶) اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے اپنے بھائی عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کی طرف سے ان کی وفات کے بعد غلاموں کو آزاد کیا ہے۔ (۹۷) انھیں پر دوسری تمام عبادتوں کو قیاس کر لینا چاہیے۔

لہٰذا ہر وہ عبادت جو کسی مسلمان سے ادا ہو اور اس کا ثواب مردوں میں سے کسی کی روح کو پہنچایا جائے جس کے پہنچانے کا طریقہ بارگاہِ خداوندی میں دعائے خیر ہے، تو یہ طریقہ یقیناً بہتر اور مستحسن ہے، اور اگر وہ شخص جو مردہ کی روح کو ثواب پہنچا رہا ہے، اس کے اہل حقوق میں سے ہے تو اس کے حق کے بقدر ایصال ثواب کرنا زیادہ اچھا ہوگا، پس امور فاتحہ مروّجہ، عرس

اور مردوں کے ایصال ثواب میں سے اتنی بات کی اچھائی میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے۔

اور وقتوں، کھانوں، ان کی خاص صورتوں اور کھانے والوں کی تعیین یہ سب برائی سے خالی نہیں، ہاں بحسب "ظلمات بعضها فوق بعض" (۹۸) برائی کے مراتب میں بڑا تفاوت ہے، صرف تعیین، غیر ضروری کو ضروری سمجھنے کی قسم سے ہے جس کا حال تفصیل کے ساتھ بیان ہو چکا، نیز وقت کی تعیین کی وجہ سے بہت سے دینی و دنیاوی نقصان پیش آتے ہیں، خالص نیت باقی نہیں رہتی ہے بلکہ بعض مرتبہ مطلقاً عبادت کی نیت ہی نہیں ہوتی محض دنیاوی نام ونمود کی غرض سے یا لوگوں کی طعن وتشنیع سے بچنے کے لیے یا حریفوں کے سامنے ذلیل ورسوا ہونے کے ڈر سے یہ کام کرتے ہیں اور اس سے وہ فائدۂ حقیقی جو مقصود ہے، ہر گز حاصل نہیں ہوتا۔

اور یہ لوگ اگر عمل صالح سے خالی ہیں تو ان کا حال اور ان رسومات کو چھوڑنے والے کامل نیک شخص کا حال اپنے اسلاف کے حقوق ادا کرنے کے تعلق سے اس زمانے میں شاہ جہاں آباد (دہلی) اور بخارا کی سلطنت کے مشابہ ہے کہ اوّل الذکر محض رسمی ہے حقیقت سے جس کا کوئی تعلق نہیں، بلکہ سرے سے اس پر سلطنت کا لفظ بھی صادق نہیں آتا اور رسموں کا وجود تو سراب سے بھی کمتر اور بے حیثیت ہے۔ اور ثانی الذکر صحیح معنوں میں سلطنت ہے جو رسوم سے آلودہ نہیں ہوئی۔ اس مثال اور جس کے لیے مثال دی گئی اس کو عقل وشریعت کی ترازو میں تولنا چاہیے اور ان رسم ورواج کے ارتکاب کے وقت اپنے قلبی واردات واحوال سے بحث کرنی چاہیے اور حق بات معلوم کر کے ان رسومات سے بالکل توبہ کر لینی چاہیے، "رزقنا الله التوبة وجميع المؤمنين من كل المكروهات."

اور وہ آداب جنھیں دربار کے طعامِ فاتحہ کی موجودگی میں بجالاتے ہیں، یہ بھی اپنے فاسد خیالات کی پیروی ہے، کیوں کہ فاتحہ اس کھانے کے سبب سے صاحب فاتحہ کا قائم مقام نہیں ہوتی، پھر کیوں وہ آداب جن کے جائز ہونے میں صاحب فاتحہ کے تعلق

سے کلام تھا، عمل میں لانا چاہیے؟ اور وہ فاتحہ کا کھانا اس (مرحوم) کی ملکیت نہیں ہوئی، کیوں کہ اگر وہ اس کی ملکیت ہے تو پھر فاتحہ کرنے والے اس میں دخل کیوں دیتے ہیں، کیوں اپنی مرضی سے کھاتے اور کھلاتے ہیں، بلکہ اس کو صاحب فاتحہ کے وارثوں تک پہنچاتے ہیں؟ حضرت سیدۃ النساء فاطمۃ الزہراءؓ کی نیاز سادات کو اور شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی نیاز ان کی اولاد بزرگوار کو دیتے ہیں، اسی پر دوسرے فاتحوں کو قیاس کر سکتے ہیں۔

اور اگر یہ آداب اس کھانے میں صاحب فاتحہ کی روح داخل ہونے یا اس کے چھونے کے خیال سے ہے یا اس سبب سے ہے کہ اس نے اس میں سے کچھ کھالیا ہے اور یہ اس کا جھوٹا ہے تو یہ سب ان کا فاسد گمان ہے، ہرگز ان باتوں پر ان کو یقین نہیں اور اگر بالفرض تسلیم کرلیا جائے کہ ان میں سے کسی چیز پر انھیں علم یقین حاصل ہے تو وہ حد جو آداب طعام میں ضروری ہوتی ہے وہ کھانا اس سے آگے نہیں بڑھا، لہٰذا اس کھانے کے آداب سے کچھ حاصل نہیں، بجز ہندو کافروں کی مشابہت کے جو کبھی کبھی اناج، غلے اور غذائی اجناس کی پوجا کرتے ہیں۔

اور کھانے والوں کے لیے پابندی کہ ایک کے لیے ممنوع اور دوسرے کے لیے مباح ہے، اس سے حرام کو حلال سمجھنا اور حلال کو حرام سمجھنا ظہور میں آتا ہے، اور اہل جاہلیت (مشرکین مکہ) کا اتباع لازم آتا ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی اسی قسم کی بات کو برائی کے مقام میں ذکر فرمایا ہے۔

"وَ قَالُوْا هٰذِهٖۤ اَنْعَامٌ وَّحَرْثٌ حِجْرٌ لَّا یَطْعَمُهَاۤ اِلَّا مَنْ نَّشَآءُ بِزَعْمِهِمْ" (۹۹)
(وہ کہتے ہیں کہ یہ چوپائے اور کھیتی ممنوع ہے نہ کھائے ان کو مگر وہ شخص جس کو ہم اپنے خیال کے مطابق چاہیں، نیز حق تعالیٰ فرماتا ہے:

"وَقَالُوْا مَا فِیْ بُطُوْنِ هٰذِهِ الْاَنْعَامِ خَالِصَةٌ لِّذُكُوْرِنَا وَمُحَرَّمٌ أَزْوَاجِنَا وَإِنْ يَّكُنْ مَّيْتَةً فَهُمْ فِيْهِ شُرَكَاءُ سَيَجْزِيْهِمْ وَصْفَهُمْ إِنَّهٗ حَكِيْمٌ

عَـلِيُمٌ" (۱۰۰) حجر کا معنی اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ یہی معنی اس ملک اور اس زمانے کے لوگوں کے لفظ ''اچھوت'' سے مراد ہوتا ہے، کھانا ہر بھوکا اور محتاج کھا سکتا ہے، البتہ پرہیز کرنے والا پرہیز نہ کرنے والے سے بہتر ہے؛ لہٰذا صحنک اور توشہ جو بعد والوں کی ایجاد کردہ اور پرورش کردہ ہے اور باطل افکار وخیالات سے خلط ملط ہونے کی وجہ سے حق سے انتہائی دور ہو گیا ہے، ان کی برائی بڑے بزرگانِ دین، تربیت وارشاد کے اوقات میں کلیات کے ضمن میں بیان کرتے ہیں اور ان رسموں کے عین ظہور کے وقت خصوصیت کے ساتھ ان پر نکیر کرنے کو غیر مفید جان کر خاموش رہتے ہیں، ان کی خاموشی سے دھوکا نہ کھا کر انھیں مٹانے کی کوشش کرنی چاہیے، اس لیے کہ یہ خودساختہ قیود رفتہ رفتہ انتہائی بری بات تک پہنچ گئے ہیں اور یہ قیود جہلاء کے ذہنوں میں شرعی پابندیوں سے زیادہ ضروری جگہ بنا چکے ہیں، اس طرح پر کہ ان کو دین کا حصّہ سمجھتے ہیں اور انھیں چھوڑنے والوں اور انھیں بیخ وبُن سے اکھاڑ پھینکنے کی جدوجہد کرنے والوں کو اسلام سے خارج تصور کرتے ہیں، جب رسموں کا اہتمام اس حد تک پہنچ جائے تو مطلوب کے برعکس اور مقصود کے برخلاف ہو کر واجب الترک ہو جاتے ہیں اور سنتوں کو فرض سے جدا کرنے کے لیے حدیث شریف میں جو تاکید وارد ہوئی ہے اس کو ذہن نشین کر کے اس جگہ عمل میں لانا چاہیے۔

اور رسم نذر ونیاز کا رواج اس حد تک ترقی کر گیا ہے کہ کھانے وغیرہ کی نذر سے گزر کر جانوروں کی جانوں تک کو بھینٹ چڑھاتے ہیں اور ان کے ذبح میں غیر اللہ کی خوشنودی کی نیت کر کے حدیث شریف "لعن اللّٰه من ذبح لغير اللّٰه" (۱۰۱) کے مطابق لعنت کا طوق اپنی گردن میں ڈالتے ہیں، اور اکثر علماء کے نزدیک یہ لعنت کفر کی وجہ سے ہے لہٰذا جو چیز کفر ہو اس کو عبادت خیال کرنا کس درجہ غلط اور برا ہوگا۔

اور جو لوگ نذر ونیاز میں معاصی اور کفر کا ارتکاب کرتے ہیں ان کا مقصد ایصال ثواب نہیں ہوتا بلکہ وہ شرک کرتے ہیں، وہ بخوبی جانتے ہیں کہ یہ کام ہم بزرگوں کے واسطے

کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی عبادت کا دھیان ہرگز ان کے ذہنوں میں نہیں ہوتا، اس کی دلیل یہ ہے کہ جس شخص نے بزرگوں کے توشوں اور نیازوں میں زر کثیر خرچ کیا ہو اگر کوئی اس سے پوچھے کہ تم نے خدا کے لیے بھی کوئی چیز دی ہے تو وہ کہے گا کہ نہیں۔

غرض بعض لوگ ان بزرگوں کو تقرب و رضا جوئی میں اللہ کے برابر کا درجہ دیتے ہیں، انھیں جیسی خصلت والوں کا بیان اس آیت کریمہ میں ہے: "وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ" (۱۰۲) بعضے ان اولیاء کو خدا پر ترجیح دیتے ہیں اور بعضے انھیں مستقل ضرورتیں پوری کرنے والا سمجھ کر اللہ تعالیٰ کے سامنے دعا و التجا سے بے نیاز ہو جاتے ہیں۔

لہٰذا اس زمانے میں حق و صواب کے طالب اور مرضیات خدا و رسول کے متبع کے لیے چارہ اسی میں ہے کہ جس شخص کی روح کو ثواب پہنچانا منظور ہو، صورت، جنس طعام اور کھانے والوں کی قید کے بغیر جو چیز اس وقت کے فقیروں اور محتاجوں کے حق میں زیادہ مفید اور بہتر ہو خالص نیت کے ساتھ اس کو ان پر خرچ کرے اور اس کام کو مرحوم کی طرف سے نیت کر کے عمل میں لائے اور اگر دعا بھی کرے تو بہتر ہے، علاوہ ازیں تمام خود ساختہ قیود و رسوم کو یک لخت چھوڑ دے۔

# دوسری ہدایت

## روافض کی بدعات کا ذکر

اس میں تین افادات ہیں:

پہلا افادہ: عقیدۂ تفضیل کا ذکر

روافض کی جملہ بدعات میں سے جو بدعت عوام اہل سنت کے دلوں میں سرایت

کرگئی ہے وہ عقیدہ تفضیل میں سلف کی مخالفت ہے، پس طالب حق کو جو سنت کا پیرو کار اور بدعت سے نفرت کرنے والا ہو اسے چاہیے کہ اپنے دل کی گہرائی سے یہ عقیدہ رکھے کہ چاروں بڑے صحابہ رضی اللہ عنہم انبیاء علیہم الصلاۃ والسلام کے بعد سب سے بہترین انسان ہیں اور ان کی آپس میں فضیلت خلافت کی ترتیب کے لحاظ سے ہے جیسا کہ اہل سنت والجماعت کا عقیدہ ہے۔

ہر مسلمان کو چاہیے کہ اسی ترتیب سے افضلیّت کا قائل ہو اور افضلیّت کے اسباب کی چھان بین نہ کرے، کیوں کہ اسباب افضلیّت کی تحقیق وجستجو واجبات دین بلکہ مستحبات میں سے بھی نہیں ہے۔ خصوصاً عام مسلمانوں کو اس مسئلہ کی تحقیق وتفتیش میں پڑنا محض نادانی اور بے وقوفی ہے، لیکن اس زمانے کے عوام وخواص میں اس بحث کے چرچے اور اس عقیدے میں لوگوں کی افراط وتفریط کی وجہ سے لکھا جاتا ہے کہ حضرات شیخین رضی اللہ عنہما کو خلافت سے قطع نظر بارگاہِ الٰہی میں بہت بڑی عزت ومرتبہ اور انتہائی قربت حاصل ہے اور خلافت میں سبقت اس پر مستزاد ہے۔ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو خلافت کے سوا اس قدر عزت وقربت حاصل نہیں کہ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ پر فوقیت رکھتے ہوں بلکہ حضرت علیؓ کو وجاہت وقرب کے لحاظ سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر برتری حاصل ہے، اور رہی بات خلافت راشدہ میں پہل کرنے کا معاملہ تو عہدہ داروں اور صاحب رتبہ لوگوں کی مزاحمت اور اللہ تعالیٰ کی نمایاں الطاف وعنایات کی بنا پر حضرت عثمانؓ کو حضرت علیؓ پر سبقت حاصل ہوئی، گو ان کا مرتبہ وقرب زیادہ تھا مثلاً جوڑے پہنانے میں پہلے امیر کو بعد والے امیر پر ترجیح دی جاتی ہے، اگرچہ بعد والے امیر کو عزت ومرتبہ اور قربت ومحبوبیت پہلے امیر سے زیادہ حاصل ہو۔

اور حضرت مرتضیٰؓ کو حضرات شیخینؓ پر بعض پہلوؤں سے کسی قدر فضیلت حاصل ہے اور وہ فضیلت ان کے متبعین کی کثرت، مقامات ولایت کی وساطت بلکہ تمام خدمات

جیسے قطبیت (۱۰۳)، غوثیت (۱۰۴) اور ابدالیت (۱۰۵) وغیرہ کی وجہ سے ہے، یہ سب خدمات حضرت مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے زمانے سے قیامت تک انھیں کے واسطے سے جاری ہیں، اور بادشاہوں کی بادشاہت اور امیروں کی امارت میں ان کی توجہ کا دخل ہے جو عالم ملکوت کی سیاحت کرنے والوں پر پوشیدہ نہیں۔ یہ عطیۂ خداوندی انھیں اس سبب سے حاصل ہے کہ کبھی بھی خلافت وسلطنت کے انتظام کی ذمّہ داری ان کے پاکیزہ خانوادے میں نہیں رہی، باوجود یہ کہ بعض بڑے اہل بیت نے اس سلسلے میں بڑی کوششیں کیں اور اس منصب کو پانے کے لیے بڑی تکلیفیں اٹھائیں۔

اور اولیاء اللہ کے اکثر سلسلے حضرت علی رضی اللہ عنہ تک پہنچتے ہیں، اس لیے قیامت کے دن اپنے پیروگاروں کی کثرت کی وجہ سے جن میں بیشتر لوگ جلیل القدر اور صاحب رتبہ ہوں گے، مرتضوی قافلہ اس شان وشوکت کے ساتھ نمودار ہوگا کہ اس کو دیکھنے والے اور اس مجمع کبیر کا نظارہ کرنے والے حیرت میں پڑ جائیں گے۔ بعض اہل تصوف پر اس مقام کا ظہور شیخینؓ کے اخفائے مقام کا سبب ہوا، جس کی بنا پر وہ حضرات شیخینؓ کی افضلیت کے سلسلے میں تذبذب کا شکار ہوکر اہل سنت کے ٹھوس عقیدے سے ڈگمگا گئے، ورنہ درحقیقت حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما کی جو شان عالی انتظام خلافت بلکہ اس سے علاحدہ ہوکر بھی ثابت ہے، اس فضیلت و بزرگی میں حضرت علیؓ کا شیخینؓ سے افضل ہونا تو کجا، برابری کا بھی تصور نہیں کیا جاسکتا۔

انبیاء کرام علیہم الصلوات والتسلیمات کے تمام پیروکاروں میں خلافت کے علاوہ شرح صدر، فراخ حوصلگی، اور اخلاق وکردار، اندرونی وبیرونی انتظامات اور ملک وملت کی سیاست کے ہر شعبے میں اعتدال وتوازن قائم رکھنے کی وجہ سے ان دونوں کی تشبیہ انبیاء سے دی جاسکتی ہے، اس عظمت وبزرگی کی نسبت ماقبل میں تھوڑی بہت خامہ فرسائی کی گئی ہے۔

اس کی مثال یہ ہے کہ درحقیقت اس امیر کبیر کا مرتبہ زیادہ اونچا ہے جو اپنی ڈیوٹی

ادا کرکے اور امورسیاست سے فارغ ہوکر بادشاہ کا ملازم ہوگیا ہو، اس شخص کی بہ نسبت جو ابھی اپنی ڈیوٹی اور کام میں لگا ہوا ہے۔ پس اگرچہ سرسری نظر میں اپنی ڈیوٹی اور کاموں سے فارغ ہوکر شاہی دربار میں حاضری اور بادشاہ سلامت کی خدمت گزاری کی وجہ سے ظاہری شان وشوکت اور فرماں برداروں کی کثرت اس ہم نشیں کے حق میں اس امیر اعظم کی بہ نسبت جو ابھی اپنی ڈیوٹی پر قائم ہے، ثابت نہیں ہے یا بہت کم ہے لیکن درحقیقت اس ہم نشیں کا عہدہ اور اس کا مقام ومرتبہ اس امیر اعظم سے بلند ہے کیونکہ دراصل یہ امیر شان وشوکت اور اپنے متبعین کے ساتھ اس بادشاہ کے جملہ پیروکاروں میں سے ہے کیوں کہ اس کی صلاح ومشورہ بادشاہ کے تمام فرماں برداروں میں جاری وساری ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بارگاہِ ایزدی میں مقبول ہوئے اور عنایات خداوندی ان کے درجہ کی بلندی طرف متوجہ ہوئی، اس لیے لوگوں نے ان کو خلافت میں حضرت علیؓ پر ترجیح دی، تاکہ ان تینوں حضرات کے مراتب کے پہلو میں انھیں بھی مقام حاصل ہو۔

## دوسرا افادہ: عموماً صحابہ کی تعظیم کا ذکر

بڑے صحابۂ کرام میں سے ہرایک کی افضلیّت صحابیت کی بنیاد پر اگرچہ امت محمدیہ کے دیگر افراد کے مقابلے میں ثابت ہے، لیکن بعض اکابرین امت کو بعض صحابۂ کرام پر ہدایت وارشاد اور دین متین کی ترویج وتبلیغ کے لحاظ سے اللہ کے نزدیک قبولیت ومرتبہ کے حصول میں فضیلت وبرتری متحقق ہے، لیکن اس کے باوجود ان بزرگوں پر تمام صحابۂ کرام کی تعظیم ضروری ہے، اس کی مثال یہ ہے کہ اگرچہ بیٹا علم وہنر میں اپنے باپ سے زیادہ ماہر وکامل ہو، لیکن اس کے ذمے باپ کی تعظیم یقیناً واجب ہے۔ حدیث شریف میں وارد ہے:

"فَإِنّ من ورائكم أيّامَ الصبرِ فمن صبَرَ فيهِنَّ كان كمَنْ قبضَ على الجمر للعاملِ فيهنَّ أجرُ خمسينَ رجُلاً يعملون مثلَ عمله قالوا يا رسولَ اللّٰهِ أجرُ خمسينَ منهم قال أجرُ خمسينَ منكم". (۱۰۶)

## تیسرا افادہ: تعزیہ اور ماتم کا ذکر

روافض کی جملہ بدعات میں سے جو بدعتیں ہندوستان میں مکمل طور پر جڑ پکڑ لی ہیں وہ ماہِ محرم میں حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی محبت کے گمان میں ماتم کنی اور تعزیہ داری ہے، ان کاموں کی برائیوں کا جاننا اس زمانے کی ضروری باتوں میں سے ہے، تاکہ مومن کامل ان سے اجتناب کرے اور ان کے مرتکب کے پاس اس کے بعد جہالت وغفلت کا عذر باقی نہ رہے۔ ان بدعات کی چند ظاہری صورتیں یہ ہیں:

**پہلی صورت:** قبور، مقبرہ، علم اور شدہ وغیرہ کی نقل تیار کرنا، یہ سب کام یقیناً بت سازی اور بت پرستی کی قبیل سے ہیں۔ کیوں کہ قبر اور مقبرے کی شکل کی نقل بنانا، ان کی تعظیم کرنا اور حضرت امامین ہمامین صلی اللہ تعالیٰ علیٰ جدھما وعلیہما کی قبروں کا نام ان پر رکھنے کی وجہ سے انھیں اصل قبر اور مقبرے کی جگہ جاننا بت پرست مشرکین کے عادات واطوار میں سے ہے۔ بت پرستی کی حقیقت یہی ہے اپنے ہاتھ سے کوئی شکل تراشے، کوئی صورت بنائے اور اس پر کسی شخص کا نام رکھ کر اس کے ساتھ وہ معاملہ کرے جو اصل کے ساتھ ہونا چاہیے خواہ وہ نقل لکڑی کی ہو یا پتھر کی، اور اس مقام میں واقعی قبروں کے ساتھ بھی سوائے دعا اور سلام کے کوئی دوسری چیز منقول نہیں ہے، اور اہل زمانہ جو کچھ تعزیوں کے ساتھ کرتے ہیں وہ اصل قبروں کے ساتھ بھی نہیں کرنا چاہیے چہ جائے کہ جعلی اور بناوٹی قبریں ہوں۔

اور یہ اہل بدعت ان تعزیوں کی عبادت، سجدہ اور طواف کر کے خود کو صراحتاً شرک جلی کی سرحد تک پہنچا دیتے ہیں۔ اور علم، شدہ اور تعزیوں کو جب سجدہ اور طواف کیا جانے لگے تو وہ سب بت پرستی کے دائرے میں آجاتے ہیں۔ لہٰذا طالب حق کو اس باطل کام کی تردید میں بھرپور کوشش کرنی چاہیے اور جس قدر ہو سکے اس کے ازالے میں خوب جدوجہد کرے اور سختی سے کام لے اور اس کے توڑنے کو ہرگز گناہ نہ جانے بلکہ اس عمل کو بت شکنی کے درجے میں بہتر اور اجر وثواب کا موجب سمجھے، اور اس وجہ سے کہ اہل بدعت وجہالت نے اس پر

حضرات حسنین رضی اللہ عنہما کا نام رکھ لیا ہے، اس کو توڑنے اور اس کی توہین کرنے سے بالکل نہ ڈرے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کی رضا ان چیزوں کے ختم کرنے اور ان کے ارتکاب کرنے والوں کی اہانت وتذلیل میں ہے، اور مقبولانِ بارگاہ الٰہی کی خوشنودی اس کی رضا پر موقوف ہے۔ اور اگر تعزیہ، علم وغیرہ کو ہاتھ سے توڑنے کی استطاعت نہ رکھتا ہو تو زبان سے ان کی مخالفت کرے اور اگر اس کی بھی سکت نہ ہو تو دل سے انھیں برا جانے اور یہ ایمان کا سب سے چھوٹا درجہ ہے، لیکن مقابلے کے وقت ان کے توڑنے کا ارادہ کرے اور اگر مقابلہ ومزاحمت اور اہل تعزیہ سے مڈبھیڑ کے وقت کوئی اہانت آمیز حرکت سرزد ہو جائے اور اس کے بغیر اس بدعت کی بیخ کنی ممکن نہ ہو تو اس حرکت سے نہ ڈرے، بلکہ اس کے مٹانے پر پیش قدمی کرے، اور یہ جو حدیث شریف میں آیا ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تصویر کو دفن کر دیا اور دیگر بتوں کی طرح توہین کر کے اسے نہیں توڑا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس زمانے میں جہلائے عرب کی دل جوئی انتہائی اہم اور ضروری باتوں میں سے تھی، وہ زمانۂ فترت سے نزدیکی کی بنا پر جہالت ونادانی میں غرق تھے، لہٰذا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مجسمہ کی توہین ان جاہلوں کی بدگمانی کا باعث ہوتا کہ وہ اس بت کی اہانت کو حضرات ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کی ملت کی مخالفت پر محمول کرتے اور نبیٔ وقت جو حضرت ابراہیمؑ کے دین کی پیروی کا دعویٰ کرتا ہے، اس کی دعوت سے نفرت کرنے لگتے۔ تعزیہ داری کا معاملہ بالکل اس کے برعکس ہے وہ دور جہالت وضلالت کا دور تھا اور یہ زمانہ علوم حقہ قرآن وحدیث، فقہ اور ہدایت وارشاد کی شہرت وترقی کا زمانہ ہے۔

**دوسری صورت:** آہ وفغاں کی رسمیں ہیں جیسے سینہ پیٹنا، چہرہ پر مارنا، گریباں پھاڑنا اور نوحہ گری وغیرہ۔ پس یہ گریہ وزاری کی رسمیں مطلقاً حرام ہیں اور کسی کی موت پر اس طرح کے کام بالکل درست نہیں ہیں۔

**تیسری صورت:** ایّام مذکورہ میں سوگ کی رسمیں ہیں، جس کی حقیقت کسی کے

انتقال پر رنج وغم کے اظہار کے لیے مباح چیزوں کا ترک کرنا ہے، بعض جہلاء کبھی کبھی فرائض وواجبات تک کو چھوڑ دیتے ہیں اس کی برائی بالکل ظاہر ہے۔

جہاں تک جائز چیزوں کے چھوڑنے کی بات ہے تو اس سے مراد حلال زینت کا چھوڑنا ہے مثلاً مرد کنگھی نہ کریں، سفید اور عمدہ لباس نہ پہنیں، سرمہ نہ لگائیں، خوشبو نہ استعمال کریں اور اسی طرح کسی کی صحت وخیریت نہ دریافت کریں وغیرہ اور ایسے ہی عورتیں بناؤ سنگھار چھوڑ دیں، رنگین کپڑا نہ پہنیں، مہندی نہ لگائیں اور ان کے علاوہ اسباب زینت میں سے کوئی بھی سبب نہ اختیار کریں، اس سوگ کی حرمت قرآن وحدیث میں صراحتاً موجود ہے۔ البتہ ہر مردہ کی موت پر تین دن تک سوگ جائز ہے اگر نہ ہو تو اچھا ہے اور اگر ہو تو کوئی گناہ نہیں، اور عورت کے واسطے شوہر کی موت پر چار مہینے دس دن سوگ کرنا فرض ہے، اگر وہ سوگ نہ منائے تو گنہگار ہوگی، اس کے علاوہ ہر سوگ حرام اور گناہ ہے خواہ پیغمبر پر ہو یا صدیق پر وفات کے دنوں میں یا شہید پر ہو، شہادت کے ایام میں یا ان کے علاوہ کوئی اور ہوں، کسی بھی شخص کی اس حکم میں کوئی تخصیص نہیں ہے۔ لہٰذا عشرۂ محرم میں جو شخص کسی جائز کام کو اظہار مصیبت کی نیت سے چھوڑے گا وہ گنہگار اور حرام کا مرتکب ہوگا، لیکن اگر اس نیت کے بغیر چھوٹ جائے تو کوئی گناہ نہیں ہوگا، مثلاً کسی شخص کی سرمہ لگانے کی عادت نہیں ہے اگر وہ ان ایاّم میں بھی سرمہ نہ لگائے تو گنہگار نہیں ہوگا اور جس شخص کی سرمہ لگانے کی عادت ہے وہ اگر ان دنوں میں سرمہ نہ لگائے تو ارادۂ مذکورہ کا سبب قوی ہے اور وہی ارادہ مدار گناہ ہے۔

خلاصۂ کلام یہ کہ مدار نیت پر ہے اور ہر شخص اپنی نیت سے بخوبی واقف ہوتا ہے، باقی وہ صورت جس کی حقیقی کیفیت میں شبہ ہو جیسے کوئی شخص محرم کے دنوں میں جائز چیزوں کو چھوڑتا ہے لیکن سوگ کی نیت سے نہیں بلکہ اس کا مقصد اہلِ بدعت کی طعن وتشنیع سے بچنا ہوتا ہے کہ اگر وہ ان مباح چیزوں کو نہ چھوڑے تو اہلِ بدعت اس پر لعن طعن کریں گے بلکہ سارے عوام الناس اس پر اہل بیت سے بغض وعداوت کی تہمت لگا کر اس کو برا بھلا کہیں گے

اور حقارت کی نظر سے اسے دیکھیں گے یا اس کو دنیاوی نقصان پہنچائیں گے، اس ارادے کے ساتھ اگرچہ جائز کاموں کو چھوڑنا حرام نہیں، لیکن نقصان سے خالی بھی نہیں ہے، اس لیے کہ ایک ایسی چیز کا ارتکاب ہے جو بظاہر حرام نظر آتا ہے اور اس سے بدعتیوں کی موافقت لازم آتی ہے اور آنے والی نسل اس کے اس فعل کی جو بالکل حرام ہے، پیروی کرے گی اور پچھلے لوگ اس کے اس عمل کو حجت اور دلیل بنا کر اپنے برے ارادوں کو اس میں شامل کریں گے۔

اور اہل بدعت کے برا بھلا کہنے کا عذر قابل قبول نہیں ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"وَلَتَسۡمَعُنَّ مِنَ الَّذِيۡنَ اُوۡتُوا الۡكِتٰبَ مِنۡ قَبۡلِكُمۡ وَمِنَ الَّذِيۡنَ اَشۡرَكُوۡۤا اَذًى كَثِيۡرًا ‌ؕ وَاِنۡ تَصۡبِرُوۡا وَتَتَّقُوۡا فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنۡ عَزۡمِ الۡاُمُوۡرِ." (۱۰۷)

دنیاوی نقصان اہل بدعت کی مشابہت سے بہتر ہے، امور دینیہ میں اس کا لحاظ کرنا کمال ایمان سے محرومی اور نقصان ایمان کا باعث ہے، البتہ اگر اس قدر تساہل دینی مفاد کے لیے ہو مثلاً اہلِ بدعت کی ملامت سے بچنے کا راستہ اختیار کرنا ان کی توبہ کی امید میں ہو، تو کوئی مضائقہ نہیں۔

**چھوتھی صورت:** جو دوسری صورت کی ایک باریک شاخ ہے، وہ مجلس منعقد کر کے شرح وبسط کے ساتھ واقعاتِ شہادت کا اس نیت کے ساتھ ذکر کرنا ہے کہ لوگ انھیں سنیں اور حسرت وافسوس اور گریہ وزاری کریں، اگرچہ ان باتوں میں بظاہر کوئی برائی نظر نہیں آتی ہے، لیکن حقیقت میں یہ بھی برا اور ناپسندیدہ ہے، اس لیے کہ حدوثِ صدمہ یا اس کے تذکرہ کے وقت "إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ" (۱۰۸) پڑھنے اور صبر کرنے کا حکم دیا گیا ہے نہ کہ حسرت وافسوس اور تکلیف کے اظہار کا مطالبہ کیا گیا ہے، لہٰذا مصیبت پیش آنے یا اس کا خیال گزرنے کے وقت جو کچھ صابرین کا طریقہ ہے گرچہ زحمت کے ساتھ ہو، اسے اختیار کرنا چاہیے، آہ وفغاں اور جزع وفزع یقیناً اللہ تعالیٰ کے صابر بندوں کے طریقے کے خلاف ہے۔

جو لوگ ان صورتوں کے مرتکب ہوتے ہیں وہ اپنے دل میں ان کو حضرت امام

حسن اور حضرت امام حسین رضی اللہ عنہما کی انتہائی محبت اور کمال بزرگی کا موجب خیال کرتے ہیں، یہ ایک صریح مغالطہ ہے، اس لیے کہ مصیبتوں کا بار بار تذکرہ اور تکرار مصیبت زدگان کی ناراضی کا سبب ہوتا ہے، یہ ایک مصیبت تھی جو گزر گئی، اب اس کے ذکر کرنے میں کوئی فائدہ نہیں۔ جو بھی صحیح العقیدہ مسلمان سنے گا اسے رنج وملال ہوگا۔ اسی پر حضرات اہل بیت رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی حالت کو قیاس کرنا چاہیے کہ اگر بالفرض وہ حضرات ان باتوں کو سنیں تو انھیں غم واندوہ ہوگا۔ اور اگر ماتمی لوگ اس نکتہ پر غور کریں کہ چند روز کی یہ ظاہری رنج ومصیبت حضرت سید الشہداء امام حسینؓ اور تمام شہدائے کربلا اور مشہد مقدس کے سارے حاضرین کے مرتبے کی انتہائی بلندی کی باعث ہوئی تو چنداں غم کی بات نہیں، بلکہ خوشی ومسرت کا مقام ہے۔ جو لوگ اپنے باطل وناروا خیال کی بنیاد پر خود کو عاشقانِ اہل بیت رضی اللہ تعالیٰ عنہم قرار دے کر صریح غیر شرعی اور حرام کاموں کا ارتکاب کرتے ہیں وہ بارگاہ اہلِ بیت سے دھتکارے ہوئے، مردود ہیں۔

اس لیے کہ ان بزرگوں نے شرعی احکام کو قائم کرنے اور غیر شرعی امور کو ختم کرنے کے لیے ہی قربانیاں پیش کی تھیں، پھر جو شخص بیان کردہ باتوں کو عملی جامہ پہنا کر انھیں خوش کرنا چاہے وہ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے مدمقابل یزید کے درجے میں ہے، اس لیے کہ یزید سے مقابلے کا باعث اس سے غیر شرعی باتوں کا صدور ہی تھا اور یہ شخص بھی برائیوں کا ارتکاب کرتا ہے، ان پر اصرار کرتا ہے اور ان بری باتوں کو بہتر اور عبادت تصور کرتا ہے۔ تو کیا ایسا شخص حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے دربار سے دفع کیے جانے کا مستحق نہیں ہوگا؟ اور آپؓ کے دشمن وبدخواہوں کی فہرست میں شامل نہیں ہوگا؟

اصل یہ ہے کہ مسلمان کے واسطے برے خیالات کی پیروی زہر قاتل ہے، لہٰذا حکم شرعی کو واجب الاتباع جان کر ہرگز اسے نہ چھوڑے اور چوں کہ شارع نے آہ وفغاں، ماتم اور سوگ کی رسموں میں سے کسی چیز کی اجازت نہیں دی اور مطلقاً ان سب سے منع فرما دیا ہے، لہٰذا

اپنی محبت کے گمان پر ان ناجائز کاموں کا ارتکاب کرنا اپنی ناقص عقل کو حکم شرعی پر ترجیح دینا ہے۔ بہت ایسا ہوتا ہے کہ نفس کے بہکاوے کی بنا پر اپنی مخفی بری صفات معلوم نہیں ہوتی ہیں اور ایک صفت دوسری صفت کے مشابہ نظر آتی ہے، جیسے وہ بیمار جو اپنے آپ کو تندرست سمجھتا ہو۔

مدعیانِ محبت جو ان کاموں کو کرتے ہیں، ان کے دعوے کو جھٹلانے والی بہت سی علامتیں موجود ہیں، کیوں کہ ہر شخص جانتا ہے کہ گریہ وزاری، فضول خرچی، پر شکوہ محفل آرائی اور تعزیہ سازی سے حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ خوش نہیں ہوتے ہیں اور نہ انھیں کوئی فائدہ پہنچتا ہے۔ لہٰذا ان کا یہ دولت خرچ کرنا صرف خواہش نفسانی کی بنا پر ہے کہ مذکورہ بالا امور ان کے نفس کو پسند اور ان کی طبیعت کے مناسب ہیں، لہٰذا حقیقت میں نفس اور شیطان کو خوش کرنا ہے، لیکن لوگ شیطانی مکر وفریب کے جال میں پھنس کر ان کاموں کو حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی خوشنودی کا سبب سمجھتے ہیں۔ نیز اس جھوٹے دعوے کے ساتھ کہ یہ تمام مصارف اور حرکات وسکنات امام حسین سے محبت کی بنا پر ہیں، ان برے افعال کو جاہلوں اور نادانوں کی نگاہ میں مزین ومستحسن کر کے پیش کرتے ہیں، کیوں کہ اگر امام حسین رضی اللہ عنہ کی محبت وخوشنودی مقصود ہے تو کیوں اس مال کو ضرورت مند سادات پر خرچ نہیں کرتے ہیں؟ اور کیوں ان سادات کی تعظیم وتوقیر نہیں بجالاتے ہیں، اور ہر جگہ اشتباہ نسب کا عذر پیش نہیں کیا جاسکتا، بسا اوقات صحیح النسب سید بھوک کی وجہ سے اپنی جان جان آفریں کے سپرد کر دیتا ہے اور یہ نام نہاد محبین اہلِ بیت اور لمبی لمبی ڈینگیں ہانکنے والے انھیں جانتے اور پہچانتے ہیں، لیکن اس کے باوجود اپنے غلاموں بلکہ اپنے کتوں کے برابر بھی ان کی خبر گیری نہیں کرتے ہیں، شیعوں کی طرف سے سادات کے بارے میں اس طرح کی بے اعتنائی اور بے توجہی پائے جانے کے باوجود انھیں محبین ومخلصین تصور کرنا فقط جہالت اور محض نادانی ہے۔

حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ سے سچی محبت کی نشانیاں یہ ہیں:

۱- دین اسلام کی نشر واشاعت میں جان ومال کی قربانی پیش کرنا۔

۲- احکام شرعیہ کو پھیلانا اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر میں کسی کی کوئی پروا نہ کرنا۔

۳- کافروں، فاسقوں اور بدعتیوں پر کھلم کھلا نکیر کرنا۔

۴- ان کی چاپلوسی اور خوشامد سے بالکل احتراز کرنا۔

۵- دین میں مداہنت وحق پوشی کو قطعاً جگہ نہ دینا۔

۶- آں جناب ؓ کی بزرگ اولاد کو ترجیح دینا اور ان کے لیے ایثار کا مظاہرہ کرنا۔

۷- قولی، فعلی اور مالی عبادت کا ثواب آپ ؓ کی مقدس روح کو پہنچانا۔

جو شخص ان باتوں میں کوتاہی کرے اور حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کا نام لے کر اپنی خواہشات نفسانی کی تکمیل میں کوشش کرے اور مال صرف کرے، وہ بے جا و بے محل جھوٹ باندھ کر اپنے انجام کی تباہی وبربادی سے بے خوف ہو گیا ہے۔

"أعاذنا اللّٰه تعالىٰ وجميع المؤمنين من شرّ المنافقين الضآلّين". (۱۰۹)

# تیسری ہدایت

## رسوم وبدعات کا ذکر

اس میں ایک تمہید، دو افادات اور ایک فائدہ ہے:

### تمہید: خوشی اور غم کی رسموں کا بیان

جو رسمیں خوشی اور غم کے موقع پر ہندوستان میں رواج پا گئی ہیں اور ان کا اہتمام لوگوں کے اذہان میں رچ بس گیا ہے، انھیں چھوڑنا سماج کی مخالفت اور طعن وتشنیع کے سبب انتہائی دشوار ہوتا ہے اور جہلائے قوم ان رسموں کو واجبات شرعیہ پر مقدم کرتے ہیں اور ان کے ترک کو محرمات شرعیہ سے زیادہ برا سمجھتے ہیں، وہ رسمیں امورِ دین ودنیا کی بربادی کے باعث ہیں؛ کیوں کہ وہ انسان کو انتہائی تنگی وپریشانی میں ڈالتی ہیں اور دین ودنیا کی ضروری باتوں سے انھیں روکتی ہیں مثلاً دھوم

دھام سے تقریب ختنہ کا اہتمام اس حد تک پہنچ گیا ہے کہ غیر مختون بالغ بڑی عمر کا ہو جاتا ہے اور اس کے بعد ختنہ ہوتا ہے جو بے حیائی اور بے پردگی کا سبب بنتا ہے اور کبھی کبھی یہ اسلامی شعار باقی ہی رہ جاتا ہے۔ اسی طرح تقریب شادی خانہ آبادی میں تاخیر جوان مرد کی حرام کاری کا سبب بنتی ہے، بلوغت، قوّت جوانی اور نشاط کے بعد ایک لمبے عرصے کا انتظار اور شہوت رانی سے صبر مشکل ہوتا ہے۔ اسی طرح سے غم کے موقعوں پر اگر چہ ان میں تاخیر کی گنجایش نہیں، لیکن ان رسموں کا التزام کرنا ضروری کاموں میں خلل ڈالتا ہے، رسوم کے پابند لوگ تجہیز و تکفین اور قبر کھودنے میں سستی کرتے ہیں اور اسی پر اکتفا کر کے سنت کی ادائی سے کوتاہی کرتے ہیں اور طعن و تشنیع کے ڈر سے تیجے و چالیسویں کے کھانے کی تقسیم میں خوب فراخ دلی اور کشادہ دستی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

تعزیت و تہنیت اور عرسوں کی پابندی کی وجہ سے حقوق واجبہ کی ادائی سے کوتاہی کرتے ہیں اور گنہگار بنتے ہیں، بہت ایسا ہوتا ہے کہ ترک رسم کی خجالت و عار انسان کو ہلاکت کے گڑھے میں ڈال دیتی ہے اور وہ شخص اپنے اسباب معیشت کو فروخت کر کے کنگال و تہی دست ہو جاتا ہے، نان شبینہ کا محتاج ہو کر گداگری کرنے لگتا ہے اور گداگری جو کہ دنیا و آخرت دونوں جہاں میں ذلت و رسوائی کی باعث ہے، اس کو اپنے اوپر گوارہ کرتا ہے۔

یہ سب مفاسد صرف لوگوں کے اذہان میں ان رسموں کے التزام راسخ ہونے اور انھیں چھوڑنے والوں کو ہدف ملامت بنانے کی وجہ سے ہے، مثلاً اگر کوئی دانستہ نماز چھوڑ دے تو اس کی اس قدر ملامت نہیں کی جائے گی جس قدر ملامت عرس اور شادی بیاہ کی محفل میں رقص و سرود چھوڑنے کی بنا پر کی جاتی ہے، اسی لیے ایسے لوگ کھانا کھلانے میں بہت تکلف کرتے ہیں اور شادی کی محفلیں سجانے، سنوارنے میں خوب جد و جہد کرتے ہیں، حالاں کہ کم سن بچے بھوک سے جاں بلب ہوتے ہیں، اور انتہائی جہالت و نادانی کی بات یہ ہے کہ وہ اس غیر معقول کام کو اپنی کمال مروّت و جواں مردی خیال کرتے ہیں، اور ایسی ضرورتیں پیش آنے کے وقت کسی بھی جگہ سے مال لینے میں کوئی جھجھک نہیں محسوس کرتے

ہیں اور حلال وحرام کی تمیز نہیں کرتے اور جب مال حاصل ہوجاتا ہے تو صریح خلاف عقل وشرع جگہوں میں اسے خرچ کرتے ہیں، صرف شیطانی راستے میں اسے لٹاتے ہیں۔

حاصل کلام یہ کہ ان رسموں کے التزام واہتمام کی بنیاد دنیاوی غیرت وعزت اور فانی نام ونمود پر ہے، اور جس کام کی بنیاد ایسی چیزوں پر ہو، وہ کام حق تعالیٰ کی رضا کا باعث نہیں ہوسکتا۔ بلکہ عالم ملکوت سے اس کام اور اس کے کرنے والوں پر نفرت ولعنت کی آوازیں آتی ہیں اور اس کا مشاہدہ مومنِ کامل کے صاف باطن پر ظلمت وکدورت کا باعث ہوتا ہے، اور اس کا مرتکب قیامت کے دن مؤاخذہ ومحاسبہ سے ہم کنار ہوگا کہ کیوں اس قدر زرکثیر بے جا و بے محل خرچ کرکے إخوان الشیاطین (شیطان کے بھائیوں) کے زمرے میں شامل ہوا۔

اور اکثر باوجود غیر شرعی امر کے ارتکاب اور حرام سے بے پروائی کے، مجبور ہوکر وہ رسمیں ان کو چھوڑ دینی پڑتی ہیں۔ پس اگر ابتدا ہی میں اپنے اختیار سے بغیر کسی مجبوری کے انھیں چھوڑ دیتے تو یہ عمل ان کی دنیا وآخرت کی کس قدر اصلاح کا موجب ہوتا اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی انھیں نصیب ہوتی۔ لہٰذا طالب راہِ حق کو چاہیے کہ ان بری رسموں سے علاحدہ اور کنارہ کش ہوکر اپنے گھر، خاندان، کنبہ، قبیلہ، محلّہ، گاؤں، شہر اور ملک سے انھیں مٹانے اور ختم کرنے کی حتی المقدور کوشش کرے، اگر یہ کام درست نیت کے ساتھ ہو تو اسے اجر وثواب ملے گا اور اس سلسلے میں متردد نہ ہو کہ میری محنت کی قدر نہیں کی جائے گی یا میرے اعزاء واقارب میری بات نہیں مانیں گے، ان فاسد گمان کی بنا پر مرضیِ خداوندی کی پیروی میں کوتاہی کرنا بہت ہی برا ہے، جب یہ کام صحیح ہے تو پھر کس کی فکر اور کس کا ڈر؟ ان رسومات کو مٹانے اور انھیں نیست ونابود کرنے میں اس طریقے کو اختیار کرنا چاہیے جو دوسروں کی پیروی کا سبب اور شریعت کے خلاف نہ ہو، تاکہ حدیث شریف کے اس ٹکڑے "خیر الھدی ما اتبع" (۱۱۰) (بہترین طریقہ وہ ہے جس کی پیروی کی جائے) کے مضمون کے مطابق وہ طریقہ کارگر اور مفید ثابت ہو۔

اور یہ نہ سمجھے کہ کھانا اور فاتحہ خوانی کے ذریعے مردوں کو ثواب پہنچانا جائز نہیں، بلکہ یہ کام تو بہت اچھا اور افضل ہے، ہمارا مقصد یہ ہے کہ رسم کے ساتھ مقید نہیں ہونا چاہیے۔ دن، تاریخ، جنس اور قسم طعام کی تعیین کے بغیر، جس وقت اور جس قدر جو چیز بڑے ثواب کا موجب ہو، عمل میں لائے اور جب میت کو نفع پہنچانا مقصود ہو تو کھانے ہی میں اس کو منحصر نہ گمان کریں اگر میسر ہو تو بہتر ہے ورنہ صرف سورۂ فاتحہ اور سورۂ اخلاص کا ثواب بہترین ثواب ہے۔

تاریخ، دن، قسم طعام اور اس کی صورت کی تعیین میں پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور ان باتوں کا اہتمام تضیع اوقات کا سبب بنتا ہے اور دوسرے اہم کام بے کار و معطل ہو جاتے ہیں، اور یگانہ، بیگانہ اور متعلقین و غیر متعلقین اس دن و تاریخ کا انتظار کرتے ہیں اور رشتہ دار جمع ہوتے ہیں اور انسان کو خواہ مخواہ دشوار کاموں کو انجام دینا پڑتا ہے۔ لہٰذا مردہ کے حق میں تجہیز و تکفین اور تدفین کے بعد بجز دعا اور تعزیت کے کسی بھی رسم کو نہیں اختیار کرنا چاہیے۔

اسی طرح شادی میں بجز ولیمہ کے جو کہ سنت مؤکدہ ہے اور اس قسم کی جو بات اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے بس اسی کو اختیار کرنا چاہیے، اس کے علاوہ تمام رسموں کو بالکلیہ چھوڑ دینا چاہیے۔ خلاصۂ کلام یہ کہ محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کو پوری انسانیت کا پیشوا اور محبوب مطلق ہستی تسلیم کرکے دل و جان سے اس پر راضی رہیں اور ہند و سندھ اور فارس و روم کی ان تمام رسموں کو جو کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے کے خلاف ہوں، یا صحابۂ کرام کے عمل سے زائد ہوں، ترک کر دیں اور ان پر انکار و ناپسندیدگی کا اظہار کریں۔ اور وہ رسمیں جو زمانۂ جاہلیت میں رائج تھیں اور عہد نبوی میں ختم ہو گئیں اور ان کی تردید میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام کی طرف سے تاکیدات منقول ہیں؛ اگر ان رسموں میں سے کوئی رسم جیسے دختر کشی یا جانوروں کو چھوڑنا رواج پا جائیں تو اس کے استیصال میں بھرپور جد و جہد کریں۔

## پہلا افادہ: نکاح ثانی سے بیواؤں کو روکنے کا بیان

جملہ رسوم فاسدہ میں سے جو رسم سب سے زیادہ برادران وطن سے میل جول کے

سبب ہندوستانی مسلم معاشرے میں پھیل گئی ہے وہ بیوہ عورتوں کو نکاح ثانی سے روکنا ہے، یہ بری رسم اس قدر رواج پا گئی ہے کہ اس شرعی امر بلکہ مستحب کام کو لوگ محرمات شرعیہ سے بڑھ کر حرام سمجھتے ہیں۔لہٰذا اس کے ازالے میں پوری پوری کوشش کرنی چاہیے۔اگر اس کے رشتہ داروں میں یہ رسم پائی جاتی ہو تو چاہیے کہ ہر صورت میں اس کی دوسری شادی کرادے اور اگر اس کے رشتہ دار اس کی بات نہ مانیں تو ان سے ملنا جلنا بند کردے، لیکن اس کے بعد بھی ان سے صلہ رحمی کرتا رہے۔ظاہر ہے کہ نکاح ثانی سے انکار غالبًا بلکہ یقیناً ہندوؤں کی رسمیں اختیار کرنے کی وجہ سے ہے، ورنہ اس کے علاوہ اور کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی، اور اگر ان رسموں کے ابطال میں بزرگوں اور بڑوں کے طریقے کو چھوڑنا لازم آئے تو بالکل نہ ہچکچائے اور اس کی کوئی پروا نہ کرے، اور حق خداوندی کو تمام اہل حقوق کے حق پر ترجیح دے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اپنے اہلِ خانہ سے قطع تعلق کو پیشِ نظر رکھے۔

دوسرا افادہ: نسب پر فخر کرنے کا بیان

جاہلیت کی باقی ماندہ رسوم میں سے جو رسم اس امت مرحومہ میں مکمل طور پر پھیل گئی ہے اور شریف خاندان کے لوگ مثلاً سادات اور پیرزادے اس میں گرفتار ہیں، وہ اپنے آباؤ و اجداد کی عمدہ صفات اور ان کے کارناموں پر فخر اور ان کی سفارش پر بھروسا ہے، یہاں تک کہ اس افتخار واعتماد کی وجہ سے ان لوگوں نے تواضع و انکساری جو کہ مسلمانوں کا شعار اور تقویٰ وصلاح جو کہ اہل ایمان کی سب سے بڑی خوبی ہے، انھیں بالکل فراموش کرکے، ان کی جگہ کبر ونخوت، اظہار بدعات وخرافات اور ارتکاب معاصی ومنکرات پر جرأت و بے خوفی اختیار کرکے اللہ اور اس کے رسول کے کلام کو پس پشت ڈال دیے ہیں، گویا کہ ان آیات کریمہ: "لَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَرَضِيَ لَهُ قَوْلًا" (۱۱۱) لَا تَجْزِیْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَیْئًا الآیة (۱۱۲) "فَاِذَا نُفِخَ فِی الصُّوْرِ فَلَا اَنْسَابَ بَیْنَهُمْ الآیة، (۱۱۳) "یٰاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ

وَّاُنۡثٰی وَجَعَلۡنٰکُمۡ شُعُوۡبًا وَّقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوۡا اِنَّ اَکۡرَمَکُمۡ عِنۡدَ اللّٰہِ اَتۡقَاکُمۡ" الآیة، (۱۱۴) "تِلۡكَ اُمَّةٌ قَدۡ خَلَتۡ لَهَا مَا كَسَبَتۡ وَلَكُمۡ مَّا كَسَبۡتُمۡ" (۱۱۵) اور حدیث "إنّ اللّٰه قد أذهب عنكم عبية الجاهلية وفخرها بالآبآء إنما هو مؤمن تقی أو فاجر شقی الناس كلهم بنو اٰدم واٰدم من تراب" (۱۱۶) اور ان جیسی دوسری آیتوں اور حدیثوں کو کبھی ہوش وحواس کے کانوں سے سنا ہی نہیں اور صرف اپنے وہم وگمان اور اپنے جیسے لوگوں کی باطل افواہوں اور فرضی باتوں پر اعتماد کر کے اپنی جان کو ہلاکت کے گڑھے میں ڈال رکھا ہے، اللہ اکبر! کیسی بیوقوفی ونادانی ہے کہ ان اسبابِ نجات کو جو کہ یقین اور قطعیت کے ساتھ نجات اور رفع درجات کے باعث ہیں، انھیں چھوڑ کر وہمی اور خیالی اسباب کو اختیار کیے ہوئے ہیں۔

ان جاہلوں کی نادانی کی تشبیہ اس شخص سے دی جاسکتی ہے جس نے اپنی خطیر رقم کو جو اس کے قبضے میں تھی اور جس سے فائدہ اٹھانا اسے قطعی ویقینی طور پر معلوم تھا، اس رقم کو کیمیا گری کے حیلے اور دست غیب کے اعمال کی تحصیل میں جس کا حاصل ہونا موہوم ہے، تباہ وبرباد کر دیا ہو۔

خلاصۂ کلام یہ کہ اگر بزرگوں کے ساتھ نسبی تعلق آخرت میں کام آنے والا ہے تو ظاہر ہے کہ اس سے غفلت اور اس کی طرف بے اعتنائی کسی بھی طرح سے اس کی افادیت میں خلل انداز نہیں ہوسکتی ہے، کیوں کہ نسبی تعلق امور اختیاریہ میں سے نہیں ہے جو بے توجہی اور لاپروائی کے سبب ختم ہو جائے، لہٰذا جب کسی غافل شخص کو نسبی تعلقات کی بنیاد پر آخرت میں نفع حاصل ہوگا تو یقیناً اسے نعمت غیر مترقبہ ہاتھ آنے کی وجہ سے بڑی ہی خوشی ومسرت حاصل ہوگی، اس شخص کی طرح جس کو اس کے آباء واجداد کے ترکے سے مال ملنے کی وجہ سے خوشی ہوتی ہے حالاں کہ وہ اس سے غافل تھا۔ اور اگر یہ بات بروز قیامت فائدہ دینے والی نہیں ہے اور اس شخص نے تمام عمر اس کے نفع کی امید میں گزاری ہو تو بے شک اسے

ندامت وشرمندگی کا سامنا کرنا پڑے گا اور وہ اپنے جہل مرکب کی وجہ سے قسم قسم کی جسمانی تکلیفوں اور روحانی سزاؤں سے ہمکنار ہوگا۔لہٰذا ایسے نسبی تعلقات کی طرف بے توجہی اور ان جیسی وہمی چیزوں پر عدم اعتماد بہر صورت اچھا اور بہتر ہے، والسلام علیٰ من اتبع الہدیٰ۔

## فائدہ: مخفی استعدادوں کا ذکر

معلوم ہونا چاہیے کہ بزرگوں کی اولاد میں مخفی استعدادیں میراث کے طریقے پر رکھی جاتی ہیں لیکن صرف وہ استعداد دنیا وآخرت کے معاملات میں سے کسی بھی معاملے میں مفید نہیں ہے، البتہ اگر اس استعداد کو استعمال میں لایا جائے اور وہ تعلیم وتعلم اور دینداری کے سبب جلوہ گر ہو، تو یقیناً عظیم کاموں کا مظہر اور بڑے منافع کا سرچشمہ ثابت ہوگی۔

اور ان مخفی استعدادوں کو ازلی استعدادوں کے قائم مقام باور کرنا چاہیے جو ازل میں اچھی یا بری استعداد ہر شخص کے حصّے میں آئی، البتہ صرف ان استعدادوں پر جزا وسزا کا مدار نہیں ہے جب تک ان استعدادوں کے آثار منصۂ شہود پر نہ آئیں، جزا وسزا کے نظام میں ان کی کوئی حیثیت نہیں، ہاں اس قدر یقینی ہے کہ ہدایت وگمراہی کے اسباب پائے جانے کے سبب فطری استعداد کے مطابق صلاح وفساد کے آثار ظاہر ہوتے ہیں، پس ثمرات کا ترتب درحقیقت آثار پر ہوتا ہے، اگرچہ استعدادوں کے ساتھ بھی ان کا مخفی ربط ہوتا ہے لیکن استعدادوں کے ساتھ نتائج کا تعلق بہت مخفی اور آثار کے ساتھ نمایاں ہوتا ہے جیسے منافع حرب کا، سامان جنگ کے ساتھ واضح ربط ہوتا ہے اور لوہے کے ساتھ پوشیدہ ہوتا ہے، لہٰذا زنگ خوردہ فولادی تلوار وہ کام نہیں کرتی ہے جو کام خام لوہے کی صیقل تلوار انجام دیتی ہے۔

# دوسری فصل

## تہذیب اخلاق وتزکیۂ نفس کا پس منظر

## اس فصل کے تحت دو ہدایات ہیں

## پہلی ہدایت: پسندیدہ اور ناپسندیدہ اخلاق کا اجمالی بیان

اس میں تین تمہیدات اور پانچ افادات ہیں:

### پہلی تمہید: اس بات کا ذکر کہ برے اخلاق فیض الٰہی کے نزول کو مانع ہیں

راہِ حق کے سالکین پر اللہ تعالیٰ کے الطاف وعنایات کے نزول سے سب سے بڑی رکاوٹ ان کے نفوس بہیمیہ کا برے اخلاق سے آلودہ ہونا ہے جیسے بخل، حسد، تکبر، حرام، غیبت، کینہ، ریا، جھوٹ، لالچ اور حرص۔

سلف صالحین ان رذائل سے تزکیہ کو ہر چیز پر مقدم اور انتہائی ضروری سمجھتے تھے اور ان کو صرف اللہ کی رضا کے لیے اپنے دل سے دور کر دیتے تھے، تا کہ ان کا کچھ بھی اثر باقی نہ رہے اور ان کے دل بالکل صاف وشفاف آئینے کی طرح ہو جائیں، اسی لیے وہ بے پایاں الطاف وعنایات کے مستحق ہوتے تھے اور اسی تصفیۂ قلب کی وجہ سے جس کو وہ حضرات اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے عمل میں لائے تھے، بارگاہِ الٰہی میں مقبول ہوتے تھے اور جو شخص باوجود مراتب سلوک طے کرنے کے عنایات خداوندی سے بہرہ ور نہ ہو تو یقیناً ان تمام رذائل یا ان میں سے بعض کے آثار اس میں موجود ہوں گے، پس ان رذائل کا وجود عنایات الٰہی کے لیے رکاوٹ ہے۔

دوسری تمہید: اس بات کا ذکر کہ تہذیب اخلاق کی طرف توجہ دینا ازحد ضروری ہے

سلف صالحین رحمہم اللہ کے واسطے بتوفیق الٰہی اخلاقی برائیوں سے تزکیۂ نفس کے سلسلے میں اسلامی نیک اعمال اور اپنے پیشواؤں کی صحبت کافی وشافی تھی، لیکن بعد کے دور میں اس فن کے اہل کمال نے ان کے اسباب وعلامات اور ان کے علاج کو طب کے طریقۂ علاج کی طرح تحقیق وتنقیح کر کے کتابیں مرتب کی ہیں، لیکن وہ کتابیں پوری وضاحت کے باوجود کفایت نہیں کرتی ہیں بلکہ کوتاہ ہمت افراد ان بڑی بڑی کتابوں کے مطالعے سے سمجھتے ہیں کہ یہ ان حضرات کے حالات زندگی ہیں جو گزر گئے اور جنت کو سدھار گئے، ان کی حقیقت کچھ اور تھی کہ وہ ان اعمال کثیرہ اور مشکل ریاضتوں پر ثابت قدم رہے اور اپنے آپ کو ان ریاضتوں سے بہت دور خیال کرتے ہیں۔ اور بعض افراد غلط فہمی بلکہ جہل مرکب کی وجہ سے خود کو ان رذائل سے علاحدہ اور محاسن سے آراستہ سمجھتے ہیں۔

لہٰذا اس زمانے کے لوگوں کے مناسب حال یہ بات کہ وہ جس طرح اشغال ومراقبات، معرفت الٰہیہ تک پہنچنے کے لیے کرتے ہیں اسی طرح ان باتوں کے لیے بھی مراقبہ کریں اور اس کے بغیر بارگاہِ قبولیت تک وصول کو ناممکن تصور کریں، اس کے بغیر اگرچہ معرفت کے مقام تک پہنچ جاتے ہیں لیکن عنایت وقبولیت کے دروازے سے نہیں بلکہ دوسرے راستوں سے وہاں تک پہنچتے ہیں جہاں مقبول اور غیر مقبول کا کوئی سوال ہی نہیں۔ نفس اور شیطان جو قبولیت حق کی بارگاہ کے دربان اور کتے کے درجے میں ہیں، وہ انھیں نہیں چھوڑتے ہیں کہ اس مقام تک رسائی حاصل کریں، اور نفس وشیطان کے شرور سے محفوظ رہ کر وہاں پہنچنا ممکن نہیں ہے مگر نیک اعمال اور درج بالا بدعادتوں سے علاحدگی اور اخلاق عالیہ سے آراستگی کے ذریعے۔ اخلاق فاضلہ سے آراستگی اور رذائل سے کنارہ کشی گلہ بان اور قائد کے مانند ہے جو خود بخود انسان کو مقام مقصود تک پہنچا دیتا ہے، اور کبھی کبھی اس کی بارگاہ سے ایک خاص انتخاب حاصل ہوتا ہے جو اعمال کی کثرت اور بہت ساری تکلیفیں

ومشقتیں جھیلے بغیراس کو درجۂ قبولیت پر فائز کر دیتا ہے، ایسے مقبول بندے تعلیم وتربیت کے محتاج نہیں ہوتے ہیں بلکہ خود اللہ تعالیٰ ان کا مربی ہوتا ہے اور کسی کی احسان مندی اور محنتیں اٹھائے بغیران کو عمدہ خصلتوں سے مزیّن اور بری عادتوں سے پاک کر دیتا ہے۔

بہر کیف اس (تحصیل قبولیت خداوندی) کا طریقہ یہ ہے کہ سب سے پہلے قرآن وحدیث پڑھنے کا اہتمام کرے اور اپنے کچھ اوقات کو قرآن وحدیث کے علم حاصل کرنے میں لگائے تا کہ فضائل ورذائل کی حقیقت سے واقفیت حاصل ہو، اور اپنی ضروریات حاصل کرنے کے لیے پریشان نہ ہو، اس کے بعد اس دھیان میں جو طریقۂ نقشبندیہ میں مقرر ہے جس سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات اقدس کا دھیان ہے، مشغول ہو اور اس کے ساتھ دوسرے دھیان کو ملا لے، اس سے مقصود احکام شرعیہ کی تعظیم کا دھیان اور ان کی تعمیل کا عزم مصمم اور ممنوعات شرعیہ کا دھیان اور ان سے اجتناب کا مضبوط ارادہ ہے۔ لہٰذا ہر وقت اور ہر جگہ خلوت میں ہو یا جلوت میں، کوچہ میں ہو یا بازار میں، مسجد میں ہو یا خانقاہ میں، کھانے پینے کی حالت میں ہو یا پیشاب پاخانہ کی حالت میں، دوست واحباب سے ملاقات کا وقت ہو یا دنیا وآخرت کے کسی کام میں مصروفیت کا، غرض ہر حالت میں اور ہر وقت ہوشیار و چوکنا رہے کہ ہرگز برائی کی طرف اس کے دل کا میلان نہ ہونے پائے اور شریعت میں جن باتوں کے کرنے کا حکم دیا گیا ہے ان کے اہتمام میں ہمیشہ چست وچالاک اور ہشاش وبشاش رہے اور جملہ شرعی باتوں میں سے اہم ترین احکام شرعیہ جیسے نماز اور تلاوت قرآن کا خاص طور پر اہتمام کرے اور ہر حالت میں اس کا دل نماز کی فکر میں لگا رہے اور جیسے ہی نماز کا وقت ہو یا اذان سنے اس سے غفلت نہ برتے اور کسی بھی کام کو نماز کی تیاری پر مقدم اور اس سے زیادہ ضروری نہ جانے، ہر چیز کے چھوٹ جانے کو ادائے نماز کے پہلو میں آسان اور ہلکا سمجھے۔

جیسے کوئی محبوب اپنے عاشق کے بلائے ہوئے وقت پر پہنچ جائے تو ناممکن ہے کہ وہ عاشق اس وقت کسی دوسرے کام میں مشغول ہو اگر چہ دوسرے ہزاروں کام فوت

ہو جائیں لیکن اس کے نزدیک محبوب سے بات چیت ہر چیز سے زیادہ مرغوب ہوگی۔

اسی طرح نماز کو بمقتضائے حدیث "قرة عینی فی الصلاة" (۱۱۷) (میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے) اپنی اصلی راحت وسکون کا ذریعہ تصور کرے اور دین ودنیا کے کسی بھی کام کو اس پر فوقیت نہ دے اور اس سے زیادہ اہم نہ خیال کرے۔ اسی طرح دوسرے ارکان جیسے روزہ، زکاۃ اور حج کا بھی بطور خاص اہتمام کرے اور جہاد کو بھی اہمیت دے جس کو "سِنامُ الإسلام" (۱۱۸) (اسلام کی چوٹی) کہا گیا ہے اور اس میں جان ومال خرچ کرنے اور تکلیف ومشقت اٹھانے سے محبت الٰہی کی حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے اور یہ بھی واضح ہوجاتا ہے کہ اس نے یہ سارے کام قصداً وارادۃً کیے ہیں۔

اور جب اس دھیان وخیال کی پابندی پر ایک عرصہ گزر جائے گا تو اس کی عادتیں عبادت بن جائیں گی مثلاً وہ نہیں کھائے گا مگر اس ارادہ ونیت کے ساتھ جو رضائے الٰہی کا ذریعہ ہو اور وہ نہیں سوئے گا مگر اس وقت جس وقت اس کا بیدار دل گواہی دے گا کہ اس وقت سونا حق تعالیٰ کی خوشنودی کا موجب ہے، انھیں پر دوسری باتوں کو قیاس کر سکتے ہیں۔ اس کے بعد اس کا دل خود بخود برائیوں سے پاک اور اچھائیوں سے مزین ہوجائے گا، جیسے شجاعت، قناعت، سخاوت، عفت وپاکدامنی، صبر وشکر، تقدیر پر رضامندی اور توکل وغیرہ حاصل ہوں گے۔ لیکن مستقل طور پر ان خوبیوں کے حاصل کرنے کا ارادہ کرے، تاکہ ہر خوبی میں اس کے بلند مقام پر فائز ہو، اور جب اپنے دل کو صاف کرکے احکام شرعیہ میں چست اور نشیط ہوکر راہِ سلوک طے کرے گا تو فضل الٰہی سے امید ہے کہ سلفِ صالحین کی طرح عنایات ربانی سے بہرہ ور ہوگا جس کے الطاف وعنایات کی کوئی انتہا نہیں، اس طرح کے جو حضرات ہوتے ہیں وہ اس کی کرم فرمائیوں سے نوازے جاتے ہیں اور جو لوگ اس کی عنایتوں سے محروم ہیں وہ اپنی کوتاہی سے محروم ہیں، کیوں کہ انھوں نے اس کی رضا کے راستے کو چھوڑ رکھا ہے اور آیت کا یہ ٹکڑا "وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ

یَظۡلِمُوۡنَ" (۱۱۹) اس بات کی گواہی دیتا ہے

ہر چہ ہست از قامت ناساز و بد انداز ماست
ورنہ تشریف تو بر بالائے کس کوتاہ نیست (۱۲۰)

اور وہ باتیں شریعت میں جن کا حکم دیا گیا ہے اور وہ باتیں جن سے منع کیا گیا ہے ان کی تفصیل طویل ہے، اس کا طریقہ جو سالک کے لیے ضروری ہے وہ یہ کہ کلام اللہ سے چمٹ جائے، اگر اسے یاد کر لے تو بہت بہتر اور اگر نہ کر سکے تو تلاوت قرآن میں پوری مہارت پیدا کرے اور اس کے معانی کو واضح کرنے والے ترجمے سے واقف ہو کر تدبر کے ساتھ تلاوت کرے، اور صرف اس کے الفاظ کی تلاوت کو بھی بڑی غنیمت شمار کرے کہ وہ بہترین عبادت اور تقرب الٰہی کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ قرآن مجید کی تلاوت اللہ تبارک وتعالیٰ کے ساتھ مناجات و سرگوشی ہے اور قرآن مجید اس کی صفات میں سے ایک صفت ہے جو معجز عربی کی عبارت کے لباس میں ظاہر ہوئی اور جب صفات خداوندی اس کے غیر نہیں ہیں تو تلاوت قرآن کے وقت ایک طرح سے خود کو اللہ تعالیٰ کے پاس موجود پائے اور بارگاہِ ایزدی میں رسائی، سرگوشی، ہم کلامی اور گفت وشنید کی لذتوں سے لطف اندوز ہو، غفلت کا پردہ سب سے بڑی رکاوٹ ہے، غفلت کا پردہ اٹھا اور واصل بحق ہو جا

حضور گر ہمی خواہی از و غائب مشو حافظ (۱۲۱)

## تیسری تمہید: اتباعِ حدیث کا بیان

فروعی مسائل میں مذاہب اربعہ کی پیروی جو سارے مسلمانوں میں رائج ہے، بہتر اور اچھی بات ہے لیکن اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے علم کو کسی ایک مجتہد کے علم میں منحصر نہ جانے بلکہ علم نبوی پوری دنیا میں پھیلا ہوا ہے، زمانہ کے حسب حال ہر شخص کو پہنچا ہے، اس کے بعد جب کتابیں تصنیف ہوئیں تو ان علوم کی وسعت ظاہر ہوئی، لہٰذا جس مسئلہ میں حدیث صحیح، صریح اور غیر منسوخ مل جائے اس میں کسی مجتہد کی پیروی نہ کرے اور محدثین کو اپنا

مقتدا جان کر دل سے ان سے محبت کرے اور ان کی تعظیم کو ضروری سمجھے کہ وہ علم نبوی کے حاملین ہیں اور ایک طرح سے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اٹھا کر کے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقبول امتیوں کی فہرست میں شامل ہو گئے ہیں، اور اہل تقلید مجتہدین کی تعظیم و توقیر سے بخوبی واقف ہیں انھیں اس پر آ گاہی کی کوئی ضرورت نہیں۔

## پہلا افادہ: اس بات کا ذکر کہ امرا اور بادشاہوں کے لیے انصاف پروری تمام تہذیب اخلاق سے اہم اور افضل ہے

امرا، سلاطین اور حکمرانوں میں سے جو بتوفیق الٰہی راہِ سلوک میں قدم رکھے، باوجود یہ کہ سالکین کو تمام امورِ شرعیہ کا اہتمام کرنا چاہیے، اس کے واسطے عدل وانصاف کا اہتمام زیادہ ضروری ہے اور اس کے لیے عدل گستری سب سے بڑی عبادت ہے، عدالت کے باب میں گزشتہ بادشاہوں کے آئین کی رعایت نہ کرے، بلکہ عدالت وسیاست میں خلفائے راشدین کی پیروی کرے، سیرت شیخین یعنی حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کی سیرت ان کے لیے کافی ہے۔ بادشاہوں اور ان خلفاء کے آئین کے درمیان فرق یہ ہے کہ بادشاہ دنیا کی اصلاح کو ترجیح دیتے ہیں اور آخرت کی کوئی پروا نہیں کرتے اور خلفاے راشدین باوجود دنیاوی کمال انتظام کے دین کو ہرگز ہاتھ سے جانے نہیں دیتے اور اس کی اصلاح وترقی کو ہر چیز پر مقدم اور ہر چیز سے اہم خیال کرتے ہیں اور سلاطین وامرا اپنی عزت ظاہری شان وشوکت، مکان و پوشاک اور سواری میں گمان کرتے ہیں حالاں کہ یہ بالکل غلط ہے، جس قدر وہ دین داری میں صلابت اختیار کریں گے اسی قدر اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے ان کی عزت وشوکت اور ان کے دشمن کے دلوں میں ان کا رعب ودبدبہ زیادہ ہوگا۔

## دوسرا افادہ: کبر اور فساد انگیزی کا ذکر

ہر مسلمان کو دو چیزوں سے پرہیز کرنا واجب ہے، اوّل: تکبر، تکبر یہ ہے کہ آدمی خود کو سب سے بڑا اور اچھا جانے اور ہمیشہ اپنی بڑائی و بزرگی کا طالب رہے، کیوں کہ یہ بری خصلت

انسان کو کبر تک پہنچا دیتی ہے، اس لحاظ سے یہ دیگر اعمال وخصائل سے زیادہ مذموم ہے، حدیث شریف میں ہے: "لا يدخل النار أحد في قلبه مثقال حبّة من خردل من إيمان ولا يدخل الجنة أحد في قلبه مثقال حبّة من خردل من كبر." (۱۲۲)

دوسری چیز مسلمانوں کی کسی جماعت میں فساد واختلاف کو ہَوا دینا ہے اور زمان ومکان کی عمومیت وخصوصیت کے لحاظ سے اس فساد انگیزی کے کئی درجے ہیں:

۱- ایک اہلِ خانہ کے درمیان تفرقہ ڈالنا۔

۲- دوسرا شہر والوں کے درمیان فساد کرانا۔

۳- تیسرا ملک والوں میں باہمی بغض ونفرت کی آبیاری کرنا۔

۴- چوتھا چند ممالک کے درمیان فساد برپا کرانا۔

اور اسی طرح سے ایک صدی یا دو صدی یا اس سے زیادہ صدیوں تک فساد کا سبب بنے رہنا۔ ان میں سب سے بڑی شرانگیزی وہ ہے جس کا اثر عرصۂ دراز تک باقی رہے، جیسے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے موقع پر بلوائیوں کا فتنہ کہ اس کا اثر اس امت کے تمام زمانوں پر محیط رہا ہے۔ اور یہ سب سے پہلا انتشار ہے جو امت میں رونما ہوا۔ فساد کی بہت سی قسمیں ہیں، کبھی قتل کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے، کبھی عیب جوئی کے لباس میں جلوہ گر ہوتا ہے اور کبھی برے مشورے کی شکل میں ہویدا ہوتا ہے، اور یہ باتیں بھی اشخاص کی نسبت فساد کے بڑے اور چھوٹے معنی میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ مثلاً ایک محلّہ کے رئیس کو مار ڈالنا جس کے سپرد دین ودنیا کے انتظامی امور ہوں، ایک درجہ رکھتا ہے اور دوسری طرف منتظم، انصاف پرور بادشاہ کو قتل کرنا جو پوری خلقت کی پریشانی کا باعث ہو، یہ ایک ایسا افساد ہے جس کی برائی قسم اوّل کی برائی سے ہزار گنا زیادہ ہے۔

اسی طرح کسی ایسی مسجد کے متولی کو مار ڈالنا جس کی وجہ سے چند افراد مسجد میں نماز کے لیے جمع ہوتے ہوں ایک برا عمل ہے، اور کسی ایسے عالم باکمال کو مار ڈالنا جو دینی

مشکلات کا حل نکالتا ہو اور مرجع خاص و عام ہو کر وقت کا امام اعظم، بخاری دوراں اور غزالی زماں بنا بیٹھا ہو، ایسی قباحت رکھتا ہے جس کی کوئی حد نہیں۔ اسی کشت و خون پر توہین اور تجسّس عیوب کو قیاس کر لینا چاہیے۔ جس قدر فساد بڑا ہوگا اسی قدر ایمان کا نقصان ہوگا، اور اس برے کام کے زیادہ مذموم ہونے کی وجہ یہ ہے کہ فتنہ و فساد برپا کرنے والا لوگوں کے حقوق تلف کرنے اور بہت سے گناہوں کے بیج بونے کا سبب بنتا ہے جس کا اثر مدتوں باقی رہتا ہے اور مفسد فتنہ انگیز پر اس کا وبال اس قدر ہوتا ہے کہ وہ غضب الٰہی کا شکار ہو کر برے انجام اور سوء خاتمہ کے ساتھ دنیا سے رخصت ہوتا ہے اور مغفرت و رحمت خداوندی سے محروم ہوتا ہے۔

اور ظلم و زیادتی سے بھی احتراز کرنا لازم ہے کیوں کہ درحقیقت ظلم کا منشا تکبر ہوتا ہے یا فساد، لہٰذا ظلم و تعدی میں کبر کا حصّہ ہوتا ہے یا فساد انگیزی کا اور کبر و فساد انگیزی سے کلی علاحدگی نہیں ہو سکتی ہے مگر ظلم سے اجتناب کے ذریعے، حدیث شریف میں ہے: "ألا أخبركم بأفضل من درجة الصيام والصدقة والصلاة قالوا بلىٰ! قال: إصلاح ذات البين، وإفساد ذات البين هي الحالقة." (۱۲۳)

تیسرا افادہ: صبر اور قضا و قدر پر رضا مندی کا ذکر

مسلمان کو پریشانی اور مصیبتوں میں بھروسا و تسکین خاطر کے لیے اور غیر متناہی نعمتوں میں سے ہر ایک نعمت کی شکر گزاری خصوصاً ان نعمتوں کی قدردانی کے لیے جو بمقتضائے مقولہ "إن لله في أيّام دهركم نفحات ألا فتعرضوا لها" (۱۲۴) خوشگوار جھونکے فضا میں گردش کرتے رہتے ہیں اور بجز عالی دماغ افراد کے دماغ کے جو خاص رحمت الٰہیہ کے مورد ہو گئے ہیں کسی اور دماغ کو میسّر نہیں ہوتے ہیں، اس قادر مطلق کی قدرت کا یقین جیسا کہ چاہیے اپنے دل میں نقش کرنا انتہائی ضروری ہے کیوں کہ اسی یقین کے فقدان کی وجہ سے ایک گروہ کو باوجود اہل کتاب کے نام سے موسوم ہونے کے کتاب مہیمن میں "وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ اِذْ قَالُوْا مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى بَشَرٍ

مِّـنْ شَيْئٍ " (۱۲۵) کے داغ سے داغدار کیا گیا اور دوسرے گروہ جو پوری دنیا میں مشرکین کے نام سے مشہور ہیں، ان کے انجام بد کی برائی کے ذیل میں "وَمَـا قَـدَرُوا اللّٰـهَ حَقَّ قَدْرِهٖ وَالْاَرْضُ جَـمِيْـعًـا قَبْـضَتُـهٗ يَـوْمَ الْقِيٰمَةِ وَالسَّمٰوَاتُ مَطْوِيّٰتٌۢ بِيَمِيْنِهٖ سُبْحَانَهٗ وَتَعَالٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ "(۱۲۶) کی علامت کو جو کہ سخت انتقام کی نشانی ہے، واضح کیا۔

لہٰذا معلوم ہونا چاہیے کہ بقدر لیاقت قدرت کاملہ کی معرفت ویقین، ایمان کا بنیادی حصہ ہے، ہر مسلمان جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے، لیکن یہ معرفت اس کے فہم وشعور پر حاوی اور اس کے دل ودماغ پر منقش نہیں ہوتی ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ جب وہ کوئی عجیب وغریب بات سنتا ہے تو اس کا انکار کر بیٹھتا ہے، البتہ اسلامی عقیدہ کی طرف رجوع کر کے ایسا انکار نہیں کرتا ہے جو اس کو دائرۂ اسلام سے کھینچ کر کفر کے گڑھے میں پھینک دے لیکن اس کے دل سے ناممکن کا تصور دور نہیں ہوتا ہے، اگر چہ قدرت الٰہی کی اس قدر معرفت ایمان کے لیے کافی ہے لیکن جو کچھ اس مقام میں مطلوب ہے وہ ایسی معرفت ہے جو اس مرتبہ سے انتہائی بلند ہوتی ہے یعنی ایسی معرفت جو اس کے فہم وشعور پر حاوی اور اس کے دل پر محیط ہو اور وہ جو بھی بات سنے اگر چہ وہ انتہائی تعجب خیز اور حیرت انگیز ہو یہاں تک کہ اگر کوئی کہے کہ آدھا آسمان ٹوٹ کر گر گیا ہے اور آدھا کھڑا ہے تو اس بات کو سن کر اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کے پیش نظر اس کا دل اس کو قبول کرے، البتہ دوسرے عقائد کی طرف مراجعت کے بعد کہ آسمان قیامت سے پہلے نہیں ٹوٹ سکتا اور قیامت کی یہ یہ نشانیاں ہیں جو اب تک واقع نہیں ہوئیں، اس خبر کو خلاف واقعہ خیال کرے، اسی طرح کی بات کو ثابت کرنے کے لیے حق تعالیٰ فرماتا ہے:

"اِنَّ اللّٰـــهَ يُمْسِكُ السَّمٰـوَاتِ وَالْاَرْضَ اَنْ تَـزُوْلَا وَلَئِنْ زَالَتَـا اِنْ اَمْسَكَهُمَا مِنْ اَحَدٍ مِّنْ بَعْدِهٖ اِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا" (۱۲۷) اس کا ترجمہ یہ ہے کہ بے شک اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو ٹلنے سے روک رکھا ہے اور اگر وہ اپنی جگہ سے

ہٹ جائیں تو اس کے سوا کوئی انھیں نہیں روک سکتا، وہ بڑا بردبار اور بخشنے والا ہے۔ یعنی آسمان وزمین کو اس کی جگہ سے کھسکانے سے اس کی صفت حلم ومغفرت مانع ہے، ورنہ اس کی قدرت وانتقام اس کام کے متقاضی ہیں، کسی بھی وجہ سے ان صفات میں کوئی کمی اور فتور نہیں ہے، اور اسی حقیقت کو ذہن نشیں کرنے کے لیے اس قسم کا مضمون حدیث شریف میں شام کی دعاؤں میں وارد ہوا ہے: "اَعُوذُ بِاللّٰہِ الَّذِیْ یُمْسِكُ السَّمٰوَاتِ اَنْ تَقَعَ عَلَی الْاَرْضِ اِلَّا بِاِذْنِہٖ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ وَذَرَأَ وَ بَرَأَ". (۱۲۸)

لہٰذا معلوم ہوا کہ قدرت کی معرفت کی انتہا یہ ہے کہ کوئی بھی معاملہ گو نہایت مشکل، دشوار اور نادر الوقوع ہی کیوں نہ ہو اس کے وقوع کی خبر سن کر اس کو واقع باور کرے اور یہ یقین اس کے دل سے اللہ تعالیٰ کی قدرت کے پیش نظر بلا تأمل سرزد ہو، البتہ اس واقعے کی تصدیق کے لیے مخبروں کی خبر کی سچائی کی تحقیق کرے اور اس کے بغیر حتمی طور پر اس پر ایمان نہ لائے، لیکن اس کے دل میں اس واقعے کے امکان کا خیال ہمیشہ رہنا چاہیے، اور اسی طرح اس کے تمام صفات کمال کو اسی پر قیاس کرنا چاہیے۔

## چوتھا افادہ: حق تعالیٰ کی محبت کا ذکر

ہر شخص اللہ تعالیٰ سے الفت ومحبت کا دعویٰ کرتا ہے، لیکن اس کی صداقت کم یاب بلکہ نایاب ہے، الفت ومحبت کی حقیقت یہ ہے کہ ایمان واعمال اور علم وعقائد کے ہر ایک باب میں اعلیٰ درجے پر فائز ہونے اور معاصی ومنکرات سے حد درجہ اجتناب کے باوجود اگر وہ مصائب وآفات سے دوچار ہو اس حد تک کہ اس کی جان، مال، اہل وعیال، قوم اور اس کی آبرو سب اس سے متأثر ہوں، اور وہ بدترین بیماریوں میں مبتلا ہو جائے اور ان بلاؤں میں پھنس کر دنیا کے سخت ترین عذاب سے دوچار ہو جائے، پھر بھی ہرگز حرف گلہ وشکوہ اس کے دل میں نہ آنے پائے، البتہ اللہ تعالیٰ کی عمومی رحمت ومغفرت پر اعتقاد کامل کے باعث بارگاہِ الٰہی میں جس قدر دعا والتجا، گریہ وزاری اور ان مصیبتوں کے عدم تحمل

سے بے قراری اور عاجزی کا اظہار کرے بہتر اور بجا ہے، بلکہ یہ اس کے کمال ایمان کا تقاضا ہے۔ ہاں اس ذات پاک کی نسبت شکوہ وشکایت سے ہمیشہ اپنے دل ودماغ کو پاک رکھے بلکہ ان مصائب کی نسبت اپنے عمل کی کوتاہی اور ازلی استعداد کی برائی کی طرف کرے اور آیت کریمہ: "مَا اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ وَمَا اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ" (۱۲۹) اور "وَمَا اَصَابَكُمْ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ"، "وَ يَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ" (۱۳۰) کو اپنی حالت کا ترجمان سمجھے اور یہی تصور مقام صبر اور منصب رضا بالقضا کے حصول کا سبب ہوتا ہے اور یقین کرکے کہ جو کچھ مصیبت اسے پہنچی ہے وہ اس سے زیادہ سخت عذاب کا مستحق تھا اور یہ مصیبت اس کے استحقاق کے موافق نہیں ہے، یہ بخشنے والے کی مہربانی وکرم فرمائی ہے کہ اس نے اس کو اس عذاب میں جو اس کے گناہوں کے لحاظ سے تھا، مبتلا نہیں کیا، یہ یقین مصائب وبلایا میں ابتلاء کے وقت اعلیٰ درجے کی شکر گزاری کا باعث ہوگا۔

خلاصۂ کلام یہ کہ درحقیقت انسان اس قابل نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی توجہ وعنایت کی صورت میں اللہ تعالیٰ کی قدر دانی کرے اور اس کی ناراضی کی صورت میں اس کی ناقدری کرے نیز اس کی یہ حیثیت نہیں کہ وہ اس کی وجہ سے اس کو اپنا قدردان یا ناقدردان خیال کرے۔

## پانچواں افادہ: عمومی لطف ومہربانی کا ذکر

اللہ تعالیٰ کے تمام بندوں پر عمومی لطف ومہربانی اخلاق حسنہ میں سے ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "الراحمون يرحمهم الرحمن ارحموا من في الأرض يرحمكم من في السماء" (۱۳۱) مہربانی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہر کسی کو خوش رکھے، شکر گزار بنائے، بلکہ اس کی حقیقت یہ ہے کہ جو کچھ واقعتاً ان کے حق میں بہتر ہو، گو ان کی ناقص رائے میں اس سے ان کا نقصان ہو دل سے ان کے واسطے اس کے حصول کا ارادہ کرے اور اس سلسلے میں جدوجہد کرے اور تمام بنی نوعِ انسان کے حق میں بظاہر کوشش

نہیں ہوسکتی، لہٰذا ان سب کے حق میں خواہ کافر ہوں یا مسلمان، مرضیات الٰہی پر چلنے اور ان کی ہدایت وتوفیق کے لیے دعا والتجا کی جائے کیوں کہ دعا سے اس کی مہربانی کا دروازہ کھل جاتا ہے، اور بمقتضائے "الخلق عیال اللّٰہ" (۱۳۲) پوری خلقت کو اللہ تعالیٰ کا کنبہ سمجھتے ہوئے ان پر رحم کرنے کو اس کی رضا کا سبب جانے اور تمام مخلوق میں سے بالخصوص امت محمدیہ علی صاحبها الصلاۃ والسلام کے ساتھ حسن اخلاق، تعظیم وتکریم اور رحم وکرم کا معاملہ کرے، اور خود کو اور ان کو غلام جانے کہ ہم سب ایک آقا کے نوکر بلکہ ایک مالک کے بندے ہیں اور ربانی صفت کے ساتھ ہر ایک سے پیش آئے اور اگر ہو سکے تو ہر طرح کی خدمت وسلوک کرے اور مالی امداد جس انداز سے بھی ہو اگر بس میں ہو تو عمل میں لائے اور خوراک وپوشاک میں تعاون سے پیچھے نہ ہٹے، اور کوئی بھی چیز دینے سے گو کھجور کا ٹکڑا ہی کیوں نہ ہو، عار محسوس نہ کرے۔

اور برتاؤ میں تمام لوگوں کے ساتھ مساوات نہ کرے بلکہ اہلِ فضل وکمال کے مراتب کا خیال ضروری ہے، جو شخص دینی اوصاف میں سے کوئی وصف رکھتا ہو اس کے موافق اس کو تعظیم واکرام اور سلوک وبھائی چارہ میں ترجیح دے اور اخلاق کی تفصیل اور منازل ومراتب کی تفاوت کو سنت اور آثار صحابہ سے معلوم کرے، اور اہل دنیا میں سے جو شخص متکبر اور اپنی عزت ومرتبے پر مغرور ہو اس سے اعلانیہ اخلاق سے پیش نہ آئے بلکہ اس سے بے پروائی برتے اور اس کی طرف توجہ نہ کرے لیکن غائبانہ دعا اور اس کی خیر خواہی سے جیسا کہ ماقبل میں گزرا کوتاہی نہ کرے خواہ وہ نیک ہو یا بد۔

## فائدہ: صالحیت وپرہیزگاری کو اللہ تعالیٰ کی عنایات میں سے سمجھنے کا ذکر

جب انسان کو فضائل کی دولت، رذائل سے دوری، نماز، روزہ اور ساری عبادتوں سے آراستگی نصیب ہوجائے تو چاہیے کہ ان سب باتوں کو ربانی عنایات اور یزدانی توفیقات میں سے جانے اور اپنی کوشش اور علم وعمل میں اپنے کمال پر ہرگز ناز نہ کرے، کیوں کہ بالکل

ظاہر ہے کہ اس کے مثل اور عقل ودانش میں اس کی برابری کے دوسرے لوگ موجود ہیں جو فضائل ورذائل سے غافل ہیں، بہت سے جانتے بھی ہیں لیکن وہ اس کے حقائق، اسباب وعلامات اور منافع ومضرات سے واقفیت کے باوجود تخلیہ اور تحلیہ سے محروم ہیں۔ لہٰذا ہر صبح وشام بلکہ ہر وقت اور ہر گھڑی "اَللّٰهم ما أصبح بي من نعمة أو بأحد من خلقك فمنك وحدك لا شريك لك" (۱۳۳) کا اقرار کرنے والا اور اعتراف کرنے والا ہو اور خود کو فقط عاجز اور محض ناچیز سمجھے اور کبھی خدائی پکڑ سے مامون نہ ہو، اس کے غضب سے لرزاں وترساں رہے اور امید کے پہلو کو غالب رکھے۔

# دوسری ہدایت

## اخلاق رذیلہ کا مفصل بیان

یہ ہدایت ایک تمہید اور گیارہ افادات پر مشتمل ہے:

### تمہید: دس رذائل کا ذکر

اخلاقِ رذیلہ میں سب سے بڑے وہ دس رذائل ہیں جو پیچھے بیان کیے گئے لہٰذا طالب حق کو چاہیے کہ وہ ان رذائل کے تزکیہ کا دوسرے اخلاق ذمیمہ کے مقابلے میں زیادہ اہتمام کرے، اس حد تک کہ ان میں سے کوئی چیز اس کے دل میں کبھی کھٹکنے نہ پائے اور اس کی طرف اس کے دل کا میلان نہ ہو، ان رذائل میں سے ہر ایک کو حق تعالیٰ کے بغض ونفرت اور اس کے غیظ وغضب کا سبب اور اس کی رضا وقبولیت کی بارگاہ سے انتہائی دوری کا باعث جانتے ہوئے تہِ دل سے اس کا دشمن ہو جائے اور اس کو اپنے محبوب کے وصل میں بڑی رکاوٹ اور بڑا مانع خیال کرے اور مامورات ومنہیات کی تعمیل میں اس قدر عمومیت کا مظاہرہ کرے کہ ادنیٰ ہدایت مثلاً مسلمانوں کے راستے سے کانٹا ہٹانا اور ادنیٰ ممانعت جیسے

مسجد میں تھوکنا، اس کو ہلکا نہ سمجھے اور اس طرح کے کاموں سے لاپروائی و بے اعتنائی نہ برتے کیوں کہ یہی پوری توجہ اور لگن قبولیت کا سبب ہوتا ہے اور بسا اوقات آسان کام مشکل کام سے زیادہ بہتر اور مقبول ہوتا ہے، حدیث شریف میں آیا ہے کہ ایک شخص نے اسی نیک عمل کے ذریعے یعنی خاردار ٹہنی مسلمانوں کے راستے سے ہٹا کر جنتی ہوگیا۔ (۱۳۴)

اور جب کبھی احکام شرعیہ کی بجا آوری میں سستی و غفلت پیدا ہو تو نفس کو اس سستی پر اس کے مناسب سزا دے کیوں کہ ہر نفس آرام و راحت کا طالب ہوتا ہے اور جب وہ مامورات و منہیات کی مخالفت کی صورت میں اپنی تذلیل و تکلیف پائے گا اور عبادتوں کی پابندی، اوامر کی بجا آوری اور نواہی سے اجتناب میں اپنی رہائی جانے گا تو خود بخود امور شرعیہ سے دوری اس سے ختم ہو جائے گی، اس لیے کہ ہر نفس کو سزا اور رسوائی سے اپنی حفاظت درکار ہوتی ہے اور چوں کہ وہ اپنی حفاظت احکامِ الٰہیہ کی تعمیل میں منحصر جانتا ہے، اس لیے وہ کسی بھی حالت میں ان کی مخالفت نہیں کرے گا۔ اور سزا کی تعیین کا ایک نمونہ یہ ہے کہ مثلاً نماز سے سستی کے مقابلے میں جو بہت کھانے پینے سے پیدا ہو تو روزہ رکھے اور اگر یار دوستوں کی صحبت اور ان سے خوش طبعی کی باتیں اس سے رکاوٹ بنیں تو تنہائی اختیار کرے، ان کی صحبت ترک کر دے اور اس قسم کی باتوں سے بالکل خاموشی کو اپنا لے۔ وہ دس رذائل اس رباعی میں منظوم ہیں۔ رباعی

خواہی کہ شود دل چوں آئینہ　　　　دہ چیز بروں کن از درونِ سینہ

حرص و طمع و بخل و حرام و غیبت　　　　کذب و حسد و کبر و ریا و کینہ (۱۳۵)

حرص اور طمع کے درمیان فرق یہ ہے کہ حرص موجودہ اشیا میں ہوتی ہے اور طمع غائب چیزوں کی خواہش کا نام ہے، اگرچہ انھیں حاصل کر پانا بہت مشکل ہو۔

پہلا افادہ: حرص کا علاج

بقدر کفایت اشیا میسر ہونے کے باوجود مزید کی خواہش حرص ہے، اس کا علاج یہ

ہے کہ اگر زیادتی کی مقدار جو کہ نفس کو مطلوب ہے، موجودہ شے سے کم ہو تو جس قدر نفس کو مطلوب ہو اس قدر کو صدقہ کر دے اور باقی پر گزارا کرے، مثلاً ایک سیر غلہ موجود ہے اور نفس حرص کی وجہ سے مزید اور آدھا سیر چاہتا ہے یعنی نصف سیر کی خواہش رکھتا ہے تو موجودہ ایک سیر میں سے نصف سیر کو صدقہ کر دے اور بقیہ نصف سیر پر قناعت کرے، اسی پر دوسری چیزوں کا قیاس کر سکتے ہیں۔

اور نفس کو خطاب کرے کہ اگر تم موجودہ مقدار پر مطمئن نہیں رہو گے تو میں اسی طرح سے تمہاری مخالفت کرتا رہوں گا۔ اسی طرز پر لباس، مکان اور جس چیز میں حرص معلوم ہو، نفس کو سبق سکھائے اور اگر لالچ موجودہ مقدار کے برابر یا اس سے زیادہ کی ہو تو پھر بھی موجودہ مقدار میں سے نصف ہی کو صدقہ کرے اور ذکر کردہ خطاب کے ذریعے اپنے نفس کی سرزنش کرے، اس کے باوجود اگر حرص پھر بھی ساتھ نہ چھوڑے اور نفس مقدار حاضرہ پر قانع نہ ہو تو پھر اس میں سے آدھے حصّہ کو اللہ کے راستے میں دے دے اور اسی بیان کردہ کلام کے ذریعے اپنے نفس کی زجر و توبیخ کرے اور اگر اب بھی وہ بری خصلت اس کے نفس سے مکمل طور پر خارج نہ ہو تو پھر موجودہ مقدار میں سے نصف حصّہ صدقہ کر دے اور اسی نقل کردہ کلام کے ذریعے نفس کو مخاطب کرے۔ مختصر یہ کہ نفس یا تو موجودہ مقدار پر قناعت اختیار کر لے گا اور حرص کی برائی سے پاک ہو جائے گا یا وہ مرغوب شئے اس کے دل سے جاتی رہے گی۔ اسی انداز سے عمل کرتا رہے تا کہ حرص بیخ و بن کے ساتھ اس کے دل سے ختم ہو جائے۔

## دوسرا افادہ: طمع کا علاج

طمع کا علاج یہ ہے کہ جب کسی چیز کی لالچ دل میں پیدا ہو تو جو چیز انجام اور فائدے کے لحاظ سے اس جنس کی یا اس کے مثل اس کے پاس موجود ہو، اسے اللہ کے راستے میں خرچ کر ڈالے مثلاً اگر عمدہ کپڑوں کی لالچ اس کے دل میں انگڑائی لے تو لباس کی جنس سے جو کپڑا زیب و زینت کے لیے اس کی مِلک میں ہو اُسے خرچ کر دے، اور اگر عام لالچ

کا خیال اس کے دل میں گزرے تو جو چیز اس کے پاس ہو اس میں سے تھوڑا خرچ کرے یعنی طمع کا خیال آتے وقت اشیائے موجودہ سے کچھ نہ کچھ خرچ کرے اور اسی طرح سے اس لت کا علاج کرتا رہے، تا آنکہ نفس اس برائی سے بالکل پاک وصاف ہو جائے یا تمام پسندیدہ چیزیں اس سے رفو چکر ہو جائیں۔

اور صَرفِ اموال اس انداز سے کرے کہ غیر شرعی امر کا ارتکاب لازم نہ آئے مثلاً وہ کپڑا جو ستر کو چھپانے والا، یا گرمی وسردی سے حفاظت کرنے والا ہو اسے صدقہ نہ کرے، یا اپنا تمام سرمایہ برباد کر کے اس قدر محتاج نہ ہو جائے کہ دست سوال دراز کرنے لگے، اس طرح خرچ کرنا ہرگز جائز نہیں ہے، اس لیے کہ اس صورت میں صاف برائی نظر آتی ہے اور برائی سے بچنا ضروری ہے، لہٰذا اس طرح سے ہرگز خرچ نہ کرے۔ البتہ ایسا شخص جو مضبوط ارادے کا مالک ہو کہ باوجود اپنا تمام سرمایہ لٹانے کے پریشان حال اور گداگر نہ ہو اور شریعت کے حکم پر قائم ومستحکم رہے تو اس کے واسطے اپنی تمام دولت کا خرچ کرنا درست ہے اور یہ اس کی بلند ہمتی کی علامت ہے۔

## تیسرا افادہ: بخل کا علاج

بخل جو کہ دل سے ملحق ہوتا ہے، اگرچہ اس کے آثار ظاہر نہ ہوں، اس کا علاج یہ ہے کہ آخری درجہ کی سخاوت کو اپنے اوپر ہر حال میں لازم کر لے اور بااثر اہل جود وسخا کی روش پر چلنے والا ہو، تاکہ بخل کا وسوسہ اس کے دل میں کبھی بھی نہ آنے پائے۔

**فائدہ:** طمع اور بخل کے طریقۂ علاج میں فرق یہ ہے کہ طمع سے نجات پانے کے لیے ضروری سامان کے علاوہ جو کچھ موجود ہو، اسے دینا چاہیے اور بخل کے ازالے کے لیے جس پر بخل کا خیال گزرے، اسے ہبہ کرنا چاہیے، اگر کوئی بخیل اپنے تمام ساز وسامان کو خرچ کر کے بے نوا فقیر بن جائے، پھر بھی کنجوسی کی لت اس سے دور نہیں ہوگی، بلکہ اس بری خصلت کے ازالے کا طریقہ یہ ہے کہ جب کپڑا دینا نفس پر گراں گزرے تو کپڑا دے اور جب کھانا

دینا دشوار ہو اور نفس اس سے اعراض کرے تو وہی کھانا فقیر کو دے دے، اسی طرح اپنی تمام اشیائے مملوکہ میں تصرف کرے، تا آں کہ جب وہ زیر ملکیت اشیاء ختم ہونے کے قریب پہنچیں تو اس وقت مال خرچ کرنے سے اپنا ہاتھ روک لے، اور کما کر دوسرا حلال مال حاصل کرے، پھر اس کمائے ہوئے مال میں مذکورہ بالا طریقہ کے مطابق تصرف کرے اور اسی انداز سے اس رذیلہ کا علاج کرتا رہے تا آں کہ نفس اس سے پاک ہو جائے، اور چوں کہ اسی طرز پر وہ دن ورات نفس سے مقابلہ کرے گا تو امید ہے کہ کنجوسی کی لت اس سے دور ہو جائے گی۔

## چوتھا افادہ: حرام کا علاج

حرام کا علاج یہ ہے کہ جب نفس حرام کی خواہش کرے تو جو حلال اس حرام کی جنس سے ہو اس کو بھی اپنی خواہش نفسانی کی وجہ سے چھوڑ دے، البتہ اس حلال کو اپنی جان کی حفاظت، عبادت اور احکام شرعیہ کی تعمیل یا اہل حقوق کے حق کی ادائیگی کے لیے عمل میں لائے۔ مثلاً نفس چاہے کہ دوسرے کا کھانا ہڑپ کر یا چوری کر کے کھانا چاہیے تو حلال کھانا بھی اس کو اس کی خواہش کے وقت پر نہ دے اور جب نفس چاہے کہ اس وقت کھانا کھا کر آرام کرنا چاہیے تو اس وقت کھانا نہ کھائے بلکہ جب خواہش طعام کے وقت کی تبدیلی اور بھوک کی وجہ سے نڈھال ہو جائے تو اس نیت سے کہ کمزوری و ناطاقتی مشکل عبادتوں کے حقوق جیسے جہاد یا غیر دشوار عبادتیں جیسے نماز وغیرہ کی ادائیگی سے عاجزی کا سبب بنے گی تو اس وقت بقدر ضرورت کھائے، اور اسی طرح جنس طعام میں بھی کرے، مثلاً نفس تقاضا کرے کہ فلاں کھانا کھاؤ تو دوسری قسم کا کھانا ضرورت پوری کرنے کے لیے کھائے، اور اسی پر اس حرام کی خواہش کا قیاس کرے جو دوسری جنس سے ہو مثلاً اگر نفس زنا کی خواہش کرے تو حلال جماع سے بھی نفس کی چاہت کے مطابق پرہیز کرے اور وقت وحالت کے تغیر کے بعد بیوی کے حقوق ادا کرنے کے لیے جماع کرے۔

**فائدہ:** حدیث شریف میں ہے کہ اجنبیہ کو دیکھنے اور اس کی طرف دل کے میلان

کے وقت حلال عورت سے اپنی حاجت پوری کرنی چاہیے۔ چناں چہ مشکاۃ میں ہے کہ "إنّ المرأة تقبل في صورة شيطان وتدبر في صورة شيطان إذا أحدكم أعجبته المرأة فوقعت في قلبه فليعمد إلى امرأته فليواقعها فإن ذلك يرد ما في نفسه" (١٣٦) یعنی یقیناً عورت شیطان کی صورت میں آتی ہے اور شیطان کی صورت میں جاتی ہے جب تم میں سے کسی کو کوئی عورت پسند آجائے پھر وہ اس کے دل میں گھر کر لے تو چاہیے کہ وہ اپنی بیوی کی طرف قصد کرے اور اس سے مجامعت کرے، یقیناً یہ صحبت اس چیز کو دور کر دے گی جو اس کے دل میں ہے، یعنی عورت کی طرف اس کے دل کے میلان کو ختم کر دے گی۔ اور دوسری حدیث میں ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک عورت کو دیکھا تو وہ آپ کو بھلی معلوم ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت سودہ رضی اللہ عنہما کے پاس تشریف لے گئے اس وقت وہ خوشبو بنا رہی تھیں اور ان کے پاس دوسری عورتیں بھی تھیں، لہٰذا وہ سب وہاں سے چلی گئیں تا کہ مکان خالی ہو جائے پھر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حاجت پوری فرمائی، اس کے بعد آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "أيّما رجل رأى امرأة تعجبه فليقم إلى أهله فإن معها مثل الذي معها" (١٣٧) یعنی جو شخص کسی عورت کو دیکھے پھر وہ اسے بھا جائے تو وہ اپنی اہلیہ کے پاس چلا جائے، کیوں کہ اس کے پاس وہی چیز ہے جو اس کے پاس ہے، مطلب یہ ہے کہ ضرورت پوری کرنے میں دونوں برابر ہیں۔

یہ قولی اور فعلی سنت ذکر کردہ کلام کے مخالف نہیں ہے، کیوں کہ حدیث شریف پرہیز گار شخص کی حالت کی تصویر کشی کرتی ہے اور نفس کے علاج کا بیان بدکردار اور حرام میں گرفتار شخص کے لیے ہے کہ اس کا نفس حرام کاری سے باز نہ آتا ہو تو اس کا علاج صرف خواہش نفسانی کی مخالفت میں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: "وَ اَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى" (١٣٨) اور لیکن جو شخص اپنے پروردگار کے حضور میں کھڑا ہونے سے ڈرتا ہے اور نفس کو خواہش سے روکتا ہے تو اس کا ٹھکانہ جنت ہے۔

خواہش جماع کی دو قسمیں ہیں، ایک نفس کا لذتوں میں پڑے رہنا، اس کے آثار میں سے حرام کاری کی طرف دل کا میلان، حرام سے بے پرہیزی اور حلال سے انحراف ہے، خصوصاً جب نفسانی اور شیطانی لذت حلال میں کم اور حرام میں زیادہ محسوس ہو، مثلاً ایک شخص کی بیوی حسین وجمیل، خوش اندام ہو، اور عمدہ لباس میں ملبوس بھی ہو اور دوسری عورت اس کے جیسی نہ ہو، لیکن عین جماع کی حالت میں ایسی شہوت انگیز ادائیں اور صدائیں کرتی ہو کہ داد بے حیائی دیتی ہو تو نفس وشیطان کے جال میں گرفتار شخص اس عورت کی طرف زیادہ مائل ہوگا اور ایسا صرف لذت جماع میں انہماک کی وجہ سے ہے، اور اس کی علامتوں میں سے کمزوری اور مادّۂ منویہ کی کمی کے باوجود شہوت انگیزی میں تکلف کا مظاہرہ کرنا ہے اور اس کیفیت کو شیخ سعدی علیہ الرحمۃ یوں بیان کرتے ہیں ؂

بے رغبتی شہوت انگیختن      برغبت بود خود خون ریختن (۱۳۹)

دوسری قسم یہ ہے کہ انسان کی طبیعت، منی کا ظرف مکمل بھر جانے کی وجہ سے عورت کی طرف مائل ہوتی ہے، اس میلان میں کسی عورت کی خصوصیت یا حلال وحرام میں سے کسی طریقۂ جماع کی خصوصیت کا کوئی دخل نہیں، اس کا بیان یہ ہے کہ جیسے پیشاب کا مثانہ بھر جانے کے وقت طبیعت انسانی میں اضطراب اور بے چینی کی کیفیت پیدا ہوتی ہے اور اس پریشانی کی وجہ سے اپنی ضرورت پوری کرنے کے لیے مجبوراً کوئی نہ کوئی جگہ تلاش کرتا ہے اور جب کوئی مناسب جگہ مل جاتی ہے اور وہاں پیشاب کرنے سے کوئی شرعی یا عقلی چیز رکاوٹ نہیں ہوتی ہے تو اس کی طبیعت اس مقام کی طرف متوجہ ہوتی ہے اور جب تک کہ اس حاجت سے فراغت حاصل نہ ہو جائے اس کا دل اس جگہ میں اٹکا رہتا ہے، اور اگر کوئی رکاوٹ ہوتی ہے، مثلاً وہ ایسی جگہ ہو جس کا مالک وہاں پیشاب کرنے سے ناراض ہوتا ہو، یا اس طرح کی کوئی دوسری رکاوٹ ہو، تو دل اس سے متعلق نہیں رہے گا؛ لیکن بے اطمینانی جو کثرت بول کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے، شدت اختیار کرتی جائے گی، جب تک کہ وہ پیشاب

نہ کرلے، لہٰذا اس مکان یا اس کے حاصل کرنے کے طریقے کی خصوصیت یعنی غصب، بیع یا ہبہ کا اس میلان طبع میں کوئی دخل نہیں، بالکل اسی طرح جب منی کا ظرف بھر جاتا ہے تو خواہش نفسانی انسانی طبیعت میں پیدا ہوتی ہے، جب وہ کسی ایسی عورت کو دیکھتا ہے جو اس کی ضرورت پوری کرنے کے مناسب ہو تو وہ ہیجانی کیفیت دوبالا ہو جاتی ہے اور جب تک اس کی حاجت پوری نہیں ہو جاتی اس کا خیال اپنی ضرورت کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی طرف لگا رہتا ہے۔ لہٰذا اس میلان میں اس عورت یا اس کے حاصل کرنے کے طریقے یعنی نکاح یا زبردستی کی کوئی خصوصیت نہیں ہے بلکہ اس عورت یا کارِ بد سے مطلقاً کنارہ کش اور مجتنب رہتا ہے، البتہ جماع کا شوق جو اس عورت کے دیکھنے سے پیدا ہوا وہ اس کے دل میں برقرار رہتا ہے، تا آں کہ حلال طریقے سے وہ اپنی ضرورت پوری کرلے، پس دونوں حدیثوں کا مورد یہی دوسری قسم ہے۔ چنانچہ جملہ "فإن ذلك يرد ما في نفسه فإن معها مثل الذي معها" سے اس پر روشنی پڑتی ہے، اس لیے اس جگہ مماثلت نفسِ قضائے حالت میں ہے نہ کہ تمام چیزوں میں جیسے کہ صورت وسیرت میں مماثلت۔

یہیں سے واضح ہوا کہ امام المعصومین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں اجنبی عورت کی خواہش نہیں پیدا ہوئی تھی بلکہ ضرورت پوری کرنے کا تقاضا جو کہ پوشیدہ تھا، ظاہر ہوا اور نفس کی مخالفت کا تعلق پہلی قسم سے ہے جو کہ نفس کو ہویٰ (خواہش) سے روکنے میں داخل ہے اور آیت کریمہ کا مدلول ہے، اور نفس کی مخالفت میں اس کی ریاضت ایک ایسی حقیقت ہے جو علماء اور دانشوران سب کے نزدیک مسلّم ہے۔ شعر

والنفس كالطفل إن تهمله شب على حب الرضاع وإن تفطمه ينفطم (۱۴۰)

لہٰذا اس فن کے مصطلحات کے مطابق بات یہ ہے کہ حدیث شریف میں حقوق نفس کی ادائیگی کا بیان ہے اور درج بالا معالجہ اس کو خواہشات کی پیروی اور لطف اندوزی سے تزکیہ کی وضاحت میں ہے۔

## پانچواں افادہ: غیبت کا علاج

غیبت کا علاج یہ ہے کہ اگر صرف اس کا خیال آئے تو اللہ کے سوا ہر چیز سے کٹ کر کے نہایت عاجزی اور پوری توجہ کے ساتھ اس شخص کے حق میں بہتری اور بھلائی کی دعا کرے جس کی غیبت کا خیال اس کے دل میں گزرا ہوا اور بھلائی بھی ایسی ہو جو وہ خود اپنے لیے چاہتا ہے اور دعا بھی اس کیفیت کے ساتھ ہو جو وہ اپنی سخت اور اہم ترین ضرورت کے موقع پر کرتا ہو، اور اگر نفس اس کام میں کوتاہی کرے تو نفس کے در پے ہو کر بادل نخواستہ اس دعا کو بجالائے اور ہرگز نفس کو نہ چھوڑے کہ وہ اس دعا کے سلسلے میں تعلّی اختیار کر کے اسے ترک کر دے بلکہ ایک دن یا دو تین دن تک نفس کے پیچھے پڑا رہے۔

اور اگر غیبت واقع ہو جائے تو دعا کے علاوہ اس شخص سے اکیلے میں غلطی کی معافی مانگے اور معاملے کو رفع دفع کرائے اور اس سے تنہائی میں کہے کہ مجھ سے تیری غیبت ہوگئی ہے اور اس امر کو ظاہر کرنے کا فائدہ یہ ہوگا کہ چوں کہ نفس اپنے عیب کے اظہار سے بھاگتا ہے اور ہرگز اپنے عیب کا اعتراف نہیں کرتا ہے، لہٰذا اظہارِ عیب کمال کسرِ نفسی کا سبب ہوگا اور خلوت کا فائدہ یہ ہے کہ چوں کہ معصیت الٰہی کی اشاعت ممنوع ہے اس لیے وہ اس گناہ سے محفوظ رہے گا، یہاں پر ایک نکتہ ذہن نشیں کر لینا چاہیے کہ گناہ کا ارتکاب برا ہے اور اس کا افشا اس سے زیادہ برا ہے، لہٰذا اس سے خلوت میں کہے اور اس کو بھی ظاہر کرنے سے منع کر دے۔

## چھٹا افادہ: جھوٹ کا علاج

جھوٹ کا علاج یہ ہے کہ اگر جھوٹ زبانی لذت کے لیے ہو اور اس میں کسی کے نفع ونقصان کا دخل نہ ہو تو اس کا علاج خاموشی ہے، مجلسوں میں گفتگو سے پرہیز کرے، تاکہ بات کی لذت اس کے دل سے دور ہو جائے اور مجلسوں میں نشست و برخاست سے پرہیز نہ کرے، بلکہ مجلسوں میں بیٹھے، لیکن زبان پر تالا لگائے رہے؛ کیوں کہ یہ امر نفس پر نہایت گراں ہے، اور اگر جھوٹ دو آدمیوں کے درمیان پھوٹ ڈالنے اور فتنہ وفساد پھیلانے کی

غرض سے ہو تو اس کا علاج وہی ہے جو غیبت کا علاج ہے، دونوں کو جمع کر کے خلوت میں انھیں آگاہ کرے کہ میرے نفس نے مجھ کو اس طرح سے بہکایا تھا کہ میں تم دونوں کے درمیان نفرت وکشیدگی کی بیج بوؤں، اور ان دونوں سے اپنی غلطی کی معافی چاہے، انھیں اپنے سے راضی کرے اور ہمیشہ ان کی بھلائی کے لیے کوشاں رہے اور جو بات ان دونوں کے اتحاد واتفاق کا موجب ہو، اس میں سعی بلیغ کرتا رہے۔

اور اگر دو سے زیادہ ہوں تو ان سب کو اکٹھا کرے اور سابق کی طرح بقیہ دوسرے لوگوں سے اس معاملے کو پوشیدہ رکھے اور ان دونوں صورتوں (غیبت اور کذب) میں اہل حق سے معافی تلافی کرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ کے دربار میں سچی توبہ کرے کیوں کہ حق تعالیٰ کا حق تمام حقوق میں سب سے اعلیٰ اور اصل ہے، اس کے بعد اہل حقوق سے معافی طلب کرے۔

## ساتواں افادہ: حسد کا علاج

حسد کا علاج یہ ہے کہ اگر حسد صرف دل میں ہو تو محسود کے کمالات اور اس کی عزت ووجاہت کی زیادتی کے لیے خصوصاً اس چیز میں اضافے کے لیے جس میں اس نے حسد کیا ہے، خوب دعا کرے اور اسی طریقے پر کرے جو غیبت کے علاج میں تحریر کیا گیا ہے اور دعا الحاح وزاری کے ساتھ کرے، اور ظاہر میں بھی اپنی وسعت کے بقدر ہاتھ اور زبان سے محسود کی ترقی میں مساعی جمیلہ بجالائے، تاکہ نفس کی مخالفت ومقابلے کی وجہ سے حسد کا وسوسہ تک اس کے دل سے نکل جائے، کبھی واپس نہ آئے اور محسود مسلمان کو فائدہ حاصل ہو۔

اور اگر حسد کے آثار میں سے کوئی اثر ظاہر ہو گیا ہو مثلاً اس کمال میں جو حسد کا سبب بنا ہو محسود کی بے لیاقتی کا شکوہ اس کی زبان سے سرزد ہو گیا ہو تو جس سے اس نے حسد کیا ہے اس کو بھی اس پر مطلع کرے اور جس کے سامنے اس کی بے لیاقتی کا تذکرہ کیا ہے اس کو بھی اپنی غلطی سے آگاہ کرے اور اپنے قصور کا معترف ہو اور اس کی جو قابلیت اسے معلوم ہو، اس کو اچھے اور دلپذیر انداز میں بیان کرے، مثلاً کسی شخص کے آقا کے سامنے کہا ہو کہ وہ

شخص لائق رفاقت اور قابلِ اعتبار نہیں ہے، تو اس شخص کو بھی اس سے آگاہ کرے اور غلطی کی معافی مانگے اور اس آقا کو بھی اطلاع دے کر بے لیاقتی کی جگہ اس کی کمال لیاقت کا ذکر کرے، شخص مذکور کو اطلاع دینے کا فائدہ یہ ہے کہ وہ اپنے کام کی خرابی سے واقف ہو کر اس کا تدارک کرے گا اور لیاقت کے اظہار میں خلاف واقع کلام نہیں کرے گا بلکہ اگر واقعی لیاقت والا ہوگا تو اپنی لیاقت کو ظاہر کرے گا ورنہ اظہار لیاقت کے بغیر صرف کوشش کرے گا۔

## آٹھواں افادہ: تکبر کا علاج

تکبر کا علاج یہ ہے کہ اگر کسی شخص کی نسبت تکبر کیا ہو تو اس کی نسبت حد سے زیادہ ذلت اختیار کرے، گو اس کی انتہائی تذلل اور اس شخص کی بغایت تعظیم کی وجہ سے اس کی حرکتیں لوگوں کی مجلسوں میں نقل کی جانے لگیں اور اس کے رقیب مذاق اڑانے لگیں، اگر اللہ تعالیٰ کی رضا کا طالب ہے اور خود کو طالبانِ خدا کی فہرست میں شامل کرنا چاہتا ہے، تو ان میں سے کسی بات کی کچھ پروا نہ کرے، کیا تم نہیں دیکھتے ہو کہ یہی باعزت و باوقار لوگ ہوتے ہیں جو خود کو آواروں کی جماعت میں شامل کرتے ہیں اور ان کے وضع قطع قبول کرنے میں جو کہ سراسر عقل و شریعت کے خلاف ہوتا ہے، بالکل جھجھک نہیں محسوس کرتے ہیں، بلکہ اس کو اپنے لیے سرمایۂ عزت و افتخار گردانتے ہیں۔ ایک معزز امیر زادہ ہوتا ہے جو ہیجڑوں کی محبت میں گرفتار ہو کر ان سب باتوں کو جنھیں کوئی سلیم الطبع انسان گوارہ نہیں کر سکتا، دل و جان سے قبول کر کے سر عام گلیوں اور بازاروں میں انھیں عادات و اطوار کے ساتھ خوشی خوشی گھومتا پھرتا ہے۔

لہٰذا اگر واقعی خدا کا طالب ہے تو ان امور سے جو بالکل عقل و شریعت کے موافق ہیں گو مرضیات الٰہی سے بے خبر لوگوں کی ناقص عقلوں کے مخالف ہوں، انکاری نہیں ہوگا۔ اور عاجزی و انکساری سے یہ بناوٹی عاجزی مراد نہیں ہے یعنی سر جھکا دینا اور زمین چومنا، بلکہ تذلل کی حقیقت ہر مقام اور ہر جگہ میں جدا جدا ہے، مثلاً جو شخص مشائخ کی صورت میں ہو اور اس کو مشائخ میں سے کسی کی نسبت تکبر ہو گیا ہو تو اسے چاہیے کہ وہ اس کے ساتھ ایسا معاملہ

کرے کہ لوگوں کے ذہنوں میں یہ بات نقش ہوجائے کہ یہ شخص اس سے استفادہ کرتا ہے اور اس سے طریقت کے فوائد حاصل کرتا ہے اور اس کی صحبت سے اپنی کمی کی تلافی کرتا ہے۔

## نواں افادہ: ریا کا علاج

مثال کے طور پر ریا کا علاج یہ ہے کہ اگر ریا نماز میں واقع ہوئی ہو تو اس خیال کو بقدر استطاعت دور کرے اور اگر باوجود کوشش کے دور نہ ہو تو ریا کے لمحوں کو گن کر یاد رکھے اور تنہائی کے اوقات میں جیسے رات کا وقت جو تنہائی کا وقت ہوتا ہے اور کسی فرد بشر کی اطلاع کا امکان نہ ہو، اگر دو رکعت والی نماز میں ریا واقع ہوئی ہو تو دو دو رکعتیں اور اگر چار رکعت والی نماز میں ریا در آئی ہو تو چار چار رکعتیں لمحات ریا کی گنتی کے موافق نہایت ہی حضور و خلوص کے ساتھ پڑھے، اور اگر اس وقت بھی خلل واقع ہو جائے تو جس نماز میں خلل واقع ہوا ہو اس کو گنتی سے علاحدہ کر کے دوبارہ پڑھے، یہاں تک کہ نماز خلوص کے ساتھ ریاکاری سے پاک ہو کر لمحات مذکورہ کی گنتی کی برابری تک پہنچ جائے اور اس کی ادائیگی تک نفس کو ہرگز آزاد نہ چھوڑے۔

اسی طرح اگر اللہ کے لیے خرچ کرنے میں ریا پیش آئے تو اپنے نفس کی زجر و توبیخ کرے کہ تیرا محبوب ترین مال اس سے دس گنا خرچ کروں گا، اللہ کے لیے دوں گا اگر نفس باز نہ آئے پھر ایسا ہی کرے تو انتہائی سرکشی کی صورت میں اپنے نفس سے کہے کہ جس قدر تم چاہو باطمینان اپنا کام کرو ان شاء اللہ تعالیٰ تم اس اطمینان کی واجبی سزا پاؤ گے، پھر سرکشی کے برابر اس کو سزا دے۔

ادائے فرائض میں ریا کی گنجائش نہیں ہے، ریاکاری سنن و نوافل میں واقع ہوتی ہے، لیکن سنن و نوافل کو بھی اس خیال سے کہ ان میں ریا در آئی ہے یا واقع ہو جائے گی، ترک نہ کرے، بلکہ انھیں ادا کرے اور ریا کا علاج بیان کردہ طریقے کے مطابق کرتا رہے۔

## دسواں افادہ: کینہ کا علاج

کینہ اگر دل سے آگے نہ بڑھا ہو تو اس کا علاج یہ ہے کہ اس شخص کے ساتھ اس

طور پر خلوص ومحبت سے پیش آئے کہ اس کے دل میں بھی محبت پیدا ہو جائے اور بغیر قلبی موافقت کے ظاہری خلوص کا چنداں اعتبار نہیں، اور اگر کینہ کی وجہ سے کوئی بات یا حرکت صادر ہوگئی ہو تو اس کا علاج معافی مانگنا، اپنے قصور کا اقرار کرنا اور اخلاص و دوستی میں کوشش کرنا ہے جیسا کہ پیچھے صراحت کے ساتھ گزرا۔

## گیارہواں افادہ: رذائل سے علاحدگی کے طریقۂ امتحان کا بیان

جب آدمی یادداشت کے طور پر پابندی کے ساتھ ان باتوں کا لحاظ کرے گا جو ماقبل میں ذکر کی گئیں تو قوی امید ہے کہ اسے تزکیہ حاصل ہو جائے گا، لیکن صرف جاننے سے اگر اس کے دل میں تصفیہ وتخلیہ کا خیال پیدا ہو تو اس پر بھروسا نہ کرے، بلکہ اس کا امتحان لے اور طریقۂ امتحان کو بخوبی سمجھ کر خود کو اس کا ممتحن بنائے مثلاً کسی درویش، خانقاہ نشیں یا کسی بادشاہ یا امیر کو انتہائی شان وشوکت اور خوب آن بان کے ساتھ بہت بار دیکھے اور کچھ رشک وحسد اپنے دل میں نہ پائے تو یہ نہ سمجھے کہ میں حسد سے پاک ہو گیا ہوں بلکہ اس بری خصلت سے اس کی پاکی اس وقت ظاہر ہوگی جب اس کا کوئی پیر بھائی، ہم خانقاہ، ہم نسبت، ہم پیشہ انھیں اعمال واشغال میں مشغول ہو اور تھوڑی مدت میں بیشمار فوائد اسے حاصل ہو جائیں، اس کا پیر بھائی اس کام میں جس کے واسطے اس شخص نے سخت محنتیں اٹھائی ہیں، بغیر قابل ذکر محنت کے بہت جلد معزز وممتاز ہو گیا ہو اور اس کے سامنے اس کی فضیلت وبرتری ثابت ہوگئی ہو اور اس کام کے واقف کاروں، خانقاہ نشینوں اور اس کے مرشد کی زبان سے جو اس خانقاہ کا سرپرست ہے، اس کام میں اس کی چالاکی مشہور ہوگئی ہو اور اس بنا پر وہ مشائخ عظام کی نگاہ میں معظم ومحترم ہو گیا ہو، اس کے باوجود مذکورہ اتحادات کے لحاظ سے اسے خوشی ومسرت حاصل ہو اور کسی بھی قسم کی کوئی پریشانی یا تکلیف اس کے دل میں پیدا نہ ہو تو اس وقت یقیناً اس کا باطن حسد کی برائی سے پاک ہو گیا، اور اسی قیاس پر عالم، دانش ور، سپاہی، شریف اور پیشہ ور کا معاملہ جدا جدا ہے۔

# تیسری فصل

## عبادات میں خلل ڈالنے والی باتوں کا بیان

یہ فصل دو ہدایتوں پر مشتمل ہے:

### پہلی ہدایت: اجمالی طور پر عبادتوں میں خلل انداز ہونے والی باتوں کا ذکر

اس ہدایت کے تحت دو افادات ہیں:

### پہلا افادہ: نیت میں خلل ڈالنے والی باتوں کا ذکر

عبادتوں میں خلل ڈالنے والی بڑی بڑی باتوں میں سے نام خدا کی محبت و تعظیم کا گویا نہ ہونا ہے، اگر چہ ہر شخص کے دل میں نام خدا کی محبت و تعظیم ہوتی ہے لیکن اس قدر جو کہ کامیابی کا موجب ہو اور اس طرح پر جو اکابرین امت کو حاصل تھی، نہیں ہوتی ہے۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ محبت و تعظیم کے کچھ اغراض ومقاصد ہوتے ہیں اور ان اغراض ومقاصد کے مطابق محبت و تعظیم مختلف ہوتی رہتی ہے۔ مثلاً کوئی شخص نام خدا کے ذکر کی پابندی قیود وشرائط اور پورے اہتمام کے ساتھ کرتا ہے، اس مقصد سے کہ اس نام پاک کی برکت سے چند روپے کی نوکری مجھے مل جائے گی، یا میں کسی سردار یا امیر کے سامنے معزز ہو جاؤں گا، تو جس قدر اس کا مقصد عزیز ہو گا اسی قدر محبت و تعظیم زیادہ ہو گی۔ اور دنیوی اغراض میں سب سے بڑی غرض حکومت و بادشاہت ہے، اگر چہ اس عظیم مقصد کے لیے جو شخص نام خدا کا ذکر کرے گا اس کے دل میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی محبت و تعظیم نا قابل بیان ہو گی لیکن پروردگار عالم کے واجب الاطاعت ارشاد "قُلْ مَتَاعُ الدُّنْیَا قَلِیْلٌ" (۱۴۱) اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ

وسلم کے بیان ہدایت نشان "لو کانت الدنیا تعدل عند اللّٰہ جناح بعوضة ما سقی کافرًا منها شربة ماء" (۱۴۲) کے مطابق دنیا فانی، قلیل اور ذلیل ہے۔

جس شخص نے اللہ تعالیٰ کے نام کو اس کے حصول کا ذریعہ بنایا اس نے اس اسم گرامی کی قدر و منزلت کو نہیں پہچانا، اور بہت ایسا ہوتا ہے کہ یہی دنیا دین داری کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے اور خود کو اس کے لباس میں ملبوس کر کے جلوہ دکھاتی ہے، مثلاً اذکار الٰہی کی پابندی اس نیت سے کرنا کہ مجھے کمال حاصل ہوگا اور اس کی وجہ سے بادشاہ، امراء، شرفاء اور بااثر شخصیات میرے سامنے جھکیں گی اور مجھ سے درخواست کریں گی اور میرا نام ونشان اور میرے کمالات کی شہرت عرصۂ دراز تک باقی رہے گی اور میری ولایت کا آوازہ دور دراز شہروں اور ملکوں میں گونجے گا، حالاں کہ حقیقت یہ ہے: "وَإِنْ كُلُّ ذٰلِكَ لَمَّا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةُ عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُتَّقِيْنَ" (۱۴۳) اور ایسے شخص کا حال حدیث شریف کی روشنی میں ظاہر ہے کہ قیامت کے دن ایک قاری، ایک سخی اور ایک شہید کو پیش کیا جائے گا اور ان میں سے ہر ایک شخص اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی میں اپنی نہایت کوشش کو بیان کرے گا اور عالم الغیب والشہادۃ جو اس سے بھی باخبر ہے جو دلوں میں پوشیدہ ہے، ہر ایک کو اس کی نیت پر کہ وہ اپنی شہرت کا طلب گار تھا، مطلع فرما کر دوزخ میں ڈالنے کا حکم فرمائے گا۔ اس بیان سے یہ نہ گمان کرنا چاہیے کہ رزق یا دنیا حاصل کرنے کے لیے ذکر الٰہی کرنا ممنوع اور حرام ہے، کیوں کہ یہ بات نصوص قطعیہ کے صریح خلاف ہے، بلکہ اس بیان سے مقصود نام باری تعالیٰ کی محبت و تعظیم کے فرقِ مدارج کو واضح کرنا ہے کہ ذاکرین اس میں مختلف ہوتے ہیں اور جو حدیث شریف میں ان تین طرح کے لوگوں کے متعلق آیا ہے کہ وہ دوزخ کی آگ میں داخل ہوں گے اس کی تشریح یہ ہے کہ وہ کام جن سے اللہ تعالیٰ کی رضا بھی حاصل کی جاسکتی ہے اور دنیا بھی کمائی جاسکتی ہے، ان کی دو صورتیں ہوتی ہیں، اوّل یہ کہ ان کاموں کو بجالائے اور ظاہر کرے کہ میں نے یہ کام محض اللہ کے لیے کیا ہے، حالاں

کہ اپنے دل میں رضائے الٰہی کے علاوہ دوسری چیز حاصل کرنے کی نیت کی ہو تو یقیناً ایسا شخص بارگاہِ الٰہی سے دھتکارا ہوا اور جہنم میں داخل ہونے کے لائق ہے، ایسے ہی لوگوں کا بیان درج بالا حدیث میں ہے۔ اور دوسری صورت یہ ہے کہ ان کاموں کو بجالائے اور اپنی نیت کے موافق غیر خدا کی طلب کا اظہار کرے تو ایسا شخص اگرچہ بارگاہِ خداوندی میں حقیر ہے لیکن اس قدر نہیں کہ اس کے بارے میں جہنم میں داخل کیے جانے کا حکم صادر ہو۔

اور یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ یہی دنیاوی کام صحیح نیتوں کی بنا پر عمدہ عبادات بن جاتے ہیں مثلاً نیند جو کہ بالکل غفلت اور حجاب معلوم ہوتی ہے، صحیح ارادہ اور درست نیت کے ساتھ اہل ریا کی عبادتوں سے بہتر ہوجاتی ہے، جب بیداری و بے خوابی مخلص عبادت گزار کے حواس کے تکان کا باعث ہوجائے اور مناجات کی لذتوں اور عبادات کی کیفیتوں کو بے مزہ کردے اور وہ مخلص بے ریا ان لذتوں اور کیفیتوں کا مشتاق ہوکر دوبارہ ان کے حصول کو نیند میں منحصر سمجھتے ہوئے اس نیت و ارادہ کے ساتھ سو جائے تو اس کا یہ سونا صدہا ریا کاروں اور غافلوں کی نماز خوانی سے بہتر ہے، بلکہ اس کی نیند کو ریا کار کی نماز سے کوئی نسبت ہی نہیں، تا آں کہ اس کو اس سے بہتر کہا جائے۔ اِس کی نماز حق تعالیٰ کی ناراضگی اور اس کی بارگاہ سے دوری کا سبب ہے اور عالم ملکوت سے اس پر لعنت آتی ہے، اور اُس سونے والے پر اللہ تعالیٰ کی صدہا رحمتیں اور اس کی خوشنودی و رضامندی کی بارش ہوتی ہے، دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ جب دنیوی اغراض و مقاصد کا فرق معلوم ہوگیا تو اخروی مقاصد کی طرف منتقل ہونا چاہیے، اگرچہ اخروی مقاصد سب کے سب بہتر ہیں، لیکن ان میں باہم فرق مراتب بے شمار ہیں، اہل جنت کے فرق منازل سے اخروی مقاصد کے فرق کو سمجھا جاسکتا ہے۔

یہی فطری خصلتیں جیسے مسواک کرنا، کلی کرنا، ناک میں پانی ڈالنا، مانگ نکالنا، مونچھیں کتروانا، استنجا کرنا، موئے زیر ناف صاف کرنا، ختنہ کرانا، بغل کے بال اکھاڑنا اور ناخن تراشنا معتبر مفسروں کی تفسیر کے مطابق حضرت ابراہیم خلیل اللہ علی نبینا وعلیہ کو ان

باتوں کے ذریعہ آزمایا گیا، اورانھیں ان باتوں کا مکلّف بنایا گیااوراس معتبر کسوٹی پران کی نقد استعداد کو پرکھ کران کو امامت کبریٰ کے درجے پر فائز کیا گیا، اور یہی نماز، روزہ، تلاوت، ذکر، جہاد، زکاۃ اور حج ہیں جن کی ادائیگی میں صدیق اکبرؓاور فاروق اعظمؓ وغیرہ کے مراتب ان کے عزم وارادے کی تفاوت کے سبب مختلف ہوئے، لہٰذا اللہ تعالیٰ کے نام پاک کی محبت وتعظیم میں سب سے اچھی نیت اور بہترین مقصداس کی خوشنودی کی طلب ہے، اس کے نام کے ذریعے اس کی رضا کے علاوہ کچھ اور نہ چاہے اور دنیوی واخروی اغراض میں سے کسی غرض کواپنی اجرت نہ جانے، بلکہ وہ جلیل القدرانعام جس کے پاسنگ کو دنیاوآخرت کی کوئی نعمت نہیں پہنچ سکتی، یہی ہے کہ اس کے نام پاک کے ذکرکی قوت وتوفیق ملی، اس انعام کو پورے شرح وبسط کے ساتھ کہ صرف اس کی قوت وتوفیق سے حاصل ہوا ہے، سمجھ کرتہہ دل سے خوش اوراحسان الٰہی کاممنون وشکرگزار ہو۔

اوراس کی شرح وتفصیل یہ ہے کہ ذکر کے مبادی واسباب کا ملاحظ کرے کہ یہ سب خدا تعالیٰ کی طرف سے ہیں، تمام اعضاوجوارح اورظاہری وباطنی حواس ہرایک کا ذکر میں دخل ہے، یہ سب کے سب اس کے عام انعامات میں سے ہیں۔اس کے بعد وہ توفیق جوخواص پرایک خاص انعام الٰہی ہے، وہ بھی اسی کی طرف سے ہے، بہت ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص ہے جس کے اعضاوقویٰ، دل وزبان اورفہم وشعورسب کچھ درست ہیں اور ہزارہا دنیاوی تقاریراورمعاشی افکاراس کی زبان ودل پرآتے ہیں، لیکن جب وہ ذکرلسانی یافکرقلبی کاارادہ کرکے خدا تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوتا ہےتو اس کی زبان میں ثقل اوراس کے دل میں وہم پیدا ہوجاتا ہےاوروہ دونوں چیزیں ذکروفکر پرآمادہ نہیں ہوتیں۔

خلاصۂ کلام یہ کہ صرف اللہ تعالیٰ کا نام کا انسان کی زبان پر جاری ہونا بذاتِ خود ایک عظیم نعمت ہے، اس انعام کوبہترین انعام الٰہی جان کردوسرے ثواب وجزا کی طلب سے چشم پوشی کرے۔اس طرح پراس کے نام کی محبت وتعظیم تمام کمالات کی بنیادواصل ہے۔

## دوسرا افادہ: احکام شرعیہ کے تئیں عدم اہتمام کا ذکر

عبادات میں خلل ڈالنے والی بڑی بڑی باتوں میں سے احکام شرعیہ اور عبادات دینیہ کا اہتمام نہ کرنا بھی ہے، اس کی اصل بنیاد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کا طریقہ دو وجہوں سے ان کے ہاتھ سے گم ہوتا جاتا ہے۔ پہلی وجہ یہ کہ ان کے دل میں اللہ تعالیٰ کی رضا کا خیال نہیں ہوتا، بلکہ ان کا مطمح نظر اپنا کمال ہوتا ہے جو کہ درحقیقت نقصان ہے۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ ان کی نیت حق تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کی ہوتی ہے، لیکن اس کے طریقے میں غلطی کر جاتے ہیں، جو کچھ ان کے ناقص خیال میں آتا ہے کہ یہ کام اس کی رضا کا سبب ہے، اس کو اس کی رضا کا وسیلہ بناتے ہیں۔

حالاں کہ ہونا یہ چاہیے تھا کہ خود کو اس کی رضا جوئی کے راستے سے گمراہ سمجھ کر نابینا شخص کی طرح "یا بصیرًا خذ بیدی" (۱۴۴) کو ہمیشہ اپنی حالت کا ورد زبان بنائے رکھے اور اللہ تعالیٰ کے اس ازلی کلام "وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدىٰ" (۱۴۵) کو جس میں کامل ترین نبی کی طرف خطاب ہے اور اس حدیث قدسی "کلکم ضال إلّا من هديته" (۱۴۶) کو جو اللہ عزوجل نے اپنے صادق البیان سرور عالم کی زبان سے فرمائی ہے، بخوبی سمجھ کر اس کی رضا کے راستے کو اسی کے بتانے اور خبر دینے میں منحصر جانے اور شرع شریف کو جو کہ مضبوط رسّی اور عروۃ الوثقیٰ ہے، اپنا رہبر جان کر کبھی بھی اس کی مخالفت میں اپنی فلاح و بہبودی نہ سمجھے، اگرچہ کشف و کرامات، خرق عادات، انوار و ظہور تجلیات، روحوں اور آسمان والوں سے ملاقات کا خیال شریعت کی مخالفت کے نتیجے میں اس کے ذہن میں آئے۔

## فائدہ: جیسا چاہیے ویسا نماز کا حق ادا نہ کرنے کا ذکر

غیر مقبول سالکین میں اس (قبولیت خداوندی) سے رکاوٹ کی حقیقی وجہ یا علامت یہ ہے کہ وہ حضرات جس قدر اہتمام مشائخ کے اوراد و وظائف میں کرتے ہیں اس کا عشر عشیر بھی فرض نمازوں کی ادائیگی میں نہیں کرتے ہیں، بلکہ جب شیطان مردود اس گروہ

پر غالب آجاتا ہے تو بموجب "وَاِخْوَانُهُمْ يَمُدُّوْنَهُمْ فِی الْغَیِّ ثُمَّ لَا يُقْصِرُوْنَ" (۱۴۷) ان کو راہِ حق سے بہت دور پھینک دیتا ہے پھر وہ نماز کو حاکم وقت کی سرکاری بیگاری کی مانند جاننے لگتے ہیں اور اس قدر وقت کو جو نماز اور وضو میں گزرتا ہے، ضائع خیال کرتے ہیں اور اس میں اپنا فائدہ نہیں سمجھتے ہیں، معاذ اللّٰه من ذلك۔ یہ اس گروہ کا حال ہے جو اسلام سے موسوم ہے، اور جو اسلام سے خارج ہیں، ان کی حالت کے بارے میں یہاں پر گفتگو نہیں ہے۔

# دوسری ہدایت

## عبادتوں میں خلل ڈالنے والی باتوں اور ان کے طریقۂ علاج کا مفصل بیان

یہ ہدایت تین افادات پر مشتمل ہے:

### پہلا افادہ: نماز میں خلل ڈالنے والی باتوں کا بیان

نفس اور شیطان دونوں نماز میں خلل ڈالتے ہیں، نفس اس طور پر کہ سستی کرتا ہے اور اپنا آرام چاہتا ہے اور ارکان کی ادائیگی میں جلدی کرتا ہے، تاکہ جلد فارغ ہوکر سو جائے یا آرام کرے، یا اپنی پسندیدہ چیزوں میں مشغول ہو جائے، اور نماز میں قیام، رکوع، سجود اور قعود سنت کے مطابق نہیں کرتا ہے، بلکہ لاغر و فالج زدہ لوگوں کی طرح سستی اور کاہلی اس کے جوڑوں میں سرایت کر جاتی ہے، نیز وہ ارکان نماز کی طرف بے اعتنائی کی بنا پر جیسے تیسے اپنے اعضا کو رکھتا ہے یا اس طرح پر رکھتا ہے جو جسمانی راحت کے مناسب ہو، اور بخار زدہ لوگوں کی طرح باطنی حواس کا انتشار اور فکر و خیال کی پراگندگی اس کی حالت و کیفیت کی مزاحم ہوکر نماز کی طرف اس کی باطنی قوتوں اور ظاہری اعضا کی توجہ میں بڑا خلل ڈالتی ہے۔

اور جہاں تک شیطان کی بات ہے تو وہ وسوسہ ڈالتا ہے اور اس کا سب سے بڑا

وسوسہ نماز کو معمولی سمجھنا، اس کی طرف کم توجہ دینا اور اس کو بہت مفید نہ جاننا ہے، یہ وسوسہ بہت جلد کفر تک پہنچا دیتا ہے، اس سے استخفاف صلوٰۃ اور انکار فرضیت سامنے آتا ہے اور آدمی کافر ہو جاتا ہے، اور اس کا سب سے چھوٹا وسوسہ استحضار اور اللہ ربّ العزت سے ہم کلامی و سرگوشی کی لذت سے غافل کرنا ہے۔ شیطان اس طرح پر وسوسہ ڈالتا ہے کہ تمھیں رکعات یا تسبیحات کی گنتی بخوبی معلوم رکھنی چاہیے، مبادا کوئی سہو یا غلطی واقع ہو جائے، یا قرآن مجید کی متشابہات کے سلسلے میں حافظ کے دل میں وسوسہ ڈالتا ہے کہ غلطی سے حفاظت کے لیے انھیں ذہن میں رکھو، باوجود یہ کہ یہ نمازی ایک یا دو بار یا سیکڑوں بار آزما چکا ہے کہ دھیان قائم رکھنے میں نہ تو رکعتوں میں کوئی خرابی واقع ہوتی ہے نہ تسبیحات میں اور نہ ہی قرآن میں کوئی تشابہ پیش آتا ہے، یہ شیطانی چال ہے اور اس کا مقصد رکعات و تسبیحات اور متشابہات کی یاد دہانی نہیں ہے، بلکہ اس کی غرض اعلیٰ مرتبے سے ادنیٰ رتبے کی طرف لانا ہے، وَھَلُمَّ جَرًّا۔ تاکہ اپنے مقصد اصلی تک پہنچائے اور اس مردود کا مقصود حقیقی وہی کفر وانکار ہے، اگر بفضلہٖ تعالیٰ اس کا مقصد پورا نہیں ہوا تو مجبوراً بموجب "إذا فاتك اللحم فاشرب المرقة" (۱۴۸) آہستہ آہستہ نمازی کو گاؤخر کے خیال کی طرف لے جاتا ہے، تاکہ یہ صورت ثابت ہو جائے کہ ؎

برزباں تسبیح و در دل گاؤخر (۱۴۹)

گاؤخر (گائے، گدھا) ایک مثال ہے اس سے مراد ہر وہ چیز ہے جو خدا تعالیٰ کے علاوہ ہو خواہ گائے ہو یا گدھا، ہاتھی ہو یا اونٹ یا پھر کوئی اور شے۔

اور طلبہ یہ نہ سمجھیں کہ ہمارا صیغوں اور ترکیبوں میں غور و فکر کرنا اس قبیل سے نہیں ہے، بلکہ یہ تو گاؤخر کے خیال سے بھی زیادہ نماز میں خلل ڈالنے والا ہے۔

اور علماء یہ نہ باور کریں کہ ہمارا قرآن کریم سے نئے نئے مسائل کے استخراج کی فکر و کوشش تکمیل نماز ہے بلکہ تنقیص ہے۔ اور اہل مکاشفہ یہ نہ گمان کریں کہ نماز میں عالم

برزخ کے شیخ کی طرف توجہ کرنا یا ارواح وملائکہ سے ملاقات کی طرف دھیان لے جانا اس نماز کو حاصل کرنا ہے جو مومنوں کی معراج ہے، یاد رہے! یہ توجہ بھی شرک کا ایک شعبہ ہے، گو شرک خفی بلکہ شرک اخفی ہے۔

اس کلام سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ نادر مشکل مسئلوں کا ذہن میں آنا اور ارواح وملائکہ کا کشف نماز میں برا ہے، نہیں بلکہ اس کام کی طرف اپنے فکر وخیال کو لگا دینا اور نیت میں اس مدعا کو بھی شامل کر لینا مخلصین کے اخلاص کے منافی ہے، اور رہی بات درج بالا کشف اور نادر مسائل کے ذہن میں آنے کی تو وہ خلعت فاخرہ کی قبیل سے ہے جن سے مخلصین اور حضور حق میں مستغرق بندوں کو حق تعالیٰ کے الطاف وعنایات کی بہتات کے سبب نوازا جاتا ہے۔ لہٰذا یہ ان کے حق میں کمال ہے کہ مثال کی جگہ میں مجسم ہو گیا اور ان کی نماز ایک ایسی عبادت بن گئی جس کا نتیجہ ان کی آنکھوں کے سامنے ظاہر ہو گیا۔

البتہ ضرورتوں کے واسطے جو دعائیں باکمال نمازی کی طرف سے صادر ہوتی ہیں، گو ضرورتیں معمولی اور معاشی ہوں، اس اعتقاد کی بنا پر کہ صرف بے نیاز ذات ہی حاجت روا ہے، وہ اسی سلسلے یعنی کمال نماز سے ہے، اور ضرورتوں کے متعلق نفس سے مشورہ کرنا برے وساوس اور نقصانِ نماز کی قبیل سے ہے، اور جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ وہ لشکر کے ساز وسامان کی تدبیر نماز میں فرماتے تھے تو اس واقعہ سے دھوکا کھا کر اپنی نماز کو برباد نہیں کرنا چاہیے ؎

کار پاکاں را قیاس از خود مگیر — گرچہ ماند در نوشتن شیر وشیر (۱۵۰)

حضرت خضر علیہ السلام کے لیے کشتی کا توڑنا اور معصوم بچے کو مار ڈالنا بڑا ثواب ثابت ہوا اور دوسروں کے لیے گناہ عظیم، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو وہ مرتبہ حاصل تھا کہ لشکر کی تیاری نماز میں خلل انداز نہیں ہوتی تھی، بلکہ وہ بھی منجملہ نماز کو کامل کرنے والی باتوں میں سے ہوتی تھی، کیوں کہ وہ تدبیر آپ کے دل میں اللہ ربّ العزت کے ملہمات

میں سے تھی، بہ خلاف اس شخص کے جو خود دینی یا دنیاوی امور میں سے کسی امر کی تدبیر کی طرف متوجہ ہو، اور ہر وہ شخص جس پر یہ مقام منکشف ہوتا ہے وہ جانتا ہے، البتہ "ظلمات بعضها فوق بعض" کے تقاضے کے مطابق زنا کے وسوسے سے اپنی بیوی سے مجامعت کا خیال بہتر ہے، اور نماز کی حالت میں اپنی پوری توجہ و دھیان شیخ اور ان جیسے عظیم المرتبت اشخاص کی طرف گو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہوں، لگا دینا اور ان کے تصور میں گم ہو جانا ان کے بلند مرتبے کی وجہ سے گاؤخر کے خیال میں ڈوب جانے سے بدتر ہے (۱۵۱)، کیوں کہ ان ہستیوں کا خیال عظمت و جلالت شان کے ساتھ انسان کے دل سے چپکا ہوتا ہے بہ خلاف گاؤخر (دنیاوی خرافات) کے خیال کے، کیوں کہ نہ تو ان کی دل سے اس قدر وابستگی ہوتی ہے اور نہ ہی ان کی تعظیم ہوتی ہے بلکہ وہ حقیر و ذلیل ہوتے ہیں۔ اور غیر اللہ کی یہ تعظیم و تکریم جو نماز میں ملحوظ و مقصود ہو تو وہ شرک کی طرف کھینچ کر لے جاتی ہے۔

مختصر یہ کہ یہاں پر وساوس کے فرق مراتب کا بیان مقصود ہے، انسان کو چاہیے کہ ان سے واقف ہو اور کسی بھی رکاوٹ کے پیش آنے پر اللہ تعالیٰ کے استحضار و دھیان سے منحرف نہ ہو۔ الغرض یہاں پر نماز میں خلل ڈالنے والی باتوں کا علاج اس طریقے پر مقصود ہے جو ہر کس و ناکس کی سمجھ میں آ جائے۔

بہر کیف اگر وسوسہ انتہائی برا ہو تو غایت عاجزی و انکساری کے ساتھ دعا کرے، اگر چہ ہر چیز فضل خداوندی پر منحصر ہوتی ہے، لیکن بعض چیزوں میں ظاہری اسباب کا قدرے دخل ہوتا ہے اور ان کا حصول اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم پر موقوف ہوتا ہے اور ان وساوس کی مدافعت اسی قبیل سے ہے، اور اپنے شیخ سے عرض کرے، اس لیے کہ وہ اس سے زیادہ کام کا علم رکھنے والا ہے، شاید کوئی مفید تدبیر بتا دے اور اس کے حق میں دعا کر دے۔

اور اگر نفس یا شیطان کی طرف سے بیان کردہ وسوسے کے علاوہ کوئی اور وسوسہ پیش آئے تو اس کا علاج یہ ہے کہ اگر مثال کے طور پر ظہر کی فرض نماز میں وسوسہ پیش آیا تو

فرض وسنت سے فراغت کے بعد اس بات کی بھرپور کوشش کرتے ہوئے کہ وسوسہ نہ آنے پائے سولہ رکعات نماز پڑھے، یہ اس صورت میں ہے جب فرض کی تمام رکعتوں میں خیالات کا سلسلہ دراز رہا ہو، اور اگر تمام رکعات میں وسوسے نہ پیدا ہوئے ہوں، بلکہ بعض رکعتیں حضور قلبی کے ساتھ خیالات سے خالی ہوکر ادا کی ہوں اور بعض رکعتیں خیالات سے آلودہ ہوئیں ہوں تو جس رکعت میں وسوسہ پیش آیا ہو اس کے بدلے چار رکعت مقرر کر کے اس کے حساب سے پڑھے اور نماز عصر کا تدارک مغرب کے بعد کرے اور مغرب کا تدارک اس کے بعد کرے اور اسی قیاس پر عشاء اور فجر کی تلافی طلوع آفتاب کے بعد کرے، تاکہ نفل حرام نہ ہوں۔ اور چوں کہ یہ کام نفس پر گراں گزرے گا، اس لیے یقیناً وہ اس سے باز آجائے گا اور خود کو وساوس سے دور رکھے گا، اور جب نفس قابو میں آجائے تو اللہ تعالیٰ کا بہت شکر بجالائے اور نفس کی آؤ بھگت کرے اور آرام وراحت سے اس کی خاطر تواضع کرے اور شریعت کے مطابق اس کی خواہش پوری کرے۔

اور اگر تہجد گزار سے تہجد کی نماز نفس یا شیطان کی فریب دہی سے چھوٹ جائے تو اس کی صبح کو روزہ رکھے اور اگر روزے میں بھی کوئی نفسانی یا شیطانی خلل واقع ہو جائے تو اس کی تنبیہ اس روزہ سے ملحق رات کو مکمل شب بیداری کے ذریعے کرنا چاہیے۔ شیطان جب اپنا اثر ڈالنے سے مایوس ہو جاتا ہے تو نفس کو اپنا ساتھی بنا تا ہے، تاکہ اس کا مقصد پورا ہو، نفس کی تادیب وکارروائی میں دونوں شرارت سے باز رہتے ہیں، بلکہ نفس حکم الٰہی کا تابع دار بن جاتا ہے اور شیطان کو انسان میں حکومت کرنے کی طاقت نہیں رہتی ہے۔

## دوسرا افادہ: زکاۃ میں خلل ڈالنے والی باتوں کا بیان

اگر زکاۃ کی ادائیگی میں نفس بہانا کرے اور زکاۃ کو بوجھ سمجھے اور حکم الٰہی پر راضی وشاکر نہ ہو تو مال زکاۃ سے چار گنا زیادہ مال اللہ کے لیے خرچ کرے، تاکہ نفس دوسری بار بہانا نہ کرسکے اور اس کو سمجھادے کہ جس قدر تم بہانا کروگے اسی قدر میں مال خرچ کروں گا۔

## تیسرا افادہ: حج اور جہاد میں خلل ڈالنے والی باتوں کا بیان

حج اور جہاد جس وقت فرض ہو اور اپنے نفس کو اس کی ادائیگی پر چست و چالاک نہ پائے تو غور کرے کہ کونسی چیز ہے جس کے باعث نفس حج اور جہاد میں کوتاہی کر رہا ہے، اس چیز کو چھوڑ دے مثلاً اگر ریاست وحکومت رکاوٹ ہے اور وہ حکمرانی جسے وہ سیکڑوں لوگوں پر کرتا ہے، موقع نہیں دیتی ہے کہ چستی اور نشاط کے ساتھ حج و جہاد کا عزم کرے تو شکل وصورت، لباس و پوشاک اور نشست و برخاست میں غریبوں اور مسکینوں کے مانند بن جائے، اگر چہ حج و جہاد، بلکہ تمام عبادتیں نفس کی مزاحمت ومخالفت کے باوجود ادا ہو جاتی ہیں، لیکن جو رونق و برکت فرصت واطمینان میں حاصل ہوتی ہے وہ اس صورت میں میسر نہیں ہوسکتی، اور جب نفس رام ہو جائے اور عبادت میں نشاط واطمینان کے ساتھ قدم رکھے تو یہ بات عبادتوں کی رونق و برکات کا سبب بنتی ہے۔ اور اگر امور جہاد میں شامل ہونے کے باوجود نفس بخوبی اس کا حق ادا نہ کرے اور اپنی حفاظت چاہے تو جو کام زیادہ مشکل ہو مثلاً کافر رئیس کا قتل کرنا تو اس مشکل کام کو بہ جلدی پورا کرنا لازم اور ضروری سمجھ کر خفیہ طور پر خلوت میں اس کو انجام دے اور نفس کو سمجھائے کہ اگر تو سستی کرے گا تو اس طور پر تجھ کو ہلاکت کے راستوں میں ڈالوں گا، تاکہ تو باز آجائے، اس زمانے میں امور جہاد میں جدوجہد کرنا انتہائی اہم اور ضروری ہے۔

# چوتھی فصل

## طاعات وعبادات ادا کرنے کے طریقے کا بیان

یہ فصل ایک تمہید اور پانچ افادات پر مشتمل ہے:

### تمہید: تہذیب اخلاق اور ادائے طاعات سے اصل مقصود کیا ہے؟ اس کا بیان

تہذیبِ اخلاق سے اصل مقصود اور ادائے طاعات سے اصل مطلوب نفس کی اصلاح ہے، تاکہ نفس مطمئن ہو جائے اور رذائل سے پاک ہو جائے، اور رذائل سے تطہیر ہی اس کے واسطے فضائل سے آراستگی ہے۔ اور نفس کشی جو عام اہل سلوک کی زبان پر ہوتی ہے، وہ خطائے محض ہے، کیوں کہ نفس کُشی کا حکم نہ تو خدا تعالیٰ کی طرف سے ہے اور نہ ہی ایسا کرنا زندگی کے وجود کے لیے ممکن ہے، جو کچھ ممکن ہے وہ یہی ہے جس کا حکم دیا گیا ہے، یعنی نفس کی اصلاح کر کے اس کو احکام شرعیہ کا پابند بنانا، جیسے جاہل کو عالم بنانا۔ لہٰذا نفس کو مارنا غلط ہے اور وہ حضرات جو کچھ نفس کشی کے راستے میں دشوار ریاضتوں اور کم کھانے، پینے کا معمول رکھتے ہیں یہ بالکل غلط ہے، ان ریاضتوں سے نفس کشی نہیں ہوتی ہے، بلکہ انسان کی صحت مضمحل اور کمزور ہو جاتی ہے اور سخت عبادتوں کی قابل نہیں رہتی، بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ نفس چست ونشیط ہوتا ہے اور جب اس میں شکستگی در آتی ہے تو ایک طرح سے وہ شکستہ ہو جاتا ہے اور کئی طرح سے تازہ وتوانا رہتا ہے۔

### پہلا افادہ: نماز کا ذکر

ارکانِ اسلام کی اصلاح کا سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ ان ارکان کی عظمت کو

بخوبی ذہن نشیں کیا جائے اور جب ان میں بہت زیادہ فائدہ اور عزت نظر آئے گی تو ان کا اہتمام اور ان کی اصلاح کی تدبیر بھی اسی طرح سے خوب ہوگی۔ پس ارکانِ اسلام خصوصاً نماز کی عظمت کا ادراک جو ان میں سب سے اعلیٰ ہے، دشوار ہے، لیکن بحکم "ما لا یدرك کلّه لا یترك کله" قدرے نماز کی عظمت پر روشنی ڈالی جاتی ہے، اس کے بعد دوسرے ارکان کے بھی تھوڑے نمونے ذکر کیے جائیں گے۔

اوّلاً ایک مثال سن لینی چاہیے۔ مثلاً ایک بادشاہ ہے جس کی سلطنت وسیع اور رعایا ولشکر کثیر ہیں اور اس کے ہزاروں ہزار، بلکہ بیشمار کارخانے مختلف جگہوں پر قائم ہیں اور ہر کارخانے میں بھانت بھانت کے لوگ اپنے اپنے کام پر متعین ہیں اور ہر ایک کارخانے میں قسم قسم کی چیزیں تیار ہو رہی ہیں۔

کسان لوگ اچھے خاصے باہم فرق مراتب کے باوجود اپنے کام میں مشغول ہیں اور بیل بھی باہم بے شمار اختلاف کے باوجود ضروری کاموں میں لگے ہوئے ہیں۔ اسی طرح سپاہی ایک کام میں اور منشی دوسرے کام میں مصروف ہیں، ہر ایک کے لیے اس کے کام کے مطابق اجرت اور وجاہت مقرر ہے اور ہر ایک اس سبب سے بادشاہ کے دربار میں ایک تعلق اور ربط رکھتا ہے اور اس تعلق کی دستیابی سے خود میں پھولے نہیں سماتا اور اپنے کام کی کوشش پر ناز کرتا ہے، کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ بادشاہ بے پروا ہے، کسی کا محتاج نہیں ہے اور جو تعلق مجھ کو اس سے ہے وہ اس کی عنایات وتوجہات سے ہے اور میرے لیے سرمایۂ افتخار واعتبار ہے۔ البتہ ان تمام کارخانوں کے ملازمین کے واسطے باہم فرق مراتب ومدارج کے باوجود، اور باوجود اس بات کے کہ ان میں سے بعض اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں، ایک کام مقرر ہے، جس سے تجاوز ان کے لیے ممکن نہیں ہے اور اس بنا پر ان کی عزت واجرت میں کمی بیشی کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں ہوتا۔

بعد ازاں تصور کرنا چاہیے کہ اس نے ایک خاص چیلے کو اپنا نائب بنایا ہے اور اس

کو منصب خلافت عطا کیا ہے اور اس کو تمام کارخانوں کے قیام کا واسطہ بنا کر اس کی حاضری کے اوقات متعین کر دیے، تا کہ وہ ان اوقات کے مطابق حاضر ہو اور اپنی ضروریات پیش کرے اور بادشاہ سلامت کے احکامات کو سن کر سارے کارخانوں میں جاری کرے اور چوں کہ ہمیشہ اس کے لیے دربار میں حاضری کے اوقات متعین ہیں اور متعین کردہ اوقات پر حاضر ہونے کے سلسلے میں اس پر سخت تاکید ہے، اس لیے تمام اہل کارخانہ اس کی حالت کے نگراں اور اس کے مقام کے مشتاق ہوتے ہیں اور دربار میں ہر حاضری کے موقعے پر کسی انوکھی چیز اور بلند مرتبے کے ظہور کا احتمال رہتا ہے اور ان مقررہ وقتوں میں بادشاہ کی طرف سے اس پر کوئی خاص عنایت ہوتی ہے جو تمام کارخانے والوں کی آنکھوں کے سامنے ظاہر ہوتی ہے اور اسی سبب سے وہ خاص آدمی تمام رعایا، لشکر، سپاہی اور منشی میں معزز وممتاز ہوتا ہے۔

اسی طرح کل مخلوق کو پتھر سے لے کر فرشتہ تک، سمجھنا چاہیے کہ وہ احکام کے پابند ہیں، گو ملائکۂ مقربین کے لیے اعلیٰ منصب اور بڑے کام مقرر ہیں، لیکن وہ سب اپنے کام ومنصب سے تجاوز نہیں کر سکتے، حضرت جبرئیل علیہ السلام کو حضرت اسرافیل علیہ السلام کے کارخانہ میں کوئی دخل نہیں ہے اور اسی طرح حضرت اسرافیل علیہ السلام کو حضرت جبرئیل علیہ السلام کے امور میں کوئی دخل نہیں ہے۔

اور اسی قیاس پر جو مقام، راحت اور منصب حضرت جبرئیلؑ کو حاصل ہے، اس سے نہ وہ اوپر چڑھ سکتے ہیں اور نہ نیچے اتر سکتے ہیں، رہی بات زوال کی تو وہ اس وجہ سے وقوع میں نہیں آسکتا کیوں کہ وہ معصوم ہیں اور عدم عروج کے لیے معراج کا واقعہ گواہ ہے: ؎

اگر یک سرموی برتر پرم      فروغ تجلی بسوزد پرم (۱۵۲)

اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم صفی اللہ علیہ السلام کو خلافت کے لیے پیدا فرمایا، بے انتہا کمالات کی استعداد ان میں رکھی اور بہت سے کارخانوں کا مظہر بنایا اور عروج وزوال کو

انسانیت کے لیے اعزاز بتایا اور اس کے سب سے پہلے فرد جو حضرت آدم علیہ السلام ہیں ان کو ایک طرح سے اس کا مظہر اتم بنایا، تاکہ تمام افراد انسانی میں اس راز کی حقیقت کو جس کے وہ حامل ہیں جاری کرے، لہٰذا جیسا کہ بادشاہ کا خاص چیلہ امور مملکت کے ہر کام کو جو سلطنت کے تمام کارندوں پر منقسم ہے، انجام دے سکتا ہے مثلاً جو کام خدمت گاروں اور خواص سے متعلق ہیں جیسے مکھی اڑانا اور جوتے رکھنا وغیرہ تو یہ کام بوقت ضرورت اس خاص چیلہ سے بھی انجام پاتا ہے۔

اسی طرح وہ کام جو محافظوں اور قاصدوں سے متعلق ہیں جیسے کسی شخص کے پاس پیغام پہنچانا یا طلب کے وقت اس کو حاضر کرنا ایسے کام ضرورت کے وقت اس خاص چیلے سے بھی روشنی میں آتے ہیں۔ اور اسی طرح وہ کام جو منشیوں سے متعلق ہیں جیسے فرامین لکھنا، حساب وکتاب، آمدنی اور خرچ کو قلمبند کرنا، ان کاموں کو اس خاص چیلے سے بھی بوقت ضرورت لیا جاتا ہے، اور عظیم کام جیسے سفارت، انتظام سلطنت، لشکر کی قیادت اور وزارت سے متعلقہ امور کو انھیں پر قیاس کرنا چاہیے۔ اسی طرح باکمال افراد انسانی، تدبیر کرنے والے جمیع ملائکہ کی خدمات کو انجام دے سکتے ہیں، مثلاً کافروں سے جہاد کرنے یا انھیں ہلاک کرنے میں جو دعا اور جذبۂ خدمت غضب کے فرشتوں سے متعلق ہیں، وہ ان سے ظہور میں آتے ہیں اور منافع پہنچانے کی جو خدمات رحمت کے فرشتوں سے متعلق ہیں، وہ ان سے عمل میں آتی ہیں اور تسبیح واذکار کی بجا آوری میں عبادت کے سلسلے کی جو خدمت حمد وثنا بیان کرنے والے فرشتوں سے متعلق ہے، وہ ان سے رونما ہوتی ہے، اسی طرح تعلیم وتعلم اور ارشاد وتلقین کی قبیل کی جو خدمت خدّام وحی فرشتوں سے تعلق رکھتی ہے وہ ان کی ذات والا صفات سے انجام پاتی ہے اور عادلانہ حکومت اور بڑی خلافت قائم کرنا اور باطنی امامت اور نبوت ورسالت کے مناصب اور اولوالعزموں کے مراتب پر فائز ہونا اور خدمات کی آخری کڑی جو ملا اعلیٰ سے تعلق رکھتی ہے، یہ سب باتیں ان باکمال انسانوں سے بھی

منصۂ شہود پر آتی ہیں۔ ان کے علاوہ بقیہ تمام خدمتوں کا قیاس انھیں پر کیا جا سکتا ہے۔

خلاصۂ کلام یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے خلیفہ کے واسطے دربار میں حاضری کے لیے اوقات متعین کیے اور بطور وراثت اس استعداد کو تمام اولاد آدم علیہ السلام میں پوشیدہ رکھا اور اس کے اظہار کو ان کے اختیار پر موقوف کیا اور از راہ بے انتہا لطف و مہربانی رسولوں کی بعثت، کتابوں کی تنزیل اور ان جیسے ظہور استعداد کے دوسرے عوامل و محرکات کے ذریعے ان حاملینِ کتب اور نائبین نبی کی مدد فرمائی، پس پنج گانہ نماز کے اوقات جو اشرف المخلوقات کے لیے حضوری اور نہایت قرب کے اوقات ہیں اور اسی لیے خیر امت پر فرض ہوئے، وہی دربار میں حاضری کے اوقات ہیں۔ اور ہر شخص میں خلافت کا ایک حصّہ پایا جاتا ہے جو چاہے اس کو ظاہر کرے اور جو چاہے اس کو برباد کرے۔ "قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا" (۱۵۳) پنج وقتہ نماز میں جو بندوں پر فرض ہیں وہ تمام مخلوق پر انسان کی فضیلت و برتری کی معتبر گواہ ہیں، گو افراد انسانی باہم متفاوت اور مختلف ہوں، بلکہ بعض درجۂ سفلی میں اترتے اترتے اسفل السافلین تک پہنچ گئے ہوں، درحقیقت ان کے ادنیٰ ترین طبقے میں پہنچنے کا سبب بھی یہی ان کی بلندی ہے، اس لیے کہ شاہی دربار میں آمد و رفت رکھنے والے ملازمین ہی بڑی بڑی آزمایشوں اور سخت سزاؤں سے دوچار ہوئے ہیں۔ ع

ہم بیشتر عنایت و ہم بیشتر عنا (۱۵۴)

لہٰذا کمال ایمانی کے طلب گار مومن کو چاہیے کہ نماز کی حقیقت اس طور پر جانے کہ اللہ ربّ العزت کی سلطنت کی عظمت و وسعت اور اس کے جمیع اوصاف کی کوئی انتہا نہیں ہے، اس نے کل مخلوق سے میرا انتخاب کر کے سخت تاکید کے ساتھ اپنی بارگاہ میں حاضر ہونے کی مطلق اجازت مرحمت فرمائی ہے، اجازت لینے کا محتاج نہیں بنایا، پہرہ داروں اور دربانوں کی منت و سماجت سے بری کیا اور حاضر نہ ہونے کی صورت میں سخت وعید سنائی۔

لہٰذا خود کو اس نعمت عظمیٰ سے جو پورے عالم کے لیے رشک کا مقام ہے، محروم

کر کے سخت وعید کا مورد بننا کس قدر جہالت اور کس قدر نادانی کی بات ہے؛ اس طرح سے نماز کی عظمت کو سمجھ کر امورِ نماز کو غایتِ ادب اور خشوع وخضوع کے ساتھ جو بارگاہِ ایزدی میں قبولیت کے شایانِ شان ہوں بجالائے، اور خود کو خدائی کام کے حوالے کرتے ہوئے اوقات نماز کو بلاشبہ بارگاہِ ایزدی میں حاضری کا وقت تصور کرے اور تلاوت، تسبیحات اور دعاؤں کو باہم سرگوشی، گفت وشنید اور اپنی عرض معروضات خیال کرے، یہ ہے نماز کی اجمالی حقیقت۔ اور جہاں تک بالتفصیل اس کے ارکان کی حقیقت کا معاملہ ہے تو اس کی تفہیم کے لیے ایک مثال ذہن نشیں کر لینی چاہیے، وہ یہ ہے کہ جب بادشاہ کا خاص چیلہ سرگوشی کا عزم اور عرضِ احوال کا ارادہ کر کے اپنے آقا کے دربار میں حاضر ہو کر کمالِ خضوع اور تعظیم کے ساتھ کھڑا ہوتا ہے اور اس کے ماسوا سے اعراض کر کے اس کی سلطنت کی ہیبت وشکوہ کو اپنے پیش نظر رکھ کر اس سے سرگوشی کی امید لگائے رہتا ہے تو جیسے ہی وہ عالی جاہ بادشاہ اس کی سرگوشی کے ارادے پر مطلع ہوتا ہے اور اس کے عرضِ حاجات کی امید کو دیکھتا ہے، اس کی طرف اپنی خاص عنایت مبذول کرتا ہے اور قبولیت ومحبت کی نگاہ سے اس کو دیکھتا ہے اور جس قدر تعظیمی اقوال وافعال اس فرماں بردار چیلے سے صادر ہوتے ہیں اسی قدر عنایاتِ شاہی اس کے حق میں دوبالا ہو جاتی ہیں، پھر جب وہ فرماں بردار بندہ اپنے آقا کی عنایتوں کو اپنی جانب بیش سے بیشتر دیکھتا ہے تو تخت بوسی یا اس جیسے دیگر تعظیمی کام کے لیے جو اجازت طلبی اور عرض معروضات کا دیباچہ ہوتا ہے، جھکتا ہے اور اس تعظیم کے صادر ہونے کے باعث بادشاہ کی بے پایاں عنایات وتوجہات اس کی طرف متوجہ ہوتی ہیں اور مناجات اور ضرورتیں پیش کرنے کی اجازت اسے عطا کرتی ہیں، تو وہ فرماں بردار غلام مناجات کا اذن حاصل ہو جانے کے شکریے میں اپنے مولا کے شایانِ شان تعریف ومدح کرتا ہے اور ایسا کام کرتا ہے جس سے اس کے آقا کی تعظیم ظاہر ہو، پھر مناجات اور عرض حاجات میں مشغول ہو جاتا ہے۔

اور چوں کہ یہ وقت اس مطیع بندے کے انتہائی کمال اور اس عالی جاہ بادشاہ کی

بغایتِ قربت اور سلطنت کے رعب و دبدبے کے نہایت ظہور کا وقت ہوتا ہے، اس لیے مناجات اور عرضِ حاجات میں کچھ غلطی یا بھول چوک کا امکان رہتا ہے۔لہٰذا باری تعالیٰ اس کو حکم دیتا ہے کہ مناجات سے فارغ ہو کر اپنی عقل و خیال کو درست کر کے مقامِ قرب میں داخل ہو جاؤ، تاکہ جو بھول چوک ہوئی ہو بخوبی اس کی تلافی ہو سکے۔

اور جب اس طرح کے قرب و وصال کے حالات اس فرماں بردار غلام پر بار بار مسلسل وارد ہوتے ہیں تو حسن معاملہ، قدر دانی اور از دیاد قبولیت کا قاعدہ اس کا تقاضا کرتا ہے کہ اس غلام کا اعزاز و اکرام کیا جائے، اسے بیٹھنے کی اجازت دی جائے، لیکن چوں کہ دربار شاہی میں بیٹھنا کمالِ بے ادبی ہے۔لہٰذا حکومت کی حکمت اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ اس غلام کو ایسی خدمت کا حکم دیا جائے جو بیٹھنے کے مناسب ہو، مثلاً حاکم اس کی طرف اپنا پاؤں پھیلا دیتا ہے، تاکہ ادائے خدمت کی تقریب میں وہ خاموش نہ بیٹھے۔

اسی طرح جب مومنِ پاک، شرک سے بری، صحیح العقیدہ، خالص النیۃ، بدعات سے مجتنب، رذائل سے دور اور فضائل سے آراستہ ہو کر اپنے نفس کو بہیمی آلودگیوں اور معنوی ناپاکیوں سے صاف کر کے اور اپنے بدن کو نجاست حقیقیہ و حکمیہ سے پاک کر کے اور اپنے دل کی تختی کو ماسوا اللہ کی طرف التفات کے نقوش سے دھو کر اور اپنے دل کو غیر اللہ کے علائق سے شفاف کر کے اپنے دل و جسم سے اللہ کی طرف متوجہ ہو کر نہایت محبت و شوق سے "اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ" (۱۵۵) کو اپنے تہِ دل میں راسخ کر کے تکبیر تحریمہ کہتا ہے، تو صرف اسی تکبیر کی وجہ سے رحمت الٰہی جوش میں آجاتی ہے اور اس کی طرف خصوصی عنایت متوجہ ہونے لگتی ہے، حدیث "إذا صلّی أحدکم فلا یتنخّمنّ قبل وجهه فإن اللّٰه بینه وبین القبلة" (۱۵۶) اور ایک روایت میں ہے "فإنّ الرحمة تواجهه" (۱۵۷) اسی بات کی طرف اشارہ ہے۔اور جس قدر تعظیمی اقوال، تلاوت کلام پاک اور دعائیں اس سے سرزد ہوتی ہیں، اسی قدر عنایت رحمانی اور

فیضِ یزدانی اس کے حق میں مبذول ہوتی ہیں، یہاں تک کہ وہ رکوع کو جو غایتِ تعظیم کا توطیہ اور نہایت قرب کی تمہید ہے، جس سے میری مراد سجدہ ہے، بجالاتا ہے اور جب وہ اپنی عقل خالص سے غور کرتا ہے کہ باری تعالیٰ نے سجدے جیسا بلند مقام کی مطلقاً اجازت مرحمت فرمادی اور کوئی رکاوٹ قائم نہیں کی ہے تو اس بڑی نعمت کے شکریے میں سیدھا کھڑا ہوکر اس کے شایانِ شان حمد وثنا کرتا ہے اور پھر بے حیثیت مٹی پر اپنی پیشانی رکھ کر مناجات اور عرضِ حاجات میں مشغول ہوجاتا ہے۔

اور چوں کہ سجدہ نہایت قرب اور تجلیات جمالی وجلالی کے ظہور کا وقت ہوتا ہے اس لیے حاجت طلبی میں کچھ سہو کا امکان رہتا ہے، اسی بنا پر اس کو حکم دیا گیا کہ تھوڑی دیر کے لیے اس بلند مقام سے کنارہ کش ہوکر پھر دوبارہ اسی بلند مقام کی طرف لوٹ جائے، تاکہ عرض حاجات میں جو بھول چوک ہوئی ہو اس کا تدارک ہوسکے۔ جب وہ مومن پاک ان پسندیدہ حالات سے بار بار ہم کنار ہوتا ہے جن کی ادنیٰ تکرار دو رکعت والی نماز میں پیش آتی ہے، تو وہ بیٹھنے کی قابلیت پیدا کرلیتا ہے، اس لیے کہ تکرار شدت فرماں برداری پر دلالت کرتی ہے، بخلاف اس کے کہ تعظیمی کام اس سے ایک بار صادر ہوئے ہوں تو اس صورت میں اس کا احتمال رہتا ہے کہ وہ تعظیمی کام اس سے اتفاقاً صادر ہوگئے ہوں۔

اور عظیم قاعدہ وقانون کے پاس ولحاظ کے لیے قعود کو عبادات سے خالی نہ چھوڑ کر تشہد پڑھنے کا حکم دیا گیا، جو نہایت تعظیمی باتوں پر مشتمل ہے۔ اور قومہ میں بھی ایک راز پنہاں ہے، اس کی وضاحت یہ ہے کہ نماز کے ہر رکن میں ایک نئی لذت اور تازہ حلاوت پائی جاتی ہے، اس لیے ضروری ہوا کہ رکوع کو سجدے سے کسی اجنبی فعل کے ذریعے ممتاز کیا جائے، تاکہ مصلّی کو ہر رکن کا مزہ مستقل حاصل ہو اور اسی طرح دونوں سجدوں کے درمیان جلسے میں بھی ایک راز پوشیدہ ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ جب کوئی معمولی شخص دفعتاً بلند مقام پر فائز ہوجاتا ہے مثلاً اس کی رسائی شاہی دربار تک ہوجاتی ہے یا اس پر دستار باندھ

دی جاتی ہے، تو اس کے ہم عمر اور معاصرین اس معاملے کو ایک امر اتفاقی خیال کرتے ہیں اور جب یہ معاملہ بار بار پیش آتا ہے تو ان کا باطل خیال زائل ہو جاتا ہے۔

اسی طرح جب اس حقیر مٹی سے بنے ہوئے انسان کو قرب کے اعلیٰ مناصب سے جو سجدہ میں حاصل ہوتا ہے، نوازا جاتا ہے تو سارے لوگوں کے دلوں میں، بلکہ خود اس مصلّی کے دل میں بھی ایک امر اتفاقی کا خیال گزرتا ہے۔ لہٰذا اس گمان کو دور کرنے کے لیے اس پاک مومن کو ہر رکعت میں دو بار اس خلعت فاخرہ سے نوازا جاتا ہے۔ یہ ارکانِ نماز کے اسرار کی طرف ایک اجمالی اشارہ ہے اور رہی بات اس کی تفصیل کی تو جگہ کی تنگی کی بنا پر اس کو اہلِ عقل و دانش کے فہم و شعور کے حوالے کیا جاتا ہے۔

جب سچا مسلمان نماز کی اس حقیقت سے بخوبی واقف ہو کر اس کی پابندی کرے گا تو اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے امید ہے کہ اپنی استعداد کے موافق سچے الہامات سے نوازا جائے گا۔ یہیں سے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے اس قول "أجَهِّزُ جيشي في الصلوٰة" (۱۵۸) کی حقیقت کو سمجھ لینا چاہیے کہ وہ نماز میں مسلم لشکروں کی تدبیر جو اسلام کی شان و شوکت میں اضافے کا سبب ہے، فرماتے تھے۔ لہٰذا جس قدر فتوحات اور اشاعت اسلام ان کے دورِ خلافت میں ہوئی اس قدر فتوحات اور اسلام کی اشاعت کسی اور عہد میں معلوم نہیں۔

غرض انسان کے دل میں ایمان اس تخم کے مانند ہے جو زمین میں پوشیدہ ہو، جیسے ہی اس نے کلمۂ شہادت پڑھا اور اس کی بندگی خدائی عالموں میں مشہور و معروف ہوئی ویسے ہی زبان حال سے اس کی بندگی اور قبولیت کی مبارک بادی ملاء اعلیٰ کی طرف سے اسے پیش کی گئی اور ساری دنیا والوں نے اس مبارک بادی کو سنا، صرف کلمۂ شہادت کے صادر ہوتے ہی اس کے دربار میں پانچ وقت حاضر ہونے کا حکم دیا گیا، پاکی کے بہت سے ان احکام کے ساتھ جو اس کی بارگاہ میں رسائی کا دیباچہ ہے، اور اسے قولی و فعلی آداب اور سری و جہری عرض داشت کی تعلیم سے آراستہ کیا گیا۔

دوسرا افادہ: زکاۃ کا ذکر

چوں کہ آیت کریمہ "جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيَامًا" (۱۵۹) کے مطابق مال و دولت اس دنیاوی زندگی کا ستون ہے، اس لیے اس سے بالکل علاحدگی کا حکم نہیں دیا گیا، اور بسا اوقات انسان جب اسلام قبول کرتا ہے اسی وقت مالدار ہوجاتا ہے، یا پہلے سے مالدار ہوتا ہے، اس لیے زکاۃ کو نماز کا ضمیمہ فرمایا، تاکہ مال مردِ مسلماں کے حق میں ایک قسم کی ہمیشہ کی حاضری بن جائے، جو اکثر و بیشتر غفلت و بیگانگی کا سبب بنتا ہے اور اس کی محبت آئینہ دل کے لیے زنگ کا باعث ہوتی ہے۔

اس کی تشریح یہ ہے کہ جب کسی شخص نے اسلام قبول کیا اور جان گیا کہ مجھے ارکانِ اسلام کی تعمیل کا حکم دیا گیا ہے، اور اہم ارکان کا اہتمام جن میں سے ایک زکاۃ بھی ہے، اس نے دل میں جگہ بنالی تو اسی وقت اموال کی اجناس کی چھان بین کرے کہ کونسا مال زکاۃ کی قبیل سے ہے اور کونسا نہیں ہے، اور جو مال زکاۃ کی قسم سے ہے وہ کتنی مقدار میں ہے اور اس مقدار پر کس قدر زکاۃ فرض ہے اور حولانِ حول جو زکاۃ کی ایک شرط ہے وہ کب سے شروع ہوتا ہے؟ جب تک یہ فکر و اہتمام اسے حاصل رہے گا، گو وہ دولت بڑھانے کی تدبیر میں ہو، ان اوقات میں بھی ایک طرح سے اسے بارگاہِ خداوندی میں حاضری میسر ہوگی، اور جب وہ فرضیت کا مطلب بخوبی سمجھ لے گا یعنی کہ فرض اللہ کے احکام میں سے ایک حکم ہے اور اس بنا پر اس کی بجا آوری مجھ پر لازم ہے تو دوسری نیتیں جیسے ثواب کی نیت، فقیر کی ضرورت پوری کرنے کی نیت، یا صلہ رحمی یا اپنی شہرت کی نیت وغیرہ ادائے امر الٰہی کی نیت کے پہلو میں کمزور یا کالعدم ہوجائے گی اور مطلق بے نیاز ہستی کی بے نیازی کا یقین اسے حاصل ہوجائے گا، تو وہ جان لے گا کہ اس قدر مال مجھ پر بطورِ تحفہ اور ہدیہ کے مقرر ہے، تاکہ میں اس کے دربار میں حاضر ہوسکوں، نیز اس نے مجھ پر اپنا عظیم انعام بڑھانے کے لیے زکاۃ کو فرض کی ہے۔ اسی وجہ سے درحقیقت زکاۃ کا لینا امام اور خلیفہ کا حق ہے، گویا وہ

خدا کے ہاتھ میں دیتا ہے، جیسا کہ قرآن وحدیث اس پر دلالت کرتے ہیں۔ لہٰذا ہر سال زکاۃ ادا کرنے کے سلسلے میں مسلمان کا حال اس شخص کے مانند ہے جس کو بے پروا عالی جاہ بادشاہ کے دربار سے تاکیدی حکم دیا گیا ہو کہ اپنی زیر ملکیت اشیاء میں سے اس قدر مال خوشی یا جشن کے موقع پر بطور نذرانہ ہمیں پیش کرنا ہوگا، تا کہ ہم اپنے دستِ عنایت سے اسے قبول فرما کر تم پر اپنی عنایات وتوجہات کی بارش کرے۔

پس دوسرے کارخانوں والے جن سے خوشی یا جشن کے موقع پر اس طرح کی نذر مطلوب نہیں ہے، بلکہ وہ ادا بھی نہیں کر سکتے، مگر علو منصب، کمال عزت اور محبت جو شاہی دربار میں ہوتی ہے اس سے وہ ہم کنار ہوتے ہیں، اور زکاۃ دینے والا مسلسل ترقی کے راستہ پر گامزن رہتا ہے، مالوں میں عین مشغولیت کے وقت بھی غفلت اس کے پاس نہیں پھٹکتی ہے۔

**فائدہ:** جس طرح صاحب اقتدار اور سخاوت شعار سلاطین نذو نیاز کے مالوں کو اپنے مصارف میں خرچ نہیں کرتے ہیں بلکہ تمام باعزت وصاحب شرف افراد جیسے ذی رتبہ شہزادے اور بڑے امراء کے مخارج میں بھی خرچ کو پسند نہیں کرتے ہیں، بلکہ ان کے نزدیک ان جیسے مالوں کے مصارف صرف حاجت منداور قابل داد ودہش لوگ ہیں۔ اسی طرح شہنشاہ عالی نے اموالِ زکاۃ کو پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم پر حرام کر دیا، کیوں کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مصرف درحقیقت اللہ کا مصرف ہے اور اسی طرح سارے بنو ہاشم پر زکاۃ کے مال کو حرام قرار دیا جو کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے برادرانہ و پسرانہ تعلق رکھتے ہیں، اور ان مالوں کے مصارف صرف ضرورت منداشخاص کو بتایا، لہٰذا جن لوگوں پر زکاۃ وصدقات لینے کو حرام قرار دیا گیا ہے انھیں اس قدر عز وشرف حاصل ہے کہ اس کا شکر کسی زبان سے نہیں ادا ہوسکتا، اگر وہ فقط اس نعمت کے مقابلے میں سیکڑوں قسم کی عبادتیں اور ہزاروں قسم کی طاعتیں بجالائیں تو یہ ان کے لیے موزوں ہے، تو پھر اس بڑی نعمت کا مقابلہ ناشکری اور نافرمانی سے کرنا کس درجہ نالائقی کی بات ہے۔

## تیسرا افادہ: روزے کا ذکر

ماہِ رمضان کے روزے کی فرضیت میں ایک طرح سے مردِ مومن کی توجہ پورے سال حکمِ الٰہی اور اس کی تعظیم کی طرف لگی رہتی ہے، وہ انتظار میں رہتا ہے اور تیاری کرتا ہے کہ جب رمضان آئے گا تو میں ایسا ایسا کروں گا، یعنی روزہ رکھوں گا، نماز تراویح پڑھوں گا اور قرآن کی تلاوت کروں گا۔ اس انتظار و تیاری اور اخلاصِ نیت میں لوگوں کی حالتیں مختلف ہوتی ہیں اور انھیں کے مطابق ان کی مقبولیت کے مدارج بھی مختلف ہوتے ہیں، اس پورے سال انتظار کی وجہ سے روزہ زکاۃ کی مشابہت رکھتا ہے، جیسا کہ پیچھے زکاۃ کے بیان میں لکھا گیا۔

اور اگر چہ روزہ ہر امت پر فرض تھا، لیکن اس امت کے لیے ماہِ رمضان کی تخصیص اللہ تعالیٰ کے اس بے پایاں فضل و کرم کی وجہ سے ہے جو اس امت مرحومہ پر جاری و ساری ہے، اس امت کی جسمانی کمزوری، کم عمری، کوتاہ ہمتی اور بالا استقلال دشوار اعمال کی توفیق کو دیکھتے ہوئے رمضان المبارک اور شبِ قدر مقرر ہوئی تا کہ بہت سے مشکل اعمال کیے بغیر ماہِ رمضان اور شبِ قدر کی برکت سے اگلوں کی طرح درجاتِ عالیہ، بلکہ ان سے بھی اعلیٰ ترین درجات پر فائز ہو سکیں، ہر سال نفس پر ایک بار ایک زوردار تھپڑ پڑتی ہے جس کا اثر پورے سال رہتا ہے اور ان کی شہوت، غصہ اور حرص کی اصلاح ہوتی ہے، گو ہر انسان اس سے واقف نہ ہو۔

## چوتھا افادہ: حج کا ذکر

جہاں تک حج کا تعلق ہے تو اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی بادشاہ کوئی جگہ متعین کرے اور اس کو اپنی بے انتہا مہربانیوں کا مورد ٹھہرائے اور جس شخص کو وہاں آنے کی دعوت دے اس پر خوب توجہ فرمائے اور ہم عصروں میں اس کو معزز و مکرم بنا دے، یہاں تک کہ اگر کوئی شخص بغیر دعوت کے بھی وہاں پہنچ جائے اس پر بھی اس کی لیاقت کے موافق عنایت کرے اور ایک طرح سے اس کو بھی اس کے ہم عصروں میں عزت و عظمت سے ہم کنار کرے اور اس کو اعزازات و توجہات سے بالکل تہی دامن نہ چھوڑے۔

غرض اس نے اس مقام کو خوان یغما یعنی عام ستر خوان بنا دیا ہو، لہٰذا جو شخص دعوت کی بنا پر وہاں حاضر ہو اس پر اس کی حالت کے موافق عزت وانعام فرماتا ہے اور جو شخص بغیر بلائے آیا ہو اس کو اس کے حال کے موافق ایک طرح کی عزت وانعام سے نوازتا ہے۔

اسی طرح شہنشاہ مطلق نے خانۂ کعبہ اور اس کے اطراف کو جس کو حرم کہتے ہیں، تمام کرۂ ارض سے ممتاز کر کے اپنے الطاف وعنایات کا مورد بنایا ہے اور خوان یغما کی طرح ہر چھوٹے بڑے کے لیے عام کر دیا ہے، لہٰذا جو طلب کی بنا پر وہاں حاضر ہوتے ہیں وہ انسان ہیں جو قسم قسم کی الٰہی نعمتوں سے نوازے جاتے ہیں، انھیں میں سے مغفرت عامہ ہے، ان کے سارے گناہ معاف ہو جاتے ہیں اور وہ گناہوں کی معافی کی وجہ سے ایسے ہو جاتے ہیں گویا کہ وہ ابھی پیدا ہوئے ہوں، جن پر کوئی گناہ نہیں ہوتا۔ اور آیندہ بھی اللہ تعالیٰ کی عنایت وتربیت ان کے شامل حال ہوتی ہے اور جو شخص بغیر بلائے وہاں آیا ہو جیسے حیوانات ونباتات تو وہ حرم کی حرمت کی وجہ سے معزز ہو کر اپنے ہم جنسوں سے ممتاز ہو جاتے ہیں۔

لہٰذا مومن پاک کو چاہیے کہ اس امر عظیم یعنی پروردگار عالم کا برائے اعزاز واکرام ایسے ناچیز کو اس قدر بابرکت مقام میں بلانے کا تصور کرے اور حج کی عظمت کو اپنے دل میں پختہ کر لے۔

## پانچواں افادہ: جہاد کا ذکر

معلوم ہونا چاہیے کہ جہاد ایسی چیز ہے جس کے فوائد ومنافع بے شمار اور لامتناہی ہیں، اس کا فائدہ کئی وجوہات سے پوری انسانیت کو پہنچتا ہے، اس کی مثال بارش کی سی ہے، جس کا نفع نباتات وحیونات اور انسان سب کو پہنچتا ہے۔ اس عظیم شے کے منافع کی دو قسمیں ہیں۔

**۱۔ منفعت عامہ:** جس میں فرماں بردار مسلمانوں، سرکش کافروں، اہل فسق ونفاق بلکہ جن وانس اور حیوانات ونباتات سب کا حصہ ہوتا ہے۔

**٢۔ منفعت مخصوصہ:** جو خاص جماعتوں کو حاصل ہوتی ہے، یعنی بعض اشخاص کو ایک طرح کا فائدہ پہنچتا ہے اور دوسرے لوگوں کو دوسری نوع کا۔

جہاں تک نفع عام کی بات ہے تو اس کی تفصیل یہ ہے جیسا کہ صحیح تجربہ سے ثابت ہوا ہے کہ حاکموں کی انصاف پروری، اہل معاملات کی دیانت داری، اربابِ ثروت کا جود وسخا اور تمام لوگوں کی نیک نیتی کے باعث آسمانی برکتیں نازل ہوتی ہیں، مثلاً وقت پر بارش کا برسنا، پیداوار کی کثرت، لین دین اور کاروبار کی گرم بازاری، آفت ومصیبت کا دور ہونا، مال ودولت کی فراوانی اور اربابِ ہنر وکمال کی بہتات ہوتی ہے۔ اسی طرح ان کے مانند بلکہ ان سے کئی گنا زیادہ دین حق کی شان وشوکت، دین دار بادشاہوں کا عروج، زمین کے اطراف واکناف میں ان کی حکومت کا قیام، دینی لشکروں کی قوت اور گاؤں وشہروں میں احکام شرعیہ کی نشر واشاعت کے سبب آسمانی برکتوں کا نزول ہوتا ہے۔

چنانچہ برکات سماویہ کے نزول کے لحاظ سے ہندوستان کی حالت کا موازنہ روم وترکستان سے کرنا چاہیے کہ اس وقت یعنی ۱۲۳۳ھ میں ہندوستان کا اکثر حصہ دارالحرب بن چکا ہے اور آسمانی برکتوں کے نزول، اولیائے عظام اور علمائے کرام کے ظہور کے لحاظ سے اس ملک کے حالات کا مقابلہ دو تین سو سال پہلے کے حالات سے کرنا چاہیے۔

جہاں تک نفع خاص کی بات ہے تو اس کا حصول شہیدوں، غازیوں، ذی اقتدار بادشاہوں اور میدان جنگ کے بہادروں کی نسبت محتاج بیان نہیں۔ اربابِ باطن کو اس طرح فائدہ ہوتا ہے کہ مختصر وقت میں بڑی ترقیاں حاصل کر لیتے ہیں اور تھوڑی ریاضت کے نتیجے میں ولایت کے بلند مراتب پر فائز ہو جاتے ہیں، اور جہاں تک علما کے نفع کا تعلق ہے تو ان کا نفع یہ ہے کہ علوم دینیہ کی خوب نشر واشاعت ہوتی ہے، پڑھانے والے اور پڑھنے والے کی کثرت ہوتی ہے، علماء احتساب وقضا اور اجتہاد وافتاء کے درجے اور باطنی امامت کے منصب پر فائز ہوتے ہیں۔ یعنی ملتِ اسلامیہ کی طرف عام دعوت اور اسلامی عقائد واحکام کی

اشاعت کے باعث نیابتِ انبیاء کا حصول اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا ظہور ہوتا ہے۔

جہاں تک نیک عوام کے نفع کا تعلق ہے تو یہ ہے کہ نیک لوگوں کی عزت اور فاسق و فاجر کی اہانت اور اچھی باتوں کی شہرت اور بری باتوں کی کمیابی کے باعث ان کی رغبت صلاح و تقویٰ کی طرف زیادہ ہوتی ہے۔ نیز مسلم بادشاہوں کی اطاعت، علمائے کرام اور اولیائے عظام کے احترام اور اسلامی جماعت میں مکمل دخول کے سبب ان کی طاعت و عبادت کا ثواب دوگنا ہو جاتا ہے۔

اور رہی بات عام مسلمانوں کی نسبت نفع کی تو دین حق کے انوار و برکات، سخی مطلق کے الطاف و عنایات اور شرعی قوانین کی پیروی کی وجہ سے گو بطور مجبوری ہو، معاملات میں ان کی نیت درست ہو جاتی ہے اور ان کا دل نیک کاموں کی طرف مائل ہوتا ہے، نیز ان کی دنیاوی زندگی بھی آسمانی برکتوں کے نزول، ذی اقتدار بادشاہوں کی عدل گستری اور اہل جود و سخا کی سخاوت کی بدولت درست ہو جاتی ہے اور ان کے دینی و دنیاوی امور کے انتظامات قوانین شرعیہ کی پابندی کے باعث خوشگوار ہو جاتے ہیں۔

جہاں تک گنہگاروں کے فائدے کا تعلق ہے تو انھیں توبہ کی توفیق نصیب ہوتی ہے یعنی دین حق کی شہرت کی بنا پر تمام لوگوں کے ذہنوں میں برے اعمال کی قباحت پختہ ہو جاتی ہے، جس کے سبب ان کے دلوں میں فسق و فجور سے نفرت اور اسلامی تعلیمات سے محبت پیدا ہو جاتی ہے۔

اسی طرح فسّاق حدود و تعزیرات کے نفاذ یا عار کے خوف سے یا معاصی و بدعات کی برائی واضح ہونے کے باعث یا دوست و احباب کی طعن و تشنیع کے خوف سے بدعات و منکرات سے باز رہتے ہیں۔

اور رہی بات منافقوں کے فائدے کی تو وہ قتل کے خوف یا اہل ایمان کی عزت اور اہل طغیان کی ذلت کے سبب بظاہر دین اسلام پر چلتے ہیں اور علانیہ کافروں کی جماعت

میں شامل ہونے سے باز رہتے ہیں۔ نیز دین حق کے انوار کی ہمہ گیری، آسمانی برکتوں کے نزول اور مسلمانوں کی شان وشوکت کے ملاحظے کے باعث اور اولیاے عظام وعلماے کرام سے اختلاط اور ان بزرگوں کے مواعظ سننے کے باعث ان کے دلوں میں دینِ حق کی روشنی سرایت کر جانے کی امید رہتی ہے۔

اور جہاں تک ذمی کافروں کے نفع کا تعلق ہے تو آسمانی برکتوں کے نزول، کاروبار کی گرم بازاری، بادشاہوں کی انصاف پروری، چوروں اور ڈاکوؤں سے اطمینان کے باعث ان کی معاشی حالت قابلِ رشک ہوتی ہے، اسی طرح اہل حق سے رابطہ رکھنے، ان کے طور طریق کے مشہور ہونے اور شریعت کی پیروی کے سبب ان کے دینی ودنیاوی معاملات کے حسن انتظام کے باعث اِن کے دلوں میں بھی اسلام کی طرف میلان اور رغبت پیدا ہونے کی امید ہوتی ہے۔

اور رہی بات حربی کافروں کی نسبت جہاد کے فائدے کی تو یہ ان لوگوں کے حق میں جو جہاد میں مسلمانوں کے ہاتھ سے مارے گئے، مفید ہے اگر چہ ایسے لوگوں کی تعداد بہت کم ہوتی ہے بالخصوص دوسری جانب شان وشوکت کے ظہور کے وقت مقتولین کی تعداد فرار ہونے والوں کے مقابلے میں نہایت کم ہوتی ہے۔

غرض یہ جہاد ان مقتولین کے حق میں عذاب کی تخفیف اور کمی کا باعث ہوگا، کیوں کہ اگر وہ مارے نہیں جاتے تو ایک مدت تک کفر پر قائم رہتے، لہٰذا ان کا کفر ضرور دن بہ دن بڑھتا جاتا اور جس قدر کفر زیادہ ہوتا اسی قدر وہ زیادہ عذاب سے دوچار ہوتے، اور جہاد کا فائدہ ان کے گھر والوں کو بھی ہوتا ہے اس طور پر کہ وہ غلام بنائے جانے کی وجہ سے اہلِ حق کے ساتھ رہتے ہیں۔ لہٰذا ان کے حق میں مسلمانوں کی صحبت کا اثر ہونے کا گمان ہوتا ہے۔

یہاں جہاد کے تھوڑے بہت فوائد ذکر کیے گئے اور رہی بات اس کی تفصیل کی تو یہاں اس کا احاطہ نہیں کیا جاسکتا۔

خلاصۂ کلام یہ کہ نظامِ شریعت میں مسلمانوں پر جہاد کی فرضیت اور قیامت تک اس کو قائم رکھنے کا حکم نظامِ فطرت میں بارش اور دریا کی موجوں کی طرح ہے۔ البتہ چند فاسدالاستعداد افراد کی ہلاکت یعنی وہ بعض مسلمان جو وقوعِ جہاد سے رکاوٹ بنتے ہیں اور اپنی باطنی خباثت، مسلمانوں سے حسد اور کافروں سے محبت کی بنا پر خود کو ابدی ہلاکت کے گڑھے میں ڈالتے ہیں اور خبیث منافقوں کی جماعت میں شامل ہوتے ہیں۔ ان کا یہ عمل جہاد کے عمومی فائدے میں خلل انداز نہیں ہو سکتا۔

دیکھئے! یہی بارش ہے جو بلاشبہ تمام لوگوں کے حق میں مفید ہے باوجود یہ کہ عمارتوں کے انہدام، سیلاب اور ندیوں کی طغیانی کے باعث بعض اشخاص زندگی سے ہاتھ بھی دھو بیٹھتے ہیں۔

# خاتمہ

# متفرق فوائد کا بیان

## اس میں پانچ افادات ہیں:

### پہلا افادہ: گیت سننے کا بیان

واضح رہے کہ بغیر مزامیر (میوزک) کے گیت سننا اور بغیر شہوت کے بے ریش لڑکوں سے ملنا جلنا اگرچہ حرام نہیں ہے، لیکن اس قسم کی باتیں راہ حق کے سالکین کے حق میں، خصوصاً راہِ نبوت کے طالبین کے حق میں نقصان سے خالی نہیں ہیں، اس طرح کے امور مبتدیوں اور منتہیوں سب کے حق میں ضرر رساں ہیں۔ جہاں تک مبتدیوں کے حق میں نقصان کی بات ہے تو اس کی تشریح یہ ہے کہ تمام روحانی اطباء اس بات پر متفق ہیں کہ سلوک کا راستہ طے کرنے والوں کے لیے حقوق نفس کا پورا کرنا ضروری ہے اور حظوظ نفس کی پیروی نقصان دہ ہے، خاص طور پر وہ حظوظ جس کی لذتیں صلب تک پہنچتی ہوں اور جس کی حلاوت دل کی تہہ تک سرایت کر جاتی ہو اور نفس اس کی طلب میں حیران و سرگرداں رہتا ہو۔ اور یہ بالکل ظاہر ہے کہ درج بالا باتیں حقوق نفس کی قبیل سے نہیں ہیں، کیوں کہ انھیں چھوڑنے سے کبھی جسم میں کمزوری پیدا نہیں ہوتی ہے جیسا کہ آب وطعام کے ترک سے بدن ناتواں ہو جاتا ہے اور اسی طرح کبھی بھی ان کے ترک سے عقل وشعور کی پراگندگی اور طبیعت کی بے چینی وجود مین نہیں آتی ہے جیسا کہ آرام ونیند کے چھوڑنے کے باعث عقل وحواس کی پریشانی اور طبیعت کی بے قراری وقوع پذیر ہوتی ہے اور کبھی بھی انھیں چھوڑنے کی بنا پر حرام کاموں میں پڑنے کا ڈر نہیں ہوتا ہے جیسا کہ جماع کے ترک سے ان کا اندیشہ رہتا ہے۔

خلاصۂ کلام یہ کہ اس قسم کی باتوں کو کوئی بھی عقلمند شخص حقوق نفس میں سے شمار نہیں کرسکتا ہے بلکہ یہ سب حظوظ نفس کی قبیل سے ہیں، جن سے بچنا طالب کے لیے انتہائی ضروری ہے، کیوں کہ دلکش آواز اور حسین صورت کا تعلق ان امور سے ہے جن کی لذت دل کی تہہ تک پہنچتی ہے اور جن کا اثر لمبے عرصے تک دل کے نہاں خانے میں قائم رہتا ہے اور نفس کو ان کی طلب میں جوش اور سرگردانی ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں اس قسم کی باتیں ان مباحات میں سے ہیں جن کا ایک سرا ممنوعات شرعیہ سے ملا ہوا ہے اور بعض اوقات بعض اشخاص کو کشاں کشاں معاصی کی طرف لے جاتی ہیں مثلاً گانا سننے سے گہرا تعلق مزامیر سننے کا عادی بنا دیتا ہے اور تنہائی میں نوعمر لڑکوں سے زیادہ میل جول کے باعث شہوت پیدا ہوتی ہے جو اہلِ خرد اور تجربہ کاروں پر پوشیدہ نہیں۔

ان جیسے جائز کاموں سے بچنا اہلِ تقویٰ وصلاح کا شیوہ ہے، جیسا کہ بہت سی حدیثوں میں اس کی صراحت کی گئی ہے۔

اور کوئی بھی شخص اپنے صلاح وتقویٰ پر اعتماد کر کے ان جیسے امور کی طرف اپنا قدم نہ بڑھائے، آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد: "إنّ الشیطـــان یـجـري من الإنسان مجرى الدّم" (۱۶۰) ان جیسے خیالات کے ازالے کے لیے کافی وشافی ہے۔

اور جہاں تک منتہیوں کے حق میں مضرت کی بات ہے تو گانا سننے کی عادت کا نقصان الگ ہوتا ہے اور امردوں سے قلبی تعلق کا نقصان علاحدہ ہوتا ہے، رہی بات گانا سننے کے شغل کی مضرت کی، تو اس کی تفصیل ایک مقدمے کی تمہید پر موقوف ہے، وہ یہ ہے کہ ہر سلیم الفطرت انسان اپنے باطن میں معلوم کرسکتا ہے کہ غصے کی کیفیت اور بہادری کی کیفیت دونوں جدا جدا ہیں، حالاں کہ ان دونوں کے اثرات ونتائج ایک جیسے ہیں مثلاً ضرب وقتل غصہ پیش آنے کی وجہ سے بھی سرزد ہوتا ہے اور بہادری کی بنا پر بھی صادر ہوتا ہے لیکن پہلے کا تعلق جلد زائل ہو جانے والے عوارض سے ہے اور ان عوارض سے کاموں کا

صدور بے ڈھنگ و بے انتظام ہوتا ہے اور دوسرے کا تعلق پائیدار ملکات سے ہے اور ان سے رونما ہونے والے کام معقول و منظّم ہوتے ہیں، اوّل بری کیفیات میں سے ہے اور ثانی اچھے اوصاف میں سے ہے۔

بہر کیف غصے کا آنا اور اس کے اثرات کا پڑنا اگرچہ دلیری کے آثار ظاہر کرنے میں رکاوٹ نہیں، بلکہ اس کا معاون ہے؛ لیکن اس کیفیت کا غلبہ و تسلط اور اس کے مطالبات پر عمل بایں طور کہ اس کا غصہ جو کچھ تقاضا کرے، اسے کر گزرے خواہ وہ عمل عقل و عرف کے مطابق ہو یا نہ ہو، یہ حرکت شجاعت کو داغ دار و بے رونق بنا دیتی ہے اور جس طرح بہادر باوقار اور وجیہ ہوتا ہے اسی طرح غصہ ور سبک مزاج اور بے وقار ہوتا ہے۔

جب یہ مقدمہ ذہن نشیں ہو گیا تو مقصود اصلی میں غور کرنا چاہیے کہ جوش و ہیجانی کیفیت جو خوبصورت آواز سننے کی وجہ سے انسان کے باطن میں پیدا ہوتی ہے اگرچہ فی نفسہ امور قدسیہ الٰہیہ میں سے نہیں ہے، کیوں کہ اس طرح کے حالات فاسقوں، فاجروں بلکہ اہل بدعت اور کافروں کے نفس پر بلکہ تمام جانداروں کے نفوس پر وارد ہوتے ہیں؛ لیکن طاعات و عبادات کے انوار کے اختلاط اور خالق ارض و سماء کی محبت کی آمیزش کے باعث بادی النظر میں یک گونہ تائید سالک کو نظر آتی ہے اور یہ عارضی کیفیت قابل تعریف حالات میں سے شمار ہوتی ہے، مگر اس کی حیثیت حبّ ایمانی کے آثار و مقامات کے پہلو میں ایسی ہے جیسے دلیری کے پہلو میں غضبانی کیفیت کی۔

اور جس طرح جب سونے یا چاندی کے ٹکڑے کو آگ پر رکھتے ہیں اور آگ کی تیزی کے سبب اس ٹکڑے میں اُبال آتا ہے یہاں تک کہ پانی کے مانند ہو کر اس کا جھاگ اوپر آ جاتا ہے اور اس کا مغز نیچے بیٹھ جاتا ہے، پس درحقیقت امر مرغوب وہی ہے جو تہہ نشیں ہے اور یہ جھاگ جو ظاہر ہوا ہے وہ کسی کام کا نہیں "فَأَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَاءً ا وَأَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ"، (۱۶۱) اسی طرح گانا سننے سے ایسا جوش پیدا ہوتا

ہے جو سامع کے تمام باطن پر چھا جاتا ہے اور یہ امر مرغوبات نفسانیہ اور امور بہیمیہ میں سے ایک ایسا امر ہے جو انوار قدسیہ سے مل کر سر آسمان کی طرف اٹھایا ہوا ہے اور حب ایمانی کے آثار واحکام اس کی تہہ میں پوشیدہ ہیں اور یہ ہیجان امور معتد بہا میں بالکل کار آمد نہیں ہے۔ البتہ ایک طلسم کے مانند ہے جو عالم ملکوت کے تماشائیوں کے نظارے کے لیے ظاہر ہوا ہے۔ لہٰذا ان جیسی باتوں کی پیروی اور ان کی تحصیل کے اسباب کو اختیار کرنا حبّ ایمانی کے مقامات کی رونق کو ختم کر دیتا ہے، کیوں کہ صاحبِ حبِّ ایمانی کا کام بالکل اطمینان وسکون اور سنجیدگی ہے اور اہل وجد کا کام سراسر اضطراب و بے چینی اور بے قراری ہے۔

اور جہاں تک بے ریش لڑکوں سے قلبی تعلق کے نقصان کی بات ہے تو اس کی تشریح یہ ہے کہ اگر چہ نفسانی لذتوں کا حاصل کرنا ان کے حق میں نقصان دہ نہیں ہے، لیکن کسی چیز کا دل کی گہرائیوں میں اتر جانا ان کے لیے سم قاتل ہے اور حسین لڑکوں سے دلی تعلق اسی قبیل سے ہے جو بالآخر کھینچ کر یہاں تک لے آتا ہے، چنانچہ صاحب وجدان سلیم پر پوشیدہ نہیں ہے۔ انھیں بیان کردہ خرابیوں کی بنا پر راہِ حق کے سالکین جیسے انبیاء علیہ السلام اور صحابہؓ سے اس طرح کی کوئی بات منقول نہیں، بلکہ ان کے کلام ہدایت کی روشنی میں جو کچھ اہلِ علم کے ذہنوں پر ہویدا ہوتا ہے اس سے وہ ان جیسی باتوں سے پرہیز اور کراہیت سمجھتے ہیں جو ماہر محدثین پر مخفی نہیں ہے۔

اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا صراحت کے ساتھ ان باتوں کو حرام قرار نہ دینا ایک دقیق حکمت پر مبنی ہے، یعنی یہ امور حقیقتاً مفاسد شرعیہ میں سے کسی فساد پر مشتمل نہیں ہیں، باوجود یہ کہ ان کی طرف نفس کا کمال رغبت اور شدت اشتہا تمام لوگوں میں پائی جاتی ہے جن سے سارے لوگوں کا بچنا دشوار ہوتا ہے۔ لہٰذا اگر ان جیسی باتوں سے نہی صریح شریعت میں وارد ہوتی تو قطع نظر مفاسد کے ظہور اور ان کی مضرت کے، صرف ان امور کے اقدام پر شرعی معصیت کا ارتکاب لازم آتا اور امت مرحومہ کی اکثریت گناہوں سے ہمکنار

ہوجاتی، اسی لیے صرف ان جیسی باتوں کی کراہیت کے احساس پر اکتفا کیا گیا۔ لہٰذا طالب حق کو چاہیے کہ ان امور کی عادت نہ ڈالے اوران کو اپنے سویدائے قلب میں جگہ نہ دے اور ان کی طلب میں حیران و پریشان نہ رہے اوران کی طرف تہہ دل سے متوجہ نہ ہو، اوراگر اس قسم کی باتیں اتفاقی طور پر پیش آئیں تو علانیہ ان کا انکار کرنا ضروری نہیں ہے اوران امور کے انجام دینے والوں سے تعرض کرنا جائز نہیں ہے، تاکہ تشدد فی الدین اور تحریم حلال لازم نہ آئے اوراگر اپنے مخلصین بلکہ تمام طالبان راہ حق کے سامنے جو اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی میں اپنی کمر ہمت چست باندھے ہوئے ہوں، ان امور کی کراہیت کا اظہار کریں اورانھیں ان سے روکیں تو بہتر اوراولیٰ ہے، تاکہ لوگ ان امور کو تقرب الٰہی کا ذریعہ سمجھ کر انھیں عبادات میں سے شمار نہ کریں، یقیناً ایسے لوگ بدعتی ہیں۔

## دوسرا افادہ: اصحابِ تہذیبِ اخلاق کے مراتب کا ذکر

اس کتاب میں جو کچھ تخلیہ وتحلیہ کے متعلق لکھا گیا ہے وہ دو وجہ سے وجود پذیر ہوتا ہے۔ وجہ اوّل اصحاب الیمین کا طریقہ ہے، جس کی تفصیل یہ ہے کہ مردِ مسلمان اپنے اقوال وافعال کو شرعی میزان پر تولے اور تخلیہ وتحلیہ میں سے ضروری مقدار حاصل کر کے اپنی کوشش پر اجر جزیل کا امیدوار ہو، اور جائز نفسانی وجسمانی لذتوں سے پرہیز نہ کرے مثلاً مال فراہم کرنے اور سامان، کپڑے، خزانہ اور دھن دولت جمع کرنے میں زیادہ سے زیادہ کوشش کرے، ہاں نفقات واجبہ کی ادائیگی جیسے زکاۃ، صدقۂ فطر اور اقرباء پر خرچ کرنے میں کوتاہی نہ کرتا ہو وعلیٰ ھذا القیاس، پس اس شخص کی کوشش کی قدر کی جائے گی اور یہ شخص اپنے اعمال کے بقدر اجر وثواب پائے گا اوراپنی طاعات وعبادات کے مطابق جنت کے درجات پر فائز ہوگا۔

اور وجہ دوم سابقین کا طریقہ ہے، اس کی توضیح یہ ہے کہ ایسے لوگ تخلیہ وتحلیہ میں سے بقدر ضرورت پر بس نہیں کرتے ہیں، بلکہ اپنی اولوالعزمی کی بنا پر عزیمت کو اختیار کرتے

ہیں اور بجز اللہ کے ہر چیز سے قطعِ تعلق کر لیتے ہیں، یہاں تک کہ اپنے مال، اہل وعیال، اعضا وجوارح اور اعمال ومساعی سے بھی لاتعلق ہو جاتے ہیں اور ان سب کو منعم حقیقی اور مولائے اصلی کا مال تصور کرتے ہیں مثلاً اپنے ہاتھ کو اپنا ہاتھ نہیں جانتے ہیں اور اپنے سر کو اپنا سر نہیں سمجھتے ہیں اور اپنی تمام شان وشوکت، دھن، دولت اور جمیع اسباب دنیا کو اللہ عز وجل کا مِلک سمجھ کر ہرگز ان پر اعتماد نہیں کرتے ہیں اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی مرضیات میں انھیں صرف کرنے میں کوئی کوتاہی نہیں برتتے ہیں، اس بات کا وسوسہ کہ اب زندگی کیسے کٹے گی ہرگز ان کے خیال میں نہیں گزرتا ہے مثلاً انھیں کھانے کی سخت ضرورت ہو، اور اس حال میں اس کے صَرف میں اپنے مولائے حقیقی کی خوشنودی جانیں تو اس کے خرچ کرنے میں بالکل دریغ نہیں کریں گے، یہاں تک کہ وہ تمام مشقتیں اور کوششیں جنھیں وہ اپنے مولا کی خوشنودی کی تحصیل میں بجالائے ہیں انھیں بھی ہرگز اپنا کمال باور نہیں کرتے ہیں۔

مثلاً اگر اللہ تعالیٰ ان کے سارے اعمال کسی سرکش کافر کو عطا فرمادے یا بلاوجہ رائیگاں کردے تو ہرگز حرف گلہ وشکوہ ان کے وہم وخیال میں نہیں گزرے گا کہ ہمارے یہ اعمال کیوں رائیگاں ہوگئے؟ اور ہماری ایک چیز ہم سے کیوں فوت ہوگئی، بلکہ وہ یہ جانیں گے کہ مالک حقیقی نے اپنے خاص مِلک میں تصرف فرمایا ہے، ان امور سے ہمارا کوئی تعلق نہیں ہے، بلکہ ہمارے ہاتھ سے ان امور کا صدور اس چیز کے مانند ہے جس کا مالک اس کو اپنے کسی صندوق میں رکھ دے تو دراصل اس صندوق کا اس چیز سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ مثلاً اگر اس کا مالک اس چیز کو برباد کردے تو ہرگز صندوق کو اعتراض کا حق نہیں ہے، بلکہ ان بعض بزرگوں کو ایسا مقام عطا ہوتا ہے جس کے لوازم میں سے یہ ہے کہ اس مقام پر فائز شخص کے دل میں پوری انسانیت کی خیر خواہی اور مہربانی فوارے کی طرح جوش مارتی ہے یہاں تک کہ اگر وہ اس پر مطلع ہوں کہ ان کے بڑے اعمال بعض گنہگاروں کو دے دئے گئے ہیں اور ان اعمال کے باعث ان کا معاملہ درست ہوگیا ہے اور ان کا انجام بد مائل بہ صلاح

ہو گیا ہے تو یقیناً ان بزرگوں کو ان کے اعمال کی وجہ سے ان گنہگاروں کی ہلاکت سے نجات کے باعث خوشی ومسرت ہوگی، اس بنا پر کہ خدا کے بندوں میں سے کچھ بندے ان کے اعمال کی وجہ سے ہلاکت وتباہی سے نجات پا گئے۔ چنانچہ شیخ سعدی شیرازی رحمۃ اللہ علیہ نے شیخ الشیوخ شہاب الدین سہروردی قدس سرہ العزیز کے حالات زندگی سے نقل کیا ہے کہ آپ نے ایک رات اپنی مناجات میں اس شعر کا مضمون ادا فرمایا ؎

چہ بودی کہ دوزخ زمن پر شدی      مگر دیگراں را رہائی شدی (۱۶۲)

غرض جب یہ بات یعنی امور دنیا وآخرت سے علاحدگی وبے تعلقی اس کے دل میں گھر کر جاتی ہے اور اس کی طبیعت کی تہہ میں مستحکم ہو جاتی ہے اور فنائے ارادہ مکمل اسے حاصل ہو جاتا ہے تو عنایت غیبیہ اس کا انتخاب کر کے خاص چیلہ کے درجہ میں کر دیتی ہے جیسا کہ ذی اقتدار سلاطین اپنے بعض فرماں برداروں کو تمام رعایا سے ممتاز کر کے خاص چیلہ کے لقب سے ملقب کر دیتے ہیں، اور انھیں منتخب کر لیتے ہیں، چناں چہ وہ خاص چیلہ اپنے آقا کے کپڑوں اور سامانوں کے تصرف میں مطلق ماذون ہوتا ہے اور اس کی پوری سلطنت کو اپنی طرف منسوب کرتا ہے مثلاً شاہ ہند کے خاص چیلہ کو حق پہنچتا ہے کہ وہ کہے، ہماری حکومت شہر کابل سے دریائے شور تک ہے۔

اسی طرح ان مراتب عالیہ اور مناصب رفیعہ پر فائز اصحاب، عالَم مثال وشہادت کے تصرف میں مطلق ماذون ہوتے ہیں، ان اکابر کو یہ حق حاصل ہے کہ تمام کلیات کی نسبت اپنی طرف کریں مثلاً انھیں یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ کہیں عرش سے فرش تک ہماری سلطنت ہے، اس قول کا مطلب یہ ہے کہ عرش سے فرش تک ہمارے مولیٰ کی حکومت ہے اور ہمیں ہر چیز سے برابری کی نسبت ہے یا وہ کہے کہ کسی چیز میں کوئی خصوصیت نہیں ہے، تا آں کہ وہ چیز ہماری طرف منسوب ہو اور اس کے علاوہ ہماری طرف منسوب نہ ہو، واللہ اعلم بالصواب۔

تیسرا افادہ: اوصافِ حمیدہ کے حامل اشخاص کا ذکر کہ وہ ان کی وجہ سے تکبر نہ کریں

جو حالات، مقامات اور فضائل اس رسالے میں قلمبند کیے گئے ہیں، ہر وہ شخص جو ان سے متصف ہو، یا صرف ان کے معلومات سے بہرہ ور ہو اس کو لازم ہے کہ ان باتوں سے غافل اور خالی اشخاص کی تعظیم و تکریم میں کوتاہی نہ کرے، ہر ایک کے حسب حال ان کی تعظیم کا حق ادا کرے، کیوں کہ کوئی بھی مسلمان حق تعالیٰ کا نامِ پاک لینے سے قاصر نہیں ہے۔ لہٰذا اوّلاً اس مومن کی تعظیم اس نام پاک کی تعظیم کی بنا پر کرنی چاہیے، یہ اس جلیل القدر ہستی کا پاک نام ہے جس کے مقابل کوئی چیز تولی نہیں جاسکتی اور اس کے کمال کی کنہ کا ادراک کوئی نہیں کرسکتا اور اس کے اجر و ثواب کی کوئی انتہا نہیں۔

ثانیاً اپنے آغاز و انجام کا دھیان کر کے تکبر سے کنارہ کش ہو کر فروتنی اختیار کرے، کیوں کہ ہر شخص ابتدائے آفرینش میں بے عقل اور ناکارہ تھا اور اپنے انجام سے ہر شخص بے خبر ہے، کسی کو نہیں معلوم کہ اس کے ساتھ کیا ہوگا۔

ثالثاً اللہ ربّ العزت کی عمومی رحمت و قدرت کے پیشِ نظر اس کی رحمت و قدرت سے بعید نہیں ہے کہ ایک لمحہ میں کسی مرد مسلمان کو قطب الاقطاب (۱۶۳) بنادے یا کسی کافر کو ایمان کی دولت سے بہرہ ور کر کے اسی وقت قطبیت کی نعمت سے سرفراز فرمادے، اس کا انعام و رحمت، محنت و استعداد پر موقوف نہیں ہے بلکہ محنت و استعداد بھی اس کے عام انعامات میں سے ہے، اگر کسی کو لمبے عرصے اور سخت محنتوں کے بعد کوئی نعمت میسر ہو تو وہ یہ نہ سمجھے کہ عطائے الٰہی اس طرح کی محنتوں کے بغیر ناممکن ہے، ہوسکتا ہے کہ اس سے ہزار درجہ بہتر نعمت ایک لمحے میں عطا فرمادے۔

## چوتھا افادہ: اس بات کی وضاحت کہ نجات کا دار و مدار تہذیب اخلاق پر نہیں ہے

معلوم ہونا چاہیے کہ جو کچھ اخلاق کی درستگی، رذائل سے تخلیہ، فضائل سے تحلیہ اور اعمال و عبادت کی اصلاح کے متعلق مفصلاً لکھا گیا ہے، یہ سب ہر اس شخص کے لیے ضروری ہے جو اللہ تعالیٰ کی رضا کا طالب ہو، اس کی خوشنودی کے ساتھ اس کے بارگاہ میں عزت و اعتبار

اور مقبولیت کا خواستگار ہو۔ لیکن نجات کا دار و مدار ان باتوں پر نہیں ہے، بلکہ مدار نجات صرف کلمۂ توحید ہے، جو شخص اس کلمے کو صدق دل اور درست عقیدے سے کہے اور برے عقیدے اور کلمۂ کفر سے مجتنب رہے اگر چہ گناہ کبیرہ مثلاً زنا وغیرہ اس سے صادر ہو تو وہ شخص اس کلمے کی صدق دل سے گواہی اور اقرار کی بدولت نجات پائے گا اور جنت میں داخل ہوگا۔

جو شخص کلمۂ مذکور کا اعتقاد اور تصدیق کرنے والا ہوگا وہ ضرور برائیوں کو برا جانے گا اور ان سے بیزار و پشیمان ہوگا، گو بالکل ان کا تارک نہ ہو بلکہ ہر دن ان کا ارتکاب متعدد بار بلکہ سیکڑوں بار کرتا ہو۔ اور ارتکاب گناہ کی بھی مختلف صورتیں ہوتی ہیں: ایک صورت یہ ہے کہ کوئی گناہ کرے اور عین گناہ میں مشغولی کے وقت اللہ تعالیٰ کو غفور رحیم جانے اور یہ تصور گناہ پر اس کی دلیری اور جرأت کا باعث ہو، یہ ارتکاب معاصی کی سب سے بدترین صورت ہے۔ کیوں کہ اس صورت میں گناہ کا ارتکاب کرنا گویا حق تعالیٰ کے ساتھ استہزا کرنا ہے، معاذ اللہ من ذلک، یہ صورت غضب الٰہی کو گنہگار کی طرف متوجہ کرتی ہے، اس کے برعکس جو شخص بوقت گناہ خود کو ہلاک، بے کار اور عذاب کا مستحق جانے، گو بعد میں توبہ کرے، ایسے شخص کا انجام ان شاء اللہ اچھا ہوگا، اس کی نیک انجامی کا تعین مشیت ایزدی کے حوالے ہے، اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو اسے ایسے نیک عمل کی توفیق عنایت کرے جو اس کی تمام سیئات اور گناہوں کے لیے کفارہ ثابت ہو، یا اس کے حق میں کسی سفارشی کی سفارش قبول فرمالے اور شافع کو اس کی شفاعت کی قوت و توفیق عطا فرمادے، یا ان دونوں باتوں کے علاوہ خود محض اپنے فضل و کرم سے اسے معاف فرمادے یا اس کو دنیا یا قبر یا حشر یا جہنم میں عذاب دے کر بہشت میں داخل فرمادے۔

## پانچواں افادہ: موت کے وقت وصیت کی تاکید کا ذکر

سنت نبوی کے مطابق مسلمان کا جینا و مرنا اس کے کمال ایمان کی علامت ہے، زندگی میں اپنے کام کا اختیار ہوتا ہے، موت کے بعد مردہ بدست زندہ ہوتا ہے، جو کچھ

دوسرے لوگ چاہتے ہیں کرتے ہیں۔

لہٰذا سنت سے محبت کرنے اور بدعت سے نفرت کرنے والے مسلمان کو چاہیے کہ موت کے آثار ظاہر ہونے کے وقت توبہ واستغفار کرے، اپنے ایمان کو ارحم الراحمین کے سپرد کرے، اگر چہ اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کا ہر وقت معین و مددگار رہے اور ہر مسلمان پر ہر دم اپنے ایمان کو اللہ کے حوالے کرنا لازم، لیکن ایسے وقت میں خاص طور پر کوشش کرنی چاہیے کیوں کہ یہ غفلت و مدہوشی کا وقت ہے، اور تجہیز و تکفین ودفن کے لیے وصیت تجویز کر کے لکھ کر اپنے پاس بحفاظت رکھ لے اور اہل خانہ کو آگاہ کر دے کہ جو شخص میری تجہیز و تکفین ودفن میں خلاف سنت کام کرے گا، قیامت کے دن میں اس سے حساب لوں گا، اس کا دامن پکڑوں گا، تجہیز وغیرہ میں جو بدعت رائج ہو اہتمام کے ساتھ اس سے منع کر دے جیسے قبروں پر قبہ تعمیر کرنا، گچ کرنا، چراغاں کرنا یہ سب کام موجبِ لعنت ہیں، چہ جائے کہ انھیں اعمال صالحہ میں سے شمار کریں۔ أعاذنا اللّٰہ تعالیٰ وجمیع المؤمنین من البدعات ورزقنا اتباع المصطفیٰ في جمیع الحالات. (۱۶۴)

باب سوم

# طریق سلوک راہ ولایت کا بیان

یہ باب چار فصول اور ایک تکملہ پر مشتمل ہے

## پہلی فصل: طریقۂ قادریہ کے اشغال کا بیان

اس میں ایک تمہید اور دو ہدایات ہیں:

### تمہید: اشغال قادریہ کی تجدید کا ذکر

طریقۂ قادریہ کے اشغال کا خلاصہ قدرے تغیر کے ساتھ اس فصل میں تحریر کیا گیا ہے جو جلد حصولِ مقصد کا باعث ہو اور جس میں ابتدا ہی سے انتہا کے آثار ظاہر ہوں، اور چوں کہ تمام اشغال، ذکر اور فکر میں منحصر ہوتے ہیں، اس لیے ضروری ہوا کہ اس فصل کو دو ہدایتوں پر تقسیم کیا جائے۔

## پہلی ہدایت

### ذکر کے طریقوں کا بیان

یہ ہدایت چار افادات پر مشتمل ہے

### پہلا افادہ: ایک ضربی ذکر کا طریقہ

سب سے پہلے ایک ضربی ذکر کرنا چاہیے، اس کا طریقہ یہ ہے کہ دوزانو نماز کے طریق پر بیٹھیں اور لفظ مبارک ''اللہ'' کو وسط سینہ سے شدت اور جہر کے ساتھ نکال کر اپنے منھ کے سامنے ضرب لگائیں اور اس لفظ کے تلفظ کے وقت ایسا خیال کریں کہ ایک نور اس

لفظ مبارک کے ساتھ ہمارے منہ سے نکلا ہے، اور جب ضرب پوری ہوگی اس وقت ایک لمبی آواز گھڑیال کی آواز کی طرح تصور میں گونجے گی۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ جب انسان قصداً تیزی اور زور کے ساتھ آواز نکالتا ہے، تو سنائی دینے والی آواز سے پہلے ایک حرکت ظاہر ہوتی ہے اور اس حرکت کو خیالی آواز کہہ سکتے ہیں، اور جب جہر اور شدت کے ساتھ آواز مکمل ہوتی ہے تو اس کے اتمام کے بعد اور اس سے پہلے کہ سانس اپنی جگہ پر آجائے اور منہ، ہونٹ اور زبان کی ہیئت اپنی پہلی حالت پر لوٹ آئے ایک آواز کی گونج خیال میں رہتی ہے جس کا ادراک کان نہیں کرسکتا، البتہ بولنے والا محسوس کرتا ہے۔

پھر اسی گونج دار خیالی آواز کو مزید کھینچیں اور اس آواز کے کھینچنے کے ساتھ خیالی نور کو نورانی چادر کی طرح خوب لمبا اور وسیع کر کے سامنے کی طرف سے سر پر ڈال لیں، پھر تمام بدن کو سر سے لے کر پاؤں تک اس میں چھپالیں۔ اس کے بعد اس آواز متخیلہ سے بھی خاموشی اختیار کر کے ایسا تصور کریں کہ وہ نورانی چادر ہر طرف سے اس کے جسم میں پیوست ہو کر وسط سینہ میں اکٹھا ہوگئی ہے۔ چند بار اس نور کو اسی طرح متصور کرنے سے وہ نور پورے جسم کی جگہ لے لیتا ہے۔

اس خاموشی میں خود کو ذاتِ خالص کی طرف متوجہ رکھیں اور اس دھیان کے حصول اور اس نور کے سینے میں جمع ہونے کے بعد پھر اسی طرح سے ذکر کریں اور اس ذکر کو کثرت اور پابندی کے ساتھ عمل میں لائیں تاکہ اس پر اچھی طرح سے قابو حاصل جائے۔

دوسرا افادہ: دو ضربی ذکر کا طریقہ

ایک ضربی ذکر کی پختگی کے بعد بیان کیے گئے طریقے کے مطابق دو ضربی ذکر شروع کریں۔ اس ذکر کا طریقہ یہ ہے کہ دو زانو نماز کی نشست کی طرح بیٹھیں اور لفظ مبارک ''اللہ'' کو وسط سینہ سے نکال کر سختی اور جہر کے ساتھ داہنے گھٹنے پر ضرب لگائیں اور

پھر متخیل آواز کی درازی کو آہستگی کے ساتھ داہنے شانے تک کھینچ کر وسط سینہ تک پہنچائیں۔ اور ایسا خیال کریں کہ اس لفظ کے ساتھ ایک نور نکلا ہے اور اس نے زانو، پہلو، شانہ اور دستِ راست کی جگہ لے لی ہے، اور یہ سب اعضا بیکار ہو گئے ہیں اور اِن کا جانشیں وہی نور ہو گیا ہے، پھر تھوڑی دیر خاموش ہو جائیں اور اس خاموشی میں اس نور کے ان اعضائے مذکورہ کی جگہ میں بیٹھنے کا ملاحظہ کریں، یہاں تک کہ ان کے ذہن میں اسی نور کی صورت ان اعضا کی جگہ میں بخوبی مستحکم ہو جائے۔

اس کے بعد اسی لفظ کو اس نور کے ساتھ وسط سینہ سے داہنے شانے تک کھینچ کر شدت اور جہر کے ساتھ دل پر ضرب لگائیں، اور ایسا تصور کریں کہ وہ نور جس نے داہنی جانب کا احاطہ کیا تھا اب وہ دل میں اتر گیا ہے، پھر تھوڑی دیر خاموشی اختیار کریں اور اس سکوت میں ایسا خیال کریں کہ وہ نور جو دل میں سرایت کر گیا تھا اب وہ اس شخص کے تمام جسم میں سرایت کر گیا ہے۔

## تیسرا افادہ: سہ ضربی ذکر کا طریقہ

سہ ضربی ذکر کا طریقہ یہ ہے کہ چار زانو بیٹھیں اور ایک ضرب پیچھے ذکر کیے گئے طریقے کے مطابق داہنی جانب میں لگائیں اور دوسری ضرب اسی انداز سے بائیں جانب میں لگائیں اور تیسری ضرب دل پر لگائیں۔

## چوتھا افادہ: چہار ضربی ذکر کا طریقہ

چہار ضربی ذکر کا طریقہ یہ ہے کہ چار زانوں بیٹھ کر ایک ضرب بیان کردہ طریقے کے مطابق دائیں جانب، دوسری ضرب بائیں جانب، تیسری ضرب دل میں اور چوتھی ضرب اپنے منھ کے سامنے لگائیں اس طور پر کہ اس کے ساتھ خیال کریں کہ گویا کہ ایک نور اس (لفظ) کے ہم راہ (ہمارے منھ سے) نکل کر ہمارا احاطہ کر رہا ہے، یہاں تک کہ اس نے ہمارے پورے وجود کو گھیر لیا ہے اور ہم مکمل طور پر اس میں غرق ہو گئے ہیں، بلکہ ہمارے بدن کی جگہ اس نور نے لے لی ہے۔

**فائدہ:** مذکورہ بالا طریقے کے مطابق اس ذکر کا مقصد یہ ہے کہ اسم ذات کے ذکر کا اثر ذاکر کے تمام بدن پر اجمالاً وتفصیلاً پڑے اور بشریت کی ظلمت اس کے تمام بدن سے عموماً اور اعضائے مذکورہ سے خصوصاً دور ہو جائے اور یہ فنائے جسمانی کی تمہید ثابت ہو، ذکر فکر کے ساتھ مخلوط ہو جائے اور ذکر سے مراقبے کی طرف منتقل ہونے میں زیادہ آسانی ہو۔

الغرض جب چاروں اذکار کے آثار ایک ضربی سے لے کر چار ضربی تک ظاہر ہو جائیں تو فکر میں مشغول ہونا چاہیے۔

# دوسری ہدایت

## اقسام فکر کا بیان

اس ہدایت میں سات افادات ہیں:

### پہلا افادہ: مراقبۂ وحدانیت

پہلا مراقبہ وحدانیت کا مراقبہ ہے، اس مراقبہ کا طریقہ یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی وحدانیت کا جس کی وضاحت کرنے والا "لا شريك له" ہے، ہر جگہ میں دھیان کرے کہ ہر زمان ومکان میں وہی یگانہ ذات پاک ہے، اس دھیان کی تین صورتیں ذہن میں آئیں گی۔

**پہلی صورت:** یہ کہ ہر چیز کی نفی کر کے اس کی جگہ حق تعالیٰ کے وجود کا یقین کرے۔

**دوسری صورت:** یہ کہ وجود حق تعالیٰ کو عین یہ چیزیں خیال کرے، یہاں پر یہ دونوں صورتیں مراد نہیں ہیں، بلکہ ان دونوں صورتوں سے پرہیز واجتناب انتہائی ضروری سمجھے، اور تیسری صورت جو یہاں پر مراد ہے وہ یہ ہے کہ اس کے وجود کو یکتا، تمام چیزوں کا غیر ہر جگہ پر تصور کرے، نہ ان چیزوں کی نفی کرے اور نہ ہی انھیں عین حق تعالیٰ جانے، اس کی مثال یہ ہے کہ ہر شخص جانتا ہے کہ اس کا معنی جس کی تعبیر فارسی میں لفظ ''ہست'' اور اردو

میں ’’ہے‘‘ سے کرتے ہیں۔ وہ ہر جگہ موجود ہے لیکن کسی چیز کا عین نہیں ہے بلکہ ہر چیز کا غیر ہے باوجودیکہ کوئی چیز اس سے خالی نہیں ہے۔

**دوسرا افادہ: مراقبۂ صمدیت**

مراقبۂ وحدانیت مستحکم ہونے کے بعد مراقبۂ صمدیت کریں، اس کے دو درجے ہیں: ایک ابتدائی اور دوسرا انتہائی، ابتدا کا مطلب یہ ہے کہ اجمالی طور پر اس بات کا مراقبہ کریں کہ ہر چیز اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی محتاج ہے اور وہ ہر چیز سے بے نیاز ہے۔ جب یہ مراقبہ خوب پختہ ہو جائے، تو اس کی انتہا حاصل کرنے کی کوشش کریں، اس کا مطلب یہ ہے کہ تفصیلی طور پر امور دین و دنیا کے ہر امر میں اپنی محتاجی کا دھیان کریں (اس دھیان کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے بغایت الفت و محبت اور اپنی طرف سے نہایت عاجزی وانکساری ہونی چاہیے) یعنی ایسا خیال کریں کہ ہر چیز میں ہم اس کے محتاج ہیں اور کوئی کام اس کی عنایت ونصرت کے بغیر سرانجام نہیں پاسکتا، خواہ وہ کام مشکل ہو یا آسان، خواہ اس کا تعلق دین سے ہو یا دنیا سے۔

**مراقبۂ صمدیت کے ثمرات:**

اس مراقبے سے انھیں ایسی الفت و محبت اور بارگاہ عالی میں ایسی رسائی نصیب ہوتی ہے کہ اپنی جان و مال اور عزت و آبرو کو اس کی مرضی میں بلکہ اس کے نام پر قربان کرنا ان کے لیے سہل اور آسان ہو جاتا ہے۔ بلکہ اس بات کو اپنے لیے افتخار واعتبار اور عزت وجاہ کے اضافے کا سبب شمار کرتے ہیں اور یہ امر ان کے دل و دماغ میں بخوبی راسخ و مستحکم ہو جاتا ہے۔

اس کی مثال یہ ہے کہ جیسے کوئی شخص بادشاہ کی طرف سے ہمیشہ نسلاً بعد نسلٍ انعام پاتے ہوئے آیا ہو اور اس کی زندگی کے تمام مسائل اسی بادشاہ کے وسیلے سے حل ہوتے ہوں اور اسے جو عزت واعتبار حاصل ہے وہ اسی بادشاہ کے طفیل حاصل ہوا ہے، پھر اگر اس بادشاہ کی طرف سے کسی کام کا حکم اس کو ملے تو وہ اس کو سرانجام دینے کے لیے جان دینے میں بھی اپنا فخر تصور کرے گا، اس مراقبہ سے ’’اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ‘‘ (۱۶۵) کا

مطلب بخوبی ثابت ہوجاتا ہے۔

اس مراقبہ کے ثمرات میں سے توحید الٰہی کا انکشاف ہے کہ باوجود بہت سے کام اور بہت سے کام کرنے والے کے اس مراقبہ والے کے لیے ایک ہی فاعل اور ایک ہی مؤثر ہے جو فاعل حقیقی کی ذات ہے اور جو ہر باب، ہر حرکت اور ہر سکون میں ظاہر ہوتی رہتی ہے۔

تیسرا افادہ: شغل دورہ

اس مراقبہ کے بعد شغل دورہ کریں، اس شغل کے ارکان اسمائے حسنی میں سے چار نام ہیں: (۱) سَمِیْعٌ (۲) بَصِیْرٌ (۳) قَدِیْرٌ (۴) اور عَلِیْمٌ، ہر ایک کے ساتھ اسم ذات کو ضم کرلیں پھر مراقبہ کی طرح بیٹھیں اور خاطر کو جمع کر کے اور دل کو حاضر کر کے اپنے خیال میں کہیں: اَللّٰہُ سَمِیْعٌ (اللہ سننے والا ہے) اور اس کو ناف سے جو کہ لطیفۂ نفس کا مقام ہے وسط سینہ تک جو کہ لطیفۂ سر کا مقام ہے، لے جائیں اور ایسا خیال کریں کہ ہماری روح جو ہر چیز کا ادراک کرنے والی اور محسوس کرنے والی ہے وہی ہمارے اندر مجتمع اور فراہم ہوکر ذکر مذکور کے ساتھ ناف سے وسط سینہ تک پہنچ گئی ہے اور اگر روح کو ناف سے وسط سینہ تک منتقل کرنا دشوار ہو تو ایسا تصور کریں کہ روح ان دونوں اسموں یعنی "اَللّٰہُ سَمِیْعٌ" کے درمیان اس طرح پر ہے کہ لفظ "اللّٰہ" اس کے اوپر اور لفظ "سمیع" اس کے نیچے ہے۔ اس تدبیر سے ان دونوں اسموں کے انتقال کے ساتھ روح کا بھی منتقل ہونا آسان ہوجائے گا۔

پھر بیان کیے گئے طریقے کے مطابق "اَللّٰہُ بَصِیْرٌ" (اللہ دیکھنے والا ہے) کو لطیفۂ اخفیٰ تک جس کا مقام سر میں تالو کے بالمقابل ہے، پہنچائیں پھر "اَللّٰہُ قَدِیْرٌ" (اللہ قدرت والا ہے) کو لطیفۂ اخفی سے چوتھے آسمان تک پہنچائیں اور اپنی روح کو اس کا تابع اور ہم راہ بنادیں۔

اس کے بعد "اَللّٰہُ عَلِیْمٌ" (اللہ جاننے والا ہے) کو وہاں سے عرشِ معلّٰی تک پہنچائیں اور اس ذکر کی مدد سے روح کو چوتھے آسمان سے عرش مجید تک ترقی دیں، اور

چاہیے کہ تیسری اور چوتھی منزل میں یعنی چوتھے آسمان اور عرش مجید میں روح کو تھوڑی دیر ٹھہرائیں اور آدھا گھنٹہ یا ایک گھنٹہ جس قدر ممکن ہو وہاں پر روح کو دائیں بائیں گھمائیں اور سیر کرائیں۔ کبھی کبھی ان مقامات میں روح کا توقف مشکل ہو جاتا ہے، بلکہ بھاری بھرکم چیز کی طرح خود بخود نیچے گر پڑتی ہے، اس سے حفاظت کی تدبیر یہ ہے کہ چڑھنے والے کے خیال میں چڑھنے کے وقت آسمانوں میں سوراخوں کے مثل نظر آئے گا، روح کو ٹھہرانے کے لیے ان سوراخوں کو اپنے خیال کی کوشش سے بند کر دیں تاکہ روح وہاں ٹھہر جائے پھر انھیں رہبروں کے ساتھ ذکر کردہ طریقے کی ترتیب سے عرش مجید سے لطیفۂ اخفیٰ تک اتریں یعنی "اَللّٰهُ عَلِيْمٌ" کے ذکر کے ساتھ عرش سے چوتھے آسمان تک اور "اَللّٰهُ قَدِيْرٌ" کے ذکر کے ساتھ چوتھے آسمان سے لطیفۂ اخفیٰ تک اور "اَللّٰهُ بَصِيْرٌ" کے ذکر کے ساتھ اخفیٰ سے سر تک اور "اَللّٰهُ سَمِيْعٌ" کے ذکر کے ساتھ سر سے نفس تک اتریں۔ آہستہ آہستہ اس ذکر کی تعداد کو بڑھائیں تاکہ اس کے آثار ظاہر ہوں۔

### شغل دورہ کے اثرات:

اس ذکر کے آثار میں سے ذاکر کی روح کی نورانیت، انبیاء اور اولیاء کی روحوں اور ملائکہ سے ملاقات، جنت و جہنم اور آسمانوں کی دوسری جگہوں جیسے سدرۃ المنتہیٰ اور بیت المعمور وغیرہ کی سیر، اور لوحِ محفوظ اور وہاں کے واقعات کا کشف ہے۔ اسی بنا پر روح کو آسمانوں میں ٹھہرانا اور اس کو وہاں سیر کرانا ضروری ہوتا ہے۔

اور وہاں کے عجائبات کا مشاہدہ مختلف انداز سے ہوتا ہے، ہر شخص اپنی قوتِ ادراک واستعداد اور اپنے مناسب حال (ان مقامات کا) مشاہدہ کرتا ہے، اور ارواح و ملائکہ سے ملاقات کے ضمن میں ان سے گفتگو کا موقع بھی ملتا ہے اور کبھی کبھی نیک صلاح پر جو سالک کے راستے کے لیے مفید ہوتی ہے یا اس کے علاوہ دوسری چیز پر اسے مطلع کرتے ہیں۔ اس سے روح کو ایسی لطافت اور ذاتِ باری تعالیٰ کے ساتھ ایسی قربت وانسیت

حاصل ہوتی اور جسم سے ایسی بے گانگی میسر ہوتی ہے اور ایسی نورانیت بہم پہنچتی ہے جو شغل نفی میں کام آتی ہے اور اس کو آسان تر بنا دیتی ہے۔

اور اگرچہ روحِ بشری اس قابل نہیں ہے کہ وہ عالم قدس اور آسمانوں پر چڑھے لیکن ذکرِ الٰہی اس کا رہبر ہو گیا ہے، لہٰذا جہاں جانے کی وہ طاقت نہیں رکھتا تھا وہاں مذکورہ رہ نما کے ذریعے پہنچ سکتا ہے۔

## چوتھا افادہ: شغل نفی

اس کے بعد شغل نفی شروع کریں، اس کا بیان یہ ہے کہ بمقتضائے ارشاد خداوندی "اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْض" (۱۶۶) انوارِ الٰہی ہر جگہ موجود ہیں جیسا کہ وجود ہستی ہر جگہ ثابت ہے، چنانچہ مراقبۂ وحدانیت میں قدرے تفصیل کے ساتھ اس پر بحث ہو چکی ہے۔ انوار اس کے لوازم ہیں، لہٰذا جہاں وجود ثابت ہے وہاں انوار بھی متحقق ہیں اور جب وجود کا احاطہ معلوم ہو گیا تو اسی طرح سے اس کے انوار کے وجود کو بھی سمجھنا چاہیے۔

لیکن انسان کی قوت درّاکہ اشیائے کثیفہ وظلمانیہ یعنی اجسامِ ملکی وعنصری کے خیالات کے سبب سے ان کے ادراک سے محروم ہے، نہ کہ ان کی غیر موجودگی اور دوری کی وجہ سے۔

اور ذاتِ باری تعالیٰ تک پہنچنے میں حجاب کا طے کرنا جن سے میری مراد انوار ہیں، واجب ہے، اور جو کچھ اصحابِ فطرتِ عالیہ کو بغیر انکشافِ انوار کے ذاتِ باری تک وصول نصیب ہو جاتا ہے، ان کا یہ معاملہ اکثر لوگوں کے انکشافِ انوار کے محتاج ہونے میں نفی نہیں کرتا ہے۔

لہٰذا ان کے ادراک کے لیے اپنی قوت مدرکہ کو مذکورہ خیالات سے پاک وصاف کرنا چاہیے، تاکہ انوارِ الٰہی محسوس ہوں، جوں ہی سالک کی قوت مدرکہ کا آئینہ بیان کردہ خیالات کے زنگ سے صاف وشفاف ہو گا ویسے ہی انوار ہر جگہ نظر آنے لگیں گے اور بغیر کسی دقت وپریشانی کے دریافت ہوں گے۔

## شغلِ نفی قوتِ مدرکہ کو پاک کرتا ہے:

قوتِ مدرکہ کے پاک کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ شغلِ نفی کریں اور شغلِ نفی کا خلاصہ یہ ہے کہ اپنے خیال سے اشیا کو نیست و نابود کریں، اگرچہ حقیقت میں کوئی چیز معدوم نہیں ہوگی، درحقیقت اشیا کو نیست و نابود جاننا خیالِ باطل اور وہم کاذب ہے۔ ہر وہ چیز جو موجود ہے وہ واجب الوجود تبارک وتعالیٰ کی ایجاد سے موجود ہے اور ہر موجود شے کو اس کے وجود پاک کے ساتھ ایک خاص ربط حاصل ہے۔

پس کسی چیز کے وجود کی فی الواقع نفی کرنا ممکن نہیں ہے، اور اس بات کا ارادہ کرنا گویا خالقِ کائنات سے مقابلہ کرنا ہے، واقعی چیز کی نفی سے کوئی مقصد بھی متعلق نہیں ہے، کیوں کہ مقصد تو اپنی قوتِ مدرکہ کو صاف وستھرا کرنا ہے، جب قوتِ مدرکہ صاف وشفاف ہو جائے گی تو اپنا مدعا خود بخود حاصل ہو جائے گا اور واقعی چیز کی نفی سے ہماری کوئی غرض بھی وابستہ نہیں ہے۔

## نفی کے دو درجے:

اگرچہ پوری دنیا کی نفی مشکل نظر آتی ہے، لیکن یہاں پر اس کے صرف دو درجے ہیں۔ اس لیے کہ پورے عالم کی نفی اور عالم کے ایک جز کی نفی برابر ہے، انسان کا اپنے خیال کو مچھر کے پَر اور تمام کائنات سے خالی کرنا برابر ہے، البتہ اپنے وجود کی نفی کرنا (نسبتاً) ایک دشوار کام ہے، اس بنا پر نفی کے دو درجے مقرر کرنے چاہییے۔ اوّل اپنی نفی، اور دوم پوری دنیا کی نفی۔

دوم کی آسانی اور اوّل کی دشواری کا سبب یہ ہے کہ قوتِ مدرکہ خود کے علم واحساس سے پُر ہوتی ہے اور غیر کا علم واحساس کبھی کبھی ہوتا ہے، دوسری نفی میں ایک باہری چیز کو اپنی قوتِ مدرکہ میں داخل ہونے سے روکنا ہے، اور پہلی نفی میں جو چیز مدرکہ میں موجود ہے اس کو نکالنا ہے۔ پس خارج کو داخل کرنے اور داخل کو خارج کرنے کے درمیان جو فرق ہے وہ پوشیدہ نہیں کہ پہلا دوسرے کے مقابلے میں بہت آسان ہے، یا اس کے فرق کو اس طرح سمجھنا چاہیے کہ اس شخص کے لیے بارش کی نفی کرنا جس نے بارش کبھی کبھی دیکھی ہو زیادہ

آسان ہے اس شخص کی بارش کی نفی کرنے کے مقابلے میں جو عین بارش میں کھڑا ہو اور بارش کے قطرات اس کے بدن پر مسلسل پڑ رہے ہوں، اسی بنا پر خود کی نفی میں جسم کی نفی زیادہ سہل ہے، لیکن جسم کے جس مقام پر علم و دانست کا قرار ہوتا ہے، اس جگہ کی نفی زیادہ مشکل ہوتی ہے اور کبھی کبھی سر کی نفی جو ادراک وشعور کا مرکز ہے، دشوار ہوتی ہے اور ان بعض اشخاص کے لیے جو سانس کی آمد و رفت پر ہر دم آگاہ رہتے ہیں، حلق وسینہ کی نفی سخت ہوتی ہے۔

## مشکل چیز کو سب سے پہلے ہدف بنائیں:

غرض جس چیز سے زیادہ آگاہی ہوگی اس کی نفی اتنی ہی زیادہ سخت ہوگی، پس اوّلاً تمام عالم کی نفی کریں، پھر اپنے بدن کی نفی کریں اور اس جگہ سے آغاز کریں جس کی نفی زیادہ دشوار معلوم ہوتی ہو کہ اس کی نفی سے بدن کے تمام عضو کی نفی یک بارگی ہو جائے اور نفی کی تحصیل میں اصل مرشد کامل صاحبِ نفی کی توجہ ہے کہ وہ اپنی نفی کر کے پورے دھیان کے ساتھ اس پر توجہ ڈالے۔

اور ابتدا میں اس کام کے مبتدی پر اس کا اثر مختلف صورتوں میں جلوہ گر ہوتا ہے، کبھی کبھی شروع میں سینے اور پیٹ میں خلا محسوس ہوتا ہے اور کبھی لگتا ہے کہ سر اور دونوں ہاتھ غائب ہو گئے ہیں اور کبھی تصور میں آتا ہے کہ میں چھوٹا ہو گیا ہوں اور کبھی خیال آتا ہے کہ بغیر ضخامت و جثّے کے میں لمبا ہو رہا ہوں، گویا گوشت کی ایک نرسل ہے جو لمحہ بہ لمحہ لمبی اور باریک ہوتی چلی جا رہی ہے۔

## نفی کا تصور:

اس تصور کا آسان طریقہ یہ ہے کہ سینے یا پیٹ میں خلا خیال کرے جیسے کہ توپ کا گولہ ایک طرف سے دوسری طرف نکل کر جسم کے اس حصّے کو خالی کر دیا ہو، پھر اس خیالی سوراخ کو آہستہ آہستہ چوڑا اور کشادہ کرے تا کہ وہ انجام تک پہنچ جائے۔

اور اس تصور کی سخت ترین صورت یہ ہے کہ یہ خیال کرے کہ ایک معنوی غیبی چیز جس

سے مراد فنا ہے، اس نے عالم غیب سے اس کی طرف متوجہ ہوکر دفعتاً اس کے جسم کو منتشر کر دیا ہے جیسے کہ سخت پتھر ایک کم زور ٹھیکری پر گر کر اس کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے ریزہ ریزہ بنا دیتا ہے۔

اور کبھی ایسا بھی تصور کر سکتا ہے کہ اس کی جان نکل گئی ہے یا گوشت کا ٹکڑا جس کا نام دل ہے وہ اس کے جسم سے نکل کر معدوم ہو گیا ہے، اور جسم بے جان و دل کے باقی نہیں رہ سکتا، لہٰذا وہ جسم بے جان ہوکر بے کار ہو گیا ہے، اگر چہ اس کام کے واقف شخص کے نزدیک ان مختلف صورتوں کا بیان کرنا بے فائدہ کلام کو طول دینا ہے، لیکن بسا اوقات ایسا ہوتا ہے، اجمالی طور پر نفی کا مطلب بیان کرنے سے اس کی صورتوں میں سے کسی ایک صورت کا تعین کسی بڑے زیرک کو بھی میسر نہیں ہوتا، اور کبھی کبھی بہت سی صورتوں کے ادراک کے باوجود کند ذہن غافل کو ان صورتوں کے علاوہ کوئی اور ہی شکل نظر آتی ہے۔

غرض اس کی صورتوں کے اختلاف کا شعور فائدہ سے خالی نہیں ہے، جس طرح پر اس کی ابتدا رونما ہوئی اس کو بخوبی اپنے خیال میں جما کر مزید اس کو بڑھانے کی کوشش کرے، یہاں تک کہ تمام بدن کی نفی وقوع پذیر ہو جائے اور نفی کی دشواری کے وقت کلمۂ ''لَا مَوْجُوْدَ إِلَّا اللّٰهُ وَلَا فَاعِلَ إِلَّا اللّٰهُ'' کو ہر اس جگہ جس کی نفی دشوار معلوم ہو، ان دونوں کلموں کے مطلب کو سمجھ کر بوقت خیال ان تمام جگہوں پر ضرب لگائے، ان شاء اللہ تعالیٰ یہ شغل اس کے لیے کافی ہوگا۔ اور کبھی کبھی نفی کے بعد ایک طرح سے ایک ایسا خلا ظاہر ہوتا ہے کہ اگر کسی تلوار کا وار اس کے بدن پر لگے تو اس کا بدن مانع نہیں ہوگا، بلکہ وہ وار جس طرح سے خلا میں گزرتا ہے اسی طرح سے اس کے درمیان سے خالی گزر جائے گا، اور کبھی کبھی کاجل کے مانند ایک ایسی تاریکی ظاہر ہوتی ہے جس کے اردگرد ایک ایک نورانی چمک باریک خط کی طرح نمایاں ہوتی ہے، لیکن وہ نورانی لکیر مکدر اور تاریکی سے ملی ہوئی ہوتی ہے جیسے شعلۂ آگ کی لو جو دھوؤں سے اختلاط کے سبب تاریک و مکدر نظر آتی ہے، نیز وہ خط نورانی بالاستقلال دریافت نہیں ہوتا ہے، بلکہ تاریکی کے ضمن میں محسوس ہوتا ہے، اگر اس کی طرف

مستقل نظر ڈالیں تو اسی وقت وہ معدوم ہو جاتا ہے اور بجز تاریکی کے کچھ اور محسوس نہیں ہوتا ہے۔

غرض اس تاریکی کو نورِ نفی کا نام دیتے ہیں، اس شغل نفی کی بخوبی مشق کرنی چاہیے، کیوں کہ طالب کا ذہن امور مکدّرہ سے جو خس وخاشاک کے مانند ہیں، اسی شغل سے صاف وشفاف ہوتا ہے اور سالکین اکثر اوقات اس شغل کے محتاج ہوتے ہیں۔

فائدہ: شغل نفی کے ساتھ یادداشت ضروری ہے

طالب کو چاہیے کہ شغل نفی کے ساتھ مشغول ہونے کے دنوں میں شغل یادداشت بھی کرے، اور اس کی حقیقت ہر وقت یعنی اٹھتے بیٹھتے، کام کاج میں مشغولیت، مصائب سے دوچار ہونے اور کھانے پینے کے اوقات میں بے نظیر ذاتِ عالیہ کی طرف التفات دائمی ہے، اس طرح پر کہ کوئی چیز اس دھیان میں رکاوٹ نہ ہو، جیسا کہ کسی چیز کی محبت یا کسی کام کا اہتمام جب کسی شخص کے دل میں راسخ ہو جاتا ہے تو عین ضروری کاموں اور دنیاوی اعمال میں مشغولیت کے وقت بھی جیسا کہ ہونا چاہیے وہ اس امر کی طرف متوجہ رہتا ہے جو ہر صاحب وجدان پر واضح ہے۔ لہٰذا اللہ تبارک وتعالیٰ کی یاد سے غافل اشخاص کو چاہیے کہ بیان کردہ مثال کو اپنے وجدان سے دریافت کر کے حق تعالیٰ کے دھیان کو ممتنعات عقلیہ یا محالات عادیہ میں سے شمار نہ کریں بلکہ اس کو سہل وآسان سمجھ کر اس کی تحصیل پر اپنی کمر ہمت کو چست باندھ لیں۔

اور یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ جس طرح سے بعض اشخاص کو بعض چیزوں کی یادداشت حاصل ہوتی ہے لیکن وہ اس چیز کی یادداشت کے حصول پر متنبہ نہیں ہوتے ہیں مگر کسی ایسے معاملے کے پیش آنے کے وقت جو اس چیز کی یادداشت کے حصول کی یاد دلانے والی ہو، مثلاً ہر شخص کو اپنے بدن کی طرف التفات دائمی حاصل ہے اور اس کا علم نہیں ہوتا مگر کسی کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے یا کسی تکلیف کے وقوع کے وقت، اسی طرح بعض سالکین کو حق تعالیٰ کی یادداشت حاصل ہوتی ہے اور اس کے حصول کا علم نہیں ہوتا مگر کسی غفلت یا ایسے

امور کے پیش آنے کے وقت جو معاملۂ یادداشت میں خلل ڈالنے والے ہوں۔

اور حق تعالیٰ کی یادداشت کے ملکہ کے بعد دوسری یادداشت کو بھی اس کے ساتھ ضم کرلینا چاہیے، تفصیل کے ساتھ جس کا بیان دوسرے باب میں گزر چکا۔

## پانچواں افادہ: شغل نفی النفی

جب اپنی اور تمام عالم کی نفی طالب کے قابو میں آجائے تو نفی النفی اور فناء الفناء کا شغل شروع کرے، یعنی وہ چیز جس کے ذریعہ اپنی اور تمام موجودات کی نفی کرتا تھا اب اس کو بھی نیست ونابود تصور کرے، اور چوں کہ نفی النفی نیستیِ محض ہے، اس لیے اس کی علامت، موجودگی میں غفلت اور محسوس کرنے والی قوتوں میں صرف تعطل ہے۔ اگر اس شغل میں خوب کوشش کرے گا تو اس کا بدن معدوم ہوجائے گا اور اس کا کچھ بھی اثر باقی نہیں رہے گا، اگرچہ غفلت کی یہ حالت طالب کو پسند نہیں آئے گی، لیکن آیندہ کام آنے والی ہے اس لیے اس کو بیکار نہ چھوڑے بلکہ اس کو عمل میں لائے۔

اور نفی النفی کے ناپسند ہونے کا سبب یہ ہے کہ اس شغل میں علم واحساس کو دور کرنا ہے اور جب شعور ہی نہیں رہا تو کچھ بھی معلوم نہیں ہوسکتا اور انسان کی دل بستگی و مانوسی شعور ہی کے سبب سے ہے، اگرچہ شغل نفی میں بھی ہر چیز کو اپنے ادراک سے دور کرنا ہوتا ہے لیکن ایک صفائی سی اس کے خیال میں باقی رہتی ہے اور وہی دل بستگی کا باعث بنتی ہے اور جیسا کہ صاف طبیعت والے صاف وشفاف میدانوں میں مانوس ہوتے ہیں، اسی طرح شغل نفی میں بھی ایک انسیت ہوتی ہے بخلاف شغل نفی النفی کے کہ اس کا مدار اس مقام میں موجود نہیں ہے، (اس صورت میں اس کو مانوس کرنے والی چیز نہیں پائی جاتی ہے)۔

## چھٹا افادہ: توحید صفاتی کا انکشاف اور انوار کا ظہور

تکمیل نفی کے بعد دو صورتیں پیش آتی ہیں، کبھی تو توحید صفاتی منکشف ہوتی ہے، جس کا مجمل بیان یہ ہے کہ اس شغل کا حامل خود کے متعلق گمان یہ کرتا ہے کہ جو کثرت دنیا

میں ہے وہ اس کا منبع و مصدر ہے اور اس کی صورت اس طور پر نمودار ہوتی ہے کہ وہ اپنے بدن کو کشادہ اور وسیع خیال کرتا ہے اور وہ کشادگی و وسعت اس درجہ کو پہنچی ہوتی ہے کہ اس کا خیال عالم اجسام سے جس کے سب سے اوپر عرش مجید ہے، متجاوز ہو کر تمام جوانب سے احاطہ کر لیتا ہے اور وہ پورے عالم کو اپنے اندر دیکھتا ہے، اور افلاک، عناصر، پہاڑ، دریا، سمندر، درخت، پتھر، حیوان اور انسان سب کو اپنے جملہ جسم میں سے جانتا ہے۔

اس صورتِ حال میں اس کو آسمانوں کے مقامات پر اطلاع اور زمین کے بعض مقامات کی سیر جو اس کی جگہ سے دور دراز فاصلوں پر ہوتی ہے، بطور کشف حاصل ہوتی ہے اور اس کا کشف سچا ہوتا ہے۔

لیکن حقیقت میں خود کو پورے عالم کا کل نہ جانے بلکہ یہ اعتقاد کرے کہ یہ خیال مخالفِ واقع اس مرتبے کے آثار میں سے ہے، اور اس حالت میں توقف نہ کرے کیوں کہ یہ منزلِ مقصود کی سیدھی راہ نہیں ہے، اگرچہ ایک راہ ہے لیکن راہِ راست سے دور، سیر کی دشواری اور اس کے امتداد کی باعث ہے۔

انوار کے ساتھ اس مقام سے انتقال کا قصد کرے کہ یہی انوار اس کی پاک ذات کے حجب ہیں، اور کبھی کبھی انوار رنگ برنگ کے نظر آتے ہیں اور یہ صورت طالب کے حصولِ مقصد کی راہ ہے، اور وہ انوار ذات خالص اللہ جل شانہٗ کے حجب ہیں، انھیں طے کرنے کی کوئی مدت مقرر نہیں، اگر عنایت الٰہی شاملِ حال ہو تو ایک لمحے میں ہزاروں حجب طے ہو جاتے ہیں، لیکن سالک کے ایک حجاب سے دوسرے حجاب کی طرف انتقال کے لیے سبب عادی یہ ہے کہ وہ انوار میں سے ہر ایک نور کو اپنی قوتِ خیالیہ سے اس قدر وسیع کرے کہ وہ نور پورے عالم کا احاطہ کر کے قید مکان سے فضائے لامکاں تک تجاوز کر جائے۔

اس کے بعد اپنے دل سے انتقال کا پختہ ارادہ کر کے حضرت حق تعالیٰ کی جناب میں اس بات کی دعا کرے، اور اپنی خیالی نظر سے اس نور میں اس حد تک غور کرے کہ ایک

دوسرا نور اس نور کے اندر سے نظر آنے لگے اور اس کو بھی پہلے نور کے طریقے پر وسیع کرے اور اس سے تیسرے نور کی طرف منتقل ہو، اس طرح پر اس سلسلے کو جاری رکھے۔

بسا اوقات انسان انھیں حجب میں اٹک جاتا ہے اور اسے اصل مقصود تک پہنچنے کا راستہ نہیں مل پاتا ہے، اور ان حجابوں کے آخر میں ایک ایسا باریک اور بے رنگ حجاب ہے جس کو نسبت بے رنگی سے تعبیر کرتے ہیں، وہاں بھی کبھی وہ اپنا پڑاؤ ڈال دیتا ہے، اور کبھی کبھی بعض طالبین اسی کو مقصودِ اصلی سمجھ بیٹھتے ہیں اور وہاں رک جاتے ہیں۔

## ساتواں افادہ: خالص ذات پاک کی معرفت

جو شخص عنایتِ خداوندی اور تائید غیبی سے تمام حجابات طے کر لیتا ہے وہ ذاتِ پاک کی معرفت کے مقام تک پہنچ جاتا ہے، اس مقام میں عمدہ حالات اور مختلف اطوار پیش آتے ہیں اور اس جگہ میں جو غور و خوض ہوتا ہے، اس کو ''سیر فی اللہ'' کہتے ہیں، اور سالکین حضرات یہ نہ سمجھیں کہ اس مقام میں حالات متغیر اور مختلف نہیں ہوتے ہیں بلکہ آیت ''كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَأْنٍ'' (۱۶۷) کے مطابق ہر وقت خدا تعالیٰ کی ایک جدا شان جلوہ گر ہوتی ہے، اور طالب کے دل کے حالات کی تبدیل کے ساتھ غیب میں بھی اس کی نگاہ بصیرت میں ایک تفاوت و تبدیلی ظاہر ہوتی ہے۔ اور چوں کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کے مطابق کہ آدمی کا دل پَر کے اس ٹکڑے کے مانند ہے جو صاف میدان میں ہو اور ہواؤں کے جھونکے اس کو الٹتے پلٹتے ہوں، انسان کے دل کو قرار نہیں ہے، لہٰذا شئون ذات الٰہیہ کو بھی اس طرف سے سکون و اطمینان نہیں ہے، بلکہ دم بدم بدلتے رہتے ہیں، اور شئون الٰہیہ کے اختلاف کی وجہ سے مختلف معاملات اولادِ آدم کے حسبِ استعداد پیش آتے ہیں۔

''سیر فی اللہ'' کا تذکرہ بہت زیادہ تفصیل چاہتا ہے، جس کو ان اوراق میں قلم بند کرنا، دشوار ہے، البتہ وہ سلوک جو کہ متعارف ہے اور اس فن کی تصنیف کردہ کتابوں میں منضبط و مدوّن ہے وہ مقامِ معرفت پر منتہی ہو جاتا ہے۔

# دوسری فصل

## جدید طرز کے ساتھ طریقۂ چشتیہ کے بیان میں، جو زیادہ مؤثر اور جلدی سے تھوڑے زمانے میں بہت سے فوائد کے ظاہر ہونے کا موجب ہو، اور متعارف ریاضات ومجاہدات کی نظر سے آسان تر دکھائی دے

یہ فصل دو ہدایات پر مشتمل ہے، پہلی ہدایت: طریقۂ چشتیہ کے اشغال کے بیان میں، اس میں پانچ افادات ہیں:

### پہلا افادہ: "اللّٰہ اللّٰہ" کا ذکر

اوّلاً طالب کو چاہیے کہ باوضو ہو کر دوزانو نماز کے طریقے پر بیٹھے اور اس طریقت کے اکابرین یعنی حضرت خواجہ معین الدین سجزی (۱۶۸) اور حضرت قطب الدین بختیار کاکی (۱۶۹) وغیرہما کے لیے فاتحہ پڑھ کر بارگاہِ خداوندی میں ان بزرگوں کے وسیلے سے دعا کرے اور انتہائی عاجزی وانکساری کے ساتھ اپنی کامیابی کے لیے خوب دعا کرے پھر دوضربی ذکر شروع کرے۔

اس کا طریقہ یہ ہے کہ لفظ مبارک ''اللہ'' کو دوبار متصلاً کہے اور دونوں کے اتصال کے لیے پہلے لفظ کے آخری حرف کو پیش دے اور اس دو بار کہنے کو ایک ذکر قرار دے اور دونوں ذکروں کے درمیان فرق کرنے کے لیے اُس لفظ ''اللہ'' کو جس کو دونوں ذکروں میں دوسری دفعہ کہے، اس کو بطور وقف کہے یعنی حرف ''ہ'' کو جزم دے کر پڑھے اور پوری قوت کے ساتھ سینے سے نکالے اور جہر وشدت اور مد کے ساتھ کہے اور لفظ آخر کو اوّل کے مقابلے میں زیادہ جہر وشدت اور مد وقوت کے ساتھ بولے۔

اور لفظ اوّل کے ساتھ یہ خیال کرے کہ ایک نور اس کے سینے سے نکل کر اس کے لب پر پہنچ کر ٹھہر گیا ہے اور دوسرے لفظ کے ذکر میں وہاں سے نکل کر اس قوت و کثرت کی وجہ سے جو دونوں لفظوں کے اکٹھا ہونے سے حاصل ہوئی ہے، اس کے منہ سے باہر آکر اس کے سر پر پہنچ گیا ہے، پھر اس نور کو ایک ہاتھ کے بقدر لمبا تصور کرے اور اس ذکر کو حضور قلبی کے ساتھ بار بار کرے اور حضور دل کے لیے بس اس قدر بھی دھیان کافی ہے کہ یہ اسم مبارک اس ذاتِ پاک کا نام ہے جو اپنے نام کے ساتھ ہر وقت اور ہر جگہ موجود ہے، اس اسم مبارک کا اپنے پاک مسمّٰی سے غائب ہونا ناممکن ہے۔

اس کریم مطلق کے کامل فضل واحسان سے پختہ امید ہے کہ ذاکر کو بہت جلد ایک نور معلوم ہوگا، پس یہ ذکر اس قدر کرے کہ وہ نور چھتری کے مانند اس کے سر پر پھیل جائے، پھر کثرت اور تہہ بتہ ہونے کے باعث اس کے تمام بدن پر چھا جائے اور اس کے بدن کا اندر و باہر سے احاطہ کرلے اور اس کا وجود اس نور میں گم ہو جائے۔

## دوسرا افادہ: "اِلَّا اللّٰہ" کا ذکر

یہ بات حاصل ہو جائے اور اس کی عادت و مشق اس طرح پر میسر ہو جائے کہ وہ ہر وقت بلا تکلف اس طرح ذکر کر سکے اور ایسا ذکر ذاکر کے بس میں آجائے، تو دوسرا ذکر شروع کرے اور وہ لفظ "إِلَّا اللّٰـه" کا ذکر ہے اور یہ ذکر بھی اسی قوت وشدت اور جہر کے ساتھ کرے جس طرح پہلے مذکور ہوا، لیکن اس قدر فرق ہے کہ اس کلمہ کی ضرب نیچے کی جانب اپنے دونوں زانوں کے درمیان میں لگائے۔

اور نور کو اسی قدر نیچے کی جانب خیال کرے جس قدر ذکر اوّل میں اوپر کی طرف خیال کیا تھا، اور اس کو نیچے سے اوپر کی طرف لائے، تاکہ نور فوقانی اور نور تحتانی ایک ایسے ستون کے مانند ہو جائیں جس میں ذاکر کا بدن گم ہو جائے۔

## تیسرا افادہ: آہستگی کے ساتھ لفظ "اللّٰہ" کا ذکر

پھر نرمی اور آہستگی کے ساتھ، تیسرا ذکر شروع کرے اور اس ذکر میں پہلے ذکر کے طریقے پر صرف لفظ "اللہ" کہے بدون ضرب، سختی اور بلند آوازی کے، اور اس لفظ مبارک کو اپنے خیال میں اس نور میں جو اس کے بدن کی جگہ پر ہے، جھاڑو اور صیقل کرنے والے آلے کی طرح گھمائے تاکہ اگر اپنے بدن وغیرہ کے خیال سے اس میں کچھ کدورت رہ گئی ہو تو وہ اسے صاف وشفاف کردے اور وہ مکمل نور خوب صاف وچمک دار ہو جائے۔

## چوتھا افادہ: ذکر نفی واثبات

جب یہ نور اس طرح پر صاف وشفاف ہو جائے کہ اس کی شعاع ہر طرف سے دور دور تک جا پڑے اور اس کا تصفیہ وتصقیل بھی ذاکر کے قابو میں آجائے تو چوتھا ذکر شروع کرے اور وہ ذکرِ نفی واثبات یعنی "لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ" کا ذکر ہے۔

پس لا کو اپنے خیال میں کھینچ کر زمین وآسمان کا محیط بنادے اور تمام دورے کو گھیر کر "إِلٰـــهَ" کو اپنے اندر تمام کرے، اور لا کے کھینچنے کا طریقہ یہ ہے کہ اپنے سامنے دراز اور وسیع خیال کرے یہاں تک کہ وہ عرشِ مجید تک جا پہنچے، پھر اس کو متحرک تصور کرے کہ وہ پورے عالم میں نقل وحرکت کر کے ایک دائرہ کی طرح ہو کر اپنے مقام پر لوٹ آیا ہے۔ اور لفظ "إِلَّا اللّٰـــهُ" کے ساتھ اوپر کی جانب میں عرش مجید کے اوپر ضرب لگائے اور "لَا إِلٰـــهَ" میں درحقیقت ہر چیز کی معبودیت، اپنے وجود اور کائنات کی تمام اشیا کی نفی کو اپنے ذہن ودماغ میں درست طریقے پر مضبوط ومستحکم کرلے، اور "إِلَّا الـــلّٰـــهُ" کی ضرب میں ذات خالص کی طرف اشارہ کرے کیوں کہ کلام مجید میں "الرحمن علی العرش استویٰ" (۱۷۰) آیا ہے۔ اس ذکر کے تکرار کے ساتھ اس ذات خالص کا نور عرش کے اوپر سے دریائے زخّار کے مانند اس قدر کثرت اور وسعت کے ساتھ آئے گا کہ پوری دنیا کو گھیر لے گا بلکہ پورا عالم اس میں گم ہو جائے گا جیسا کہ ذکر اوّل میں فقط ذاکر کا جسم گم ہوا تھا، اس طرح پر ذکر نفی

واثبات طالب صادق کے واسطے کمالات مقصودہ کے حصول کے لیے کافی ہے، بس فہم درست ہونا چاہیے اوراس ذکرکوکثرت کے ساتھ عمل میں لائے،تو بفضل الٰہی ترقیات کے حصول میں دوسرے شغل کامحتاج نہیں ہوگا۔

## پانچواں افادہ: مراقبات وثمرات

اس ذکر سے منزل مقصود کی طرف منتقل ہونے کا طریقہ یہ ہے کہ اس نور کے استحکام کے بعد جوعرش کےاوپر سے آکر پورے عالم کواپنے گھیرے میں لے رکھاہے، اسی نور میں مراقبہ کرے اور ذکرکوترک کردے۔

اس مراقبہ کا طریقہ یہ ہے کہ اپنی اور تمام عالم کی نفی کو ذکر کردہ نور کے احاطے سے حاصل کرکے پوری توجہ کے ساتھ دھیان میں رکھےاور بیان کردہ نفی کواس طرز پراپنے قابو میں کرلے کہ اوّلاً بغیر نور کے دھیان کے بھی اپنی اور تمام کائنات کی نفی اس کے لیے آسان ہوجائے،اگرچہ نفی اس نور سے جدانہیں ہوتی،لیکن اس شخص کوچاہیے کہ نفی کومقصودلذاتہ بناکرشغل نفی کومضبوط کرے،اوراستحکام نفی کے بعدیاتو توحیدصفاتی ظاہرہوگی یاانوارکامشاہدہ ہوگا۔

اور دوسرا طریقہ مقصد برآری کا طریقہ ہے، لہٰذا اس طریقے کے مطابق جوفصل اوّل میں مذکور ہوا،نورانیت کے ان حجب سے تجاوز کرے، تاکہ حجب کے آخر پرجس کو نسبت بےرنگی کہتے ہیں، فائز ہو۔اگرچہ اس طریقے کی نسبت کوچاند کی روشنی سے جومنتشر ہوتاہے،تشبیہ دیتے ہیں،لیکن حقیقت میں یہ بے رنگ ہے،ایک طرح سے جو یہ رنگ معلوم ہوتاہے اس میں غورکروتو کوئی رنگ خیال میں نہیں آتا،جب اس آخری حجاب سے بھی تجاوز واقع ہوجائےتو ذاتِ پاک تک وصول متحقق ہوگا جورائج سلوک کی منتہا ہے۔

# دوسری ہدایت

## متفرق فوائد کا بیان

یہ ہدایت دو افادات پر مشتمل ہے:

### پہلا افادہ: ذکر "یَا حَیُّ یَا قَیُّوْمُ" کا بیان

آسمانوں کے حالات کے انکشاف، ارواح وملائکہ سے ملاقات، جنت وجہنم کی سیر، ان مقامات کے حقائق پر اطلاع اور وہاں کے مکانوں کی دریافت اور لوحِ محفوظ کی کسی بات کے مشاہدہ کے لیے "یَا حَیُّ یَا قَیُّوْمُ" کا ذکر مقرر ہے۔

"یَـا حَیُّ" کو ذکر خیالی میں اپنے سینے کے درمیان سے لب تک لائے اور اپنی روح کو اس کے نیچے جوڑ دے، پھر "یَـا قَیُّوْمُ" کو سینے سے نکالے اور چوں کہ اس لفظ مبارک کا تلفظ لفظ اوّل کے تلفظ سے متصل ہوتا ہے اس لیے ضرور ان دونوں مبارک اسموں کا اثر اخیر لفظ کے تلفظ کے وقت مجتمع ہو کر قوت پکڑ لیتا ہے، لہٰذا اس دوسرے لفظ کے تلفظ کے ساتھ ان دونوں الفاظ مبارکہ کی استعانت سے بایں طور کہ یہ اسم مقدس روح کے نیچے ہو جائے اور روح دونوں ناموں کے درمیان میں ہو، روح کو عرش کے اوپر لے جائے اور وہاں پہنچ کر ٹھہر جائے، اور سیر وسیاحت کرے۔ سیر وسیاحت میں اسے اختیار حاصل ہے، عرش کے اوپر سیر کرے یا اس کے نیچے گشت لگائے اور خطۂ آسمان میں سیر کرے یا بقعۂ زمین پر سیاحت کرے جیسے کعبۂ مقدسہ اور دیگر بابرکت مقامات وغیرہ، اور جب کچھ دیر کے بعد اِس عالم کو دیکھنا چاہے تو ان دونوں اسموں کی مدد سے اوپر سے نیچے کی طرف انتقال کرے "یَـا حَیُّ" کے خیالی ذکر سے وہاں سے لوٹنے کی تیاری کرے اور "یَـا قیّوم" کے ہم راہ بتدریج اپنے مکان کی طرف اترے اور اترنے میں آسمانوں کو جدا جدا سمجھے۔

## دوسرا افادہ: ذکر "سُبُّوحٌ قُدُّوسٌ رَبُّنَا وَرَبُّ الْمَلَائِكَةِ وَالرُّوحُ" کا بیان

قبور کے لیے "سُبُّوحٌ قدّوسٌ ربّنا وربُّ الملٰئكة والروح" کا ذکر مقرر ہے۔
اس کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے اسم یعنی "سُبُّوحٌ" کے ساتھ ناف سے دماغ یعنی لطیفۂ اخفیٰ کے مقام تک پہنچے اور دوسرے اسم یعنی "قُـدُّوسٌ" کے ہم راہ وہاں سے عرش مجید تک جائے اور تیسرے اسم کے ساتھ وہاں سے لوٹ کر ضرب کے طور پر دل میں مارے اور دل کے اوپر سے داخل ہو کر اور اس کے نیچے سے نکل کر قبر کی طرف متوجہ ہو، اور اگر مقصود ایک دفعہ میں حاصل نہ ہو تو پریشان نہ ہو، بلکہ بار بار توجہ، دھیان اور التجا و زاری کے ساتھ اس مدعا کو حاصل کرنے کی کوشش کرے، اور فضلِ الٰہی سے قوی امید رکھے کہ مطلوب کشف حاصل ہوگا، اور اس کشف قبور کو بعض ناواقف حضرات قربِ الٰہی کا ذریعہ جانتے ہیں حالاں کہ درحقیقت یہ اس سے دوری کا باعث ہے۔

# تیسری فصل

## طریقۂ نقش بندیہ کے اشغال کا بیان

اس میں ایک تمہید اور دو ہدایات ہیں:

**تمہید: لطائف کے مقامات**

چھ لطائف جو انسان کے اندر ہیں، ان کی جگہوں کو معلوم کرنا چاہیے۔ لطیفۂ قلب بائیں سینے کے نیچے، لطیفۂ روح داہنے سینے کے نیچے اور لطیفۂ سر ان دونوں کے درمیان یعنی سینے کے بیچ میں ہے، لطیفۂ نفس کا مقام عین ناف ہے اور لطیفۂ خفی کا مقام پیشانی میں ہے جو سر کے بالوں کا منتہا ہے اور جہاں سے پیشانی شروع ہوتی ہے اور سجدے کی وجہ سے جہاں نشان پڑ جاتے ہیں، اور لطیفۂ اخفیٰ کا مقام تالو میں ہے جو مقدم الرأس ہے اور جہاں بچوں کے سر میں حرکت محسوس ہوتی ہے۔

# پہلی ہدایت

## اس ذکر کے اقسام کا بیان جو طریقہ نقش بندیہ میں رائج ہے

یہ ہدایت چار افادات پر مشتمل ہے:

**پہلا افادہ: لطائف کے ذکر کا بیان**

لطائف ششگانہ کو اسی ترتیب پر جو تمہید میں مذکور ہوئی، اچھی طرح سے ذاکر بنانا

چاہیے، اس طور پر کہ خود ان کے ذکر پر آگاہ ہو اور تلقین کرنے والا جس نے اپنے لطیفے میں ذکر جاری کیا ہے، پوری توجہ کے ساتھ طالب کے لطیفے میں اس ذکر کا القا کرے اور دعا و التجا کے ذریعے محض اللہ تعالیٰ سے مدد چاہے اور مضبوط ارادے کے ساتھ توجہ کرے، توجہ کا سب سے چھوٹا اثر جنبشِ فیض کی قبیل سے ایک حرکت کا ظہور ہے، اس معنی میں نہیں کہ وہ حرکت ہاتھ رکھنے سے معلوم ہو جائے بلکہ اس معنی میں کہ وہ صرف توجہ سے معلوم ہو جائے، بلکہ اس سے آگے بڑھ کر دوسرے کاموں میں عین مشغولیت کے وقت بھی انسان کو وہ حرکت اپنی طرف متوجہ کر لے اور اس کو نہ چھوڑے کہ وہ اس سے بالکل غافل ہو جائے۔

لہٰذا اس حرکت کو نامِ پاک الٰہی کا مقارن جانے کہ وہ اس حرکت کے ساتھ اللہ اللہ کہتا ہے، اور اس نامِ مقدس کے مسمّٰی کے ساتھ انسیت اور تعلق پیدا کرے۔ پس ان لطائف کے اذکار کی جدا جدا مشق کر کے، یک بارگی تمام لطائف سے ذکر کرے، یہاں تک کہ ایک ہی وقت میں ان سب کا ذکر معلوم ہو، اور لطائف کے اس ذکر کو پختہ کرے، اور پختگی کا سب سے چھوٹا درجہ یہ ہے کہ وہ جب چاہے اس میں مشغول ہو سکے۔

اور اگر تلقین کرنے والا مرشد مزید ذکر کرنے کا حکم دے، تو اس کے حکم کی تعمیل کرے، اور چھیوں لطائف میں سے ہر ایک کا ایک الگ نور ہے جو اس طریقے کے بزرگوں کی کتابوں اور رسالوں میں مفصل درج ہے، اور کثرت کے ساتھ لطائف کے اذکار ہر ایک لطیفہ کو اپنی روشنی سے منور کرتے ہیں۔ اگرچہ یہ روشن کرنا بہتر اور بہت اچھا ہے لیکن راہِ سلوک میں طول مسافت کا سبب بنتا ہے اور وہ طول بالکل ضروری نہیں ہے، جب انسان نورانیت کے حجب میں پہنچتا ہے تو خود بخود لطائف کے انوار کا مشاہدہ کرتا ہے، اور مشق کے بعد ہر لطیفہ کو اپنی روشنی سے بلکہ جس روشنی سے چاہے رنگین کر سکتا ہے، اور لطائف کے اذکار کے دوران میں یہی مطلب بڑی کوشش و محنت سے سرانجام پاتا ہے، بعد ازاں یہ مطلب نورانیت کے حجب کے مقام میں بغیر جد و جہد کے بھی میسر ہو جاتا ہے۔ لہٰذا ابتدا میں اپنے انوار سے لطائف کو رنگین کرنے کی کوشش کرنے کی مثال ایسی ہے

جیسے ''سکندر نامہ'' کے مضامین کی تعلیم کسی ''کریما'' خواں کو دی جائے۔ لہٰذا بہتر یہ ہے کہ ادنیٰ مرتبے کو بقدرِ ضرورت استعمال کرے اور وقت کو شمشیر برّاں جان کر بہت جلد اس سے گزر جائے اور بلند مقامات میں بقدر استعداد و سیر روح کے توقف کرے۔

## دوسرا افادہ: نفی و اثبات کے ذکر کا بیان

اس کے بعد نفس کو قید کر کے ذکر نفی و اثبات کرے، اس کا طریقہ یہ ہے کہ دو زانو مؤدب ہو کر قبلہ کی طرف رُخ کر کے بیٹھے اور اس اپنی سانس کو روک کر کے زبان کو تالو سے لگا کر "لَا" کو لطیفۂ نفس سے کھینچے اور لطیفۂ سر پر قدرے توقف کرے، اس کے بعد لطیفۂ خفی پر بھی ٹھہر کر لطیفۂ اخفیٰ تک پہنچے۔ غرض ایک خیالی حرکت لطیفۂ نفس سے لطیفۂ اخفیٰ تک کرے اور اس امتداد حرکت کے درمیان لطیفۂ سر و لطیفۂ خفی کے مقام میں مستقل متوجہ ہو کر ان دونوں کے امتیاز کے لیے تھوڑا ٹھہرے، اور ''الٰہ'' کو لطیفۂ اخفی سے کھینچ کر لطیفۂ روح کی طرف متوجہ ہو کر "إِلَّا اللّٰهُ" کی ضرب لطیفۂ قلب پر لگائے۔

ان خیالی حرکتوں میں سے کوئی ظاہری حرکت اعضا میں سے کسی عضو پر یہاں تک کہ سر، منھ، لب اور زبان پر بالکل نہ ہو، اور طاق عدد میں اس ذکر کو عمل میں لائے، ایک دفعہ ذکر کر کے اپنے نفس کو چھوڑ دے اور اطمینان و قرارِ نفس کے بعد دوسری دفعہ ذکر کرے، اور جب حبسِ نفس کا تحمل خوب ہو جائے تو ذکر کی تعداد میں کچھ اضافہ کرے، اور زیادتی کا سب سے چھوٹا درجہ اکیس ۲۱/ بار ہے، جب اکیس دفعہ تک پہنچ جائے گا اور اس کی خوب مشق کر لے گا اور ایک مجلس میں سیکڑوں تک شمار پہنچا دے گا تو اس وقت یقیناً اس کے لطائف میں گرمی و صفائی پیدا ہوگی، اور اس ذکر سے ایسا معلوم ہوگا کہ ایک شعلہ جوّ الہ ہے جس نے اس کے تمام لطائف کا احاطہ کر کے خط آتشیں کی طرح لمبا ہو گیا ہے۔

## تیسرا افادہ: سلطان الذکر کا بیان

ذکر نفی و اثبات کی خوب مزاولت کے بعد سلطان الذکر کو عمل میں لائے۔ اس کی

تفصیل یہ ہے کہ ہر جزءِ انسانی کے لیے ایک وحدت ثابت ہے، اور اس وحدت کی پہچان کے لیے ہر ایک جز کا علاحدہ علاحدہ نام ہے، جسم کے کل اجزا میں سے ہر ایک کے الگ الگ نام متعین ہیں۔

لہٰذا ہر ایک جز جسم انسانی کا حصّہ ہے، اس بنیاد پر اس کے واسطے علاحدہ علاحدہ ایک ایک زبان بھی مقرر ہے، اور حضرت حق تبارک وتعالیٰ کے ارشاد: "وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ" (۱۷۱) کے مطابق اس کے تمام اجزا ذکرِ الٰہی کرتے ہیں لیکن انسان کو محسوس نہیں ہوتا ہے۔

بس سلطان الذکر کی حقیقت یہ ہے کہ ایک قسم کے ادراک سے اپنے تمام اعضا کے اذکار کو معلوم کرے اور ان پر آگاہی واطلاع حاصل کرے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ اپنے بدن کی ہر جگہ کو علی العموم لطائف ششگانہ کے درجے میں سمجھے، اور یہ بالکل ظاہر ہے کہ لوگوں کی نظر لطائف کے مقامات اور تمام بدن پر برابر پڑتی ہے، جب وہ لطائف کے مقامات سے ذکر کو پہچان گیا اور اس کی کیفیت پر مطلع ہو گیا تو اسی طرح پر تمام بدن سے ذکر کو معلوم کرلے گا۔

مرشد کو چاہیے کہ خود سلطان الذکر کر کے بیان کردہ طریقے کے مطابق طالب پر القا کرے اور اس کا اثر کبھی تو پورے بدن میں واضح حرکت کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے، اس طور پر کہ اس کے ہاتھ، پاؤں اور دوسرے اعضا اس کے ارادے کے بغیر اپنی جگہ سے منتقل ہونے لگتے ہیں اور کبھی رعشہ کے مانند حرکت ظاہر ہوتی ہے اور کبھی کبھی کپکپی معلوم ہوتی ہے یا ایسا محسوس ہوتا ہے کہ چیونٹیاں اس کے بدن پر چل رہی ہیں، اور پورے بدن میں سردی اور سبکی محسوس ہوتی ہے، اور کبھی ذاکر کے جسم میں اس قدر ٹھنڈک سرایت کر جاتی ہے کہ سخت گرمی کے وقت میں بھی اسے سردی محسوس ہوتی ہے، اور اس کا ہلکا پن ایسا محسوس ہوتا ہے گویا کہ اس کے تمام بدن سے آلائش کو دور کر دیا گیا ہو، اس شخص کے مانند جس نے کیسۂ مالی سے غسل کیا ہو، غسل ظاہری میں یہ سبکی صرف جلد پر نظر آتی ہے اور سلطان الذکر

میں اندرون سے صفائی حاصل ہوتی ہے۔

اور یہ بات خرقِ عادت کی قبیل سے ہے کہ سخت اختلاج کے مانند اس کا پورا بدن قابو میں نہیں رہتا ہے اور یہ محض کرامت ہے کہ تمام بدن، درودیوار، خس وخاشاک، کانٹوں اور پتھروں سے ذکر جہری کی آواز سلطان الذکر کرنے والے کو سنائی دیتی ہے، اور پاس والوں کو بھی سنائی دینا بیان کردہ کرامت میں مزید اضافہ ہے، اور کبھی کبھی سلطان الذکر والے کو ایک نور محسوس ہوتا ہے۔

**فائدہ:** مرشد کے لیے طالب میں سلطان الذکر وغیرہ کے ذریعہ ذکرِ لطائف کے حصول کو معلوم کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ مرشد خود کو خالی کر کے اس کی طرف متوجہ ہو، اور اس وقت جو کچھ وہ اپنے اندر پائے، جان لے کہ وہ طالب کے ذکر کا عکس ہے، لہٰذا اس وقت جو کچھ مرشد میں ظاہر ہوگا وہی طالب میں ہوگا، شغل کی مکمل کیفیت وکمیت کا پَرتَو اس پر پڑے گا۔

## چوتھا افادہ: مراقبات اور نتائج کا بیان

جب سلطان الذکر بیان کردہ طریقے کے مطابق گرفت میں آجائے اور ارادہ کے وقت بلا تکلف ظاہر ہوجائے، تو شغل نفی شروع کرے اور شغل نفی کے ساتھ شغل یادداشت کو بھی ضم کرلے، اس کے بعد شغل نفی النفی کو عمل میں لائے۔ پس سالک پر یا توحید صفاتی منکشف ہوگی یا نورانیت کے حجب ظاہر ہوجائیں گے۔

اور امر ثانی مقصد یابی کا طریقہ ہے، بس سالک کو چاہیے کہ ان حجب سے اس طریقے کے مطابق جسے فصل اوّل میں بیان کیا گیا، آگے بڑھے اور حجابات کے طے کرنے کے دوران ''مراقبۂ صمدیت'' کا اہتمام کرے، تاکہ حجب کے آخر تک جس کو نسبت بے رنگی سے تعبیر کرتے ہیں، پہنچ جائے۔ اگرچہ اس طریقے کی نسبت کو اس دریا کے پانی سے جو آلودگی خس وخاشاک، ریت اور مٹی سے پاک ہو تشبیہ دیتے ہیں۔

بہرکیف گہری نظر ڈالنے کے بعد کوئی بھی چیز قابل وضاحت نہیں معلوم ہوتی ہے

اورنسبت بے رنگی سے تجاوز کے بعد ذاتِ خالص کی معرفت حاصل ہوتی ہے اور سلوک ومعرفت اپنے اختتام کو پہنچتی ہے اور سیر فی اللہ سامنے آتی ہے۔اس دوران بہترین حالات اور عجیب وغریب مقامات ظاہر ہوتے ہیں،اور جس مرشد کے حضور میں طالب ''سیر فی اللہ'' میں ترقی کرے گا وہ مرشد اس کو وہاں کے مقامات کے حقائق پر مطلع کردے گا۔

**فائدہ:** اس طریقے کے امام حضرت خواجہ بہاؤالدین نقشبندی قدس سرہٗ (۱۷۲) نے فرمایا ہے:

اوّل ما آخر ہر منتہی است　　　آخر ما جیب تمنا تہی است (۱۷۳)

سچے طالب کو چاہیے کہ وہ اسی امر کا متلاشی ہو جس کو حضرت والا نے جیب تمنا کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے،اور اس کی اجمالی تعریف طالب کا اپنے عزائم وارادے سے خالی ہونا ہے،اور اس کی تفصیل ان شاء اللہ اس کتاب کے چوتھے باب میں بیان کی جائے گی۔

# دوسری ہدایت

## مختلف فوائد کا بیان

اس ہدایت کے تحت دو افادات اور ایک فائدہ ہے:

### پہلا افادہ: کشفِ ارواح کے طریقے کا بیان

ارواح وملائکہ اور ان کے مقامات کے کشف، زمین وآسمان اور جنت وجہنم کی سیر اور لوح محفوظ پر اطلاع کے لیے شغل دورہ کرے، جس کا طریقہ تفصیل کے ساتھ فصل اوّل میں گزر چکا ہے، بس اسی شغل کی مدد سے زمین وآسمان اور جنت وجہنم میں سے جس مقام کا ارادہ ہو، اس کی طرف متوجہ ہوکر اس مقام کی سیر کرے، وہاں کے حالات معلوم کرے اور وہاں والوں سے ملاقات کرے، اور کبھی کبھی ان سے گفتگو کا موقع بھی ملتا ہے

اوران سے صلاح ومشورہ کے ذریعے آیندہ یا گزشتہ باتوں میں سے کوئی بات یعنی دینی ودنیاوی کاموں میں سے کوئی کام معلوم ہوجاتا ہے۔

## دوسرا افادہ: آیندہ واقعات کے کشف کا بیان

معلوم ہونا چاہیے کہ آیندہ واقعات کے کشف کے لیے اس طریقے کے اکابرین نے متعدد طریقے قلمبند کیے ہیں، ان میں سب سے بہتر اور اولیٰ طریقہ یہ ہے کہ رات کے تیسرے پہر میں بیدار ہوکر پورے آداب ومستحبات اور انتہائی حضور قلبی کے ساتھ وضو کرے، اوران ادعیۂ ماثورہ کو جو وضو کے بعد تکفیرِ سیئات کے لیے مقرر ہیں۔ کفارۂ سیئات کی نیت سے کمال عاجزی کے ساتھ خالقِ ارض وسما کے جناب میں پڑھے۔ اس کے بعد صلوۃ التسبیح پورے آداب ومستحبات کی رعایت اور دل وجسم کے اطمینان کے ساتھ بغایت خشوع وخضوع پڑھے، اور پوری نماز میں خالق کائنات کے دربار میں گناہوں کے کفارے کی دعا اور خطاؤں کی معافی کی التجا کو تہہ دل میں ملحوظ رکھے، اور نماز کے بعد دل کی گہرائی سے تمام معاصی سے توبہ کرے، اور اس حد تک التجا کرے کہ اس کے دل میں خطاؤں کی معافی اور توبہ کی قبولیت کا یقین پیدا ہوجائے۔ پھر اسی وقت اشغال طریقت میں سے جس شغل میں مہارت رکھتا ہو، اس میں متوجہ ہو اور اس پورے شغل میں اللہ ربّ العزت کے دربار میں واقعۂ مطلوبہ کے کشف کے لیے التجا کو اپنی نگاہ بصیرت کے سامنے اس طرح پر رکھے کہ اس کی پوری توجہ اس واقعے کے انکشاف کی طرف متوجہ ہو، تو بارگاہِ خداوندی سے قوی امید ہے کہ اس واقعے کا انکشاف اوپر سے نزول الہام کے طریقے پر ہوگا یا تہِ دل سے اس واقعے کے ظہور کے طور پر ہوگا۔ وساوس اور نزول الہام کے درمیان فرق یہ ہے کہ الہام ایک ایسا امر ہے جو دل میں اتر کر ٹھہر جاتا ہے اور وساوس کو قرار وثبات حاصل نہیں ہوتا، اور اس کے آنے جانے کا کوئی راستہ متعین نہیں ہے، چور اور جیب تراش کی طرح ایک طرف سے آتا ہے اور دوسری طرف سے نکل جاتا ہے، اور ایسا محسوس ہوتا ہے گویا کہ کوئی چیز ہے

جس نے دل کی ایک جانب میں کچھو کا لگا یا اور دوسری بار دوسری جانب میں۔

اور اگر مذکورہ بالا طریقے سے واقعے کا انکشاف نہ ہو تو چاہیے کہ انتہائی عاجزی کے ساتھ بارگاہِ خداوندی میں دعا کرے کہ اے اللہ میں جاہل ہوں اور تو ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے، تو جانتا ہے کہ میں نے فلاں واقعے کے کشف کے لیے اس طریقے سے کوشش کی مگر مقصود حاصل نہیں ہوا، لہٰذا اپنے بندوں میں سے کسی کی زبان پر ایسا کلام جاری فرمادے جس سے میں اپنے مقصد کو پالوں، اس کے بعد اپنے کان کو ان آوازوں کی طرف لگائے جو لوگوں سے نیند یا بیداری کی حالت میں صادر ہوتی ہیں، اور فال کے طور پر ان کی باتوں سے اپنی غرض کا استنباط کرے۔ اگر اس طرح سے بھی مطلوب کشف حاصل نہ ہو تو چاہیے کہ وقت مذکور یعنی سہ پہر رات میں واقعہ مطلوبہ کے کشف کی نیت سے دو رکعت نماز ادا کرے اور ہر رکعت میں تین بار سورہ فاتحہ، تین بار آیت الکرسی اور پندرہ مرتبہ سورہ اخلاص پڑھے، اس کے بعد سر سجدے میں رکھ کر نہایت ہی خشوع وخضوع کے ساتھ ایک سو ایک بار "یَا خَبِیْرُ اَخْبِرْنِیْ" حصولِ کشف کی نیت سے کہے، اس کے بعد کشف کی دعا کر کے سو جائے، ان شاء اللہ تعالیٰ خواب میں کسی بھی طرح سے اس واقعہ کا ظہور ہوگا خواہ صراحتاً ہو یا اشارۃً۔

## فائدہ:۔ شغل برزخ (تصور شیخ) کا ذکر

جملہ اشغال مبتدعہ میں سے شغل برزخ ہے جو اکثر متأخرین میں مشہور ہو گیا ہے، بلکہ بعض بزرگوں کے کلام میں بھی پایا جاتا ہے، شغل برزخ کی حقیقت یہ ہے کہ دفع وساوس اور جمعیت خاطر کے لیے شیخ کی صورت کو پوری تعیین و تشخیص کے ساتھ اپنے خیال میں حاضر کرتے ہیں اور انتہائی ادب و تعظیم اور پوری توجہ کے ساتھ اس صورت کی طرف متوجہ ہوتے ہیں گویا کہ بغایت ادب و تعظیم شیخ کے روبرو بیٹھے ہوں اور دل کو بالکل اسی کی طرف متوجہ کیے ہوئے ہوں، شغل برزخ کی اس حقیقت کا حال صورت گری کے حال سے معلوم

کر سکتے ہیں، اس لیے کہ صورت بنانا گناہِ کبیرہ ہے اور خصوصاً اس کو تعظیم وتوقیر کے ساتھ دیکھنا قطعاً حرام ہے۔ اور حضرت ابراہیم علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد جو انھوں نے اپنی قوم کو مخاطب کر کے فرمایا تھا: "مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ الَّتِيْ اَنْتُمْ لَهَا عَاكِفُوْنَ" (۱۷۴) یہ اپنے اطلاق کی بنا پر اس پر دلالت کرتا ہے، مجسموں کے سامنے عکوف ممنوع ہے اور عکوف کا معنی موجودہ ہستی کو بیٹھ کر یا کھڑے ہو کر ادب و تعظیم اور محبت کے ساتھ مضبوطی سے پکڑنا ہے، اور اس میں کوئی شک نہیں کہ جو شخص یہ عمل ظاہری صورت کے ساتھ کرے گا وہ یقیناً گنہگار ہوگا اور اس گنہگار کے عمل میں اور سالک یعنی اس طالب راہِ حق کے شغل میں فرق صرف اتنا ہے کہ اوّل میں رنگین تصویر کاغذ یا اس جیسی دوسری چیز پر بنی ہوئی تصور میں ہوگی اور ثانی میں پوری تصویر کھال کے رنگ، بال اور خدوخال سمیت صفحۂ خیال میں ہوگی۔

اگرچہ ظاہر میں یہ بت پرستی نہیں ہے لیکن باطن میں یہ صاف صورت پرستی ہے، کاغذی صورت اس قدر تصویر کی باریکیاں بیان نہیں کرتی ہے جس قدر خیالی صورت بیان کرتی ہے، باوجودیکہ دونوں بے جان ہیں۔ پس تصویری معنی میں خیالی صورت کاغذی صورت سے بڑھ کر ہے، دونوں کے درمیان فرق نہیں ہوسکتا ہے مگر یہ کہ پہلی صورت میں شریعت کے ظاہری انتظام میں خلل واقع ہوتا ہے اور دوسری صورت میں ظاہری انتظام کو تو کوئی نقصان نہیں پہنچتا، لیکن اس کی تاثیر کے لحاظ سے ایسے عمل کرنے والے کے نفس میں جو برائی واقع ہوتی ہے وہ پہلی صورت کے مقابلے میں اس صورت میں زیادہ ہے، لہٰذا اس وجہ سے چاہیے کہ یہ بھی حرام ہو، اور اس سے قطعِ نظر شغل برزخ کا رواج ناقصوں کو پہلی صورت تک پہنچا دیتا ہے۔ اور جیسے دوسرے لوگ ظاہری تصویریں بنا کر تعظیمی حرکتیں تصویر والوں کے سامنے کرتے ہیں، اسی طرح سے یہ لوگ وہی تعظیمی افعال ان تصویروں کے سامنے بجالاتے ہیں اور صاف بت پرستوں کی فہرست میں اپنا نام درج کرا لیتے ہیں۔ شغل برزخ کے، اس عمل کے باعث ہونے میں جو کہ صریح حرام ہے کوئی شک وشبہ

نہیں ہے، لہٰذا اس کو بھی حرام ہونا چاہیے۔

اور شریعت محمدیہ علی صاحبہا الصلاۃ والسلام میں صورت پرستی کی روک تھام کے لیے تصویر سازی کو مطلقاً ممنوع قرار دیا گیا ہے اور دوسری شریعتوں میں تصویر سازی بعض اغراض صحیحہ کی بنا پر مثلاً مردہ یا زندہ غائب شخص کے حلیہ اور شکل وشباہت کی معرفت کی غرض سے درست تھی۔

بس جب شارع علیہ السلام نے تصویر سازی میں اس قدر احتیاط برتی ہو تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی متابعت کرنے والوں کو بھی چاہیے کہ اسی احتیاط کے طریقے کو اختیار کرکے شغل برزخ کو حرام اور برا جانیں، اور جو شخص پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت سے بخوبی واقف ہوگا اسے معلوم ہوگا کہ اگر اس بات کا استفتاء اس مبارک زمانہ میں لیا جاتا تو یقیناً آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس سے منع فرما دیتے اور اس کی حرمت ظاہر ہو جاتی۔

# چوتھی فصل

## طریقۂ مجددیہ قدس اللہ سر إمامھا کے اصطلاحات کا حل

اس فصل میں ایک تمہید اور ایک مقصد ہے:

### تمہید: بعض اشغال کا ذکر

معلوم ہونا چاہیے کہ مقاماتِ لطائف، طریقۂ مجددیہ کے اکابرین مثلاً شیخ عبدالأحد (۱۷۵) اور اس سلسلے کے دوسرے حضرات قدس اللہ اسرارہم کے نزدیک اس طرح سے ہیں، لطیفۂ قلب کا مقام بائیں سینے کے نیچے اور لطیفۂ روح کا مقام داہنے سینے کے نیچے لطیفۂ قلب کے برابر میں ہے، اور لطیفۂ سر کا مقام دو انگلی کے بقدر بائیں سینے کے اوپر مائل بہ اوسط سینہ ہے اور لطیفۂ خفی کا مقام دو انگلی کے بقدر داہنے سینے کے اوپر مائل بوسطہ سینہ ہے، اور لطیفۂ اخفیٰ کا مقام سینے کے درمیان میں ہے اور لطیفۂ نفس کا مقام پیشانی کے آغاز میں ہے جو دوسروں کے نزدیک لطیفۂ خفی کا مقام ہے۔

### لطائف کو ذاکر بنانا:

سب سے پہلے چاہیے کہ لطائف مذکورہ کو ذکر کے ساتھ جاری کریں اور انھیں ذاکر بنائیں، اس کا طریقہ یہ ہے کہ طالب باادب اور باوضو ہو کر خشوع وخضوع اور انتہائی عاجزی کے ساتھ اپنے مرشد کے سامنے بیٹھے اور خاموش رہے، پوری دل جمعی اور خیالات سے دور ہو کر زبان اور تمام اعضاء کو قطعاً حرکت سے روک کر دل سے اسم مبارک یعنی لفظ ''اللہ'' کو کہے۔

اور مرشد کو چاہیے کہ پورے خشوع وخضوع کے ساتھ طالب کی تلقین کی طرف متوجہ ہو

اور اپنے لطائف میں ذکر کر کے درست نیت کے ساتھ اس کا القا طالب کے لطائف میں کرے، اور جب لطائف ششگانہ کا ذکر معلوم ہو جائے تو سلطان الذکر کے حصول کے لیے لطیفۂ نفس پر خوب توجہ کرے، لطیفۂ نفس پر خوب توجہ دینے سے سلطان الذکر حاصل ہو جاتا ہے۔

## نفی و اثبات کے ذکر سے اپنی نفی کرنا:

لطائف کے ذاکر ہونے اور سلطان الذکر کے حصول کے بعد اس شرط کے ساتھ کہ غفلت پاس نہ پھٹکنے پائے "لَا إِلٰـهَ إِلَّا اللّٰهُ" کے ذکر کو جو کہ نفی و اثبات ہے، عمل میں لائے اور اس ذکر سے مقصود اپنے بدن کی نفی ہے لیکن جب تمام عالم کی نفی اس سے زیادہ آسان ہے اور وہ بدن کی نفی میں دخل بھی رکھتا ہے تو ضرور پورے عالم کی نفی کو اپنے خیال میں جمانا چاہیے اور اس کے بعد "لَا إِلٰـهَ إِلَّا اللّٰهُ" کے ذکر سے اپنے بدن کی نفی کی طرف متوجہ ہونا چاہیے، اس کا طریقہ یہ ہے کہ لفظ "لَا" کو ناف سے کھینچ کر دماغ تک لے جائے، اور اپنی نفی ان جگہوں سے جہاں سے "لَا" کی گذر ہو، خیال کرے اور لفظ "إِلٰـــــه" کو لطیفۂ روح میں پہنچا کر "إِلَّا اللّٰه" کی ضرب قلب میں لگائے، اور لطیفۂ روح کے مقام اور بدن کی اس جانب کے تمام حصے کی لفظ "إِلٰه" کے ساتھ نفی کرے اور لفظ "إِلَّا اللّٰه" کے ساتھ لطیفۂ قلب کے مقام اور بدن کے بقیہ تمام اجزا کی نفی کر کے اللہ تعالیٰ کی ذات کے اثبات کا دھیان کرے، اور اس ذکر اور نفی دونوں کو خیالی قوت سے عمل میں لائے اور زبان سے بالکل تلفظ نہ کرے۔ اور قوت خیالہ میں نفی کے تصور کے ساتھ اس ذکر کی مشق و تکرار سے ان شاء اللہ اس کے بدن کی نفی اس طرح مضبوط و پختہ ہو جائے گی کہ اپنے تمام وجود کی نفی بلکہ تمام عالم کی نفی قوت خیالیہ میں ہمیشہ قائم و برقرار رہے گی۔

## دائروں کا مراقبہ:

جس وقت نفی کا شغل طالب کے خیال کی تہ میں جم جاتا ہے، درویشی کے معاملات ظاہر ہونے لگتے ہیں، خصوصاً دوائر کا انکشاف کہ ان کا انکشاف شغل نفی کے بغیر کماحقہ متصور

نہیں، اور جس قدر نفی زیادہ ہوگی اسی قدر انکشاف زیادہ ہوگا، لہٰذا مراقباتِ دوائر سے پہلے نفی کی تکمیل وترقی میں کوشش کرے اور بدن کو مطلقاً نہ پانا کمال نفی ہے اور نفی کے کمال میں بجز اس چیز کے جو دوائر کے انوار کو معلوم کرتی ہے اور کوئی چیز باقی نہیں رہتی۔

اس کے بعد نفی النفی اور فناء الفناء کا مرحلہ پیش آئے گا اور وہ مدرک چیز بھی باقی نہیں رہے گی اور محض غفلت طاری رہے گی اور مراقبات دوائر کے ساتھ مزید نفی میں کوشش کرتا رہے اور جس وقت نفس محبت کے انتہائی کمال کو پہنچے گا اسے نفی النفی اور فناء الفنا حاصل ہوگا۔

اگرچہ نفی اور نفی النفی کا شغل اس طریقہ کے بزرگوں کے کلام میں صریح طور پر مذکور نہیں ہے لیکن دوائر کے انکشاف، معاملات کے ظہور اور انوار کے رسوخ کے لیے اس شغل کا ہونا ضروری ہے، اور رہی بات ان جیسے اشغال کے بارے میں ان اکابرین کا صراحت نہ کرنا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ صرف ان بزرگوں کی قوت تاثیر سے مریدوں پر نفی اور نفی النفی طاری ہو جاتی تھی، لہٰذا ان کی توجہ نے ان جیسے اشغال سے بے نیاز کر دیا تھا، لیکن نفی کے حاصل ہوئے بغیر خواہ وہ نفی صرف شیخ کی تاثیر سے حاصل ہو خواہ اپنی محنت سے حاصل ہو، دائروں کا انکشاف اور انوار کا رسوخ بہت مشکل معلوم ہوتا ہے۔ واللہ اعلم بحقیقۃ الحال۔

# مقصد

## اس طریقت کے اکابرین کے الفاظ مستعملہ کی تفسیر

**مراقبۂ احدیت:**

شغل ودوائر کا آغاز مراقبۂ احدیت سے ہوتا ہے، اس کا طریقہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مقدس ذات کی وحدانیت کا جو کہ تمام صفات کمال سے متصف ہے، دھیان کرے اور اس دھیان کو قلب سے نکال کر اوپر کی طرف رخ کر کے عرش مجید سے بھی اوپر کو لے جائے، تا کہ

اس کا اثر ظاہر ہو جائے اور اس کا اثر دل کی اوپری جانب سے ایک ایسے نور کا ظہور ہے جو نورانی ستون کے مانند لمبا ہو کر عرش مجید تک پہنچ جاتا ہے اور اس نورانی ستون کی شعاع تمام جہان کو گھیر لیتی ہے۔ بس اس نور کا جوہر وہی نورانی ستون ہے جس کی جڑ دل کی اوپری جانب میں ہے اور اس کا سرا عرش مجید تک پہنچا ہوا ہے اور اس کی شعاعیں آفاق عالم میں پھیلی ہوئی ہیں اور اس نور کا ظہور دائرۂ امکان کا آغاز ہے اور اس نور کا عرش مجید تک پہنچنا نصف دائرہ کے حاصل ہونے کی علامت ہے اور اس سے آگے بڑھنا اس دائرے کی تکمیل کی نشانی ہے۔

اور صرف لمبے نور کا ظہور دائرۂ امکان نہیں ہے، کیوں کہ ایسی وسعت و کشادگی جس کا مبدأ اور منتہی مقرر و متعین نہ ہو، وہی دائرہ کی حقیقت ہے، لہٰذا دائرہ نہیں ہوگا مگر اس وقت جب کہ نور کی کرنیں ہر طرف سے پھیل کر پورے عالم کو گھیر کر عالم امکان سے تجاوز کر جائے اور اس کی کوئی حد اور اندازہ نہ ہو۔ اور اس دائرہ کو اس وجہ سے کہ عالم امکان کو گھیر لیتا ہے، دائرۂ امکان کہتے ہیں اور سیر قلبی کے دوائر میں سے یہ پہلا دائرہ ہے۔

ولایت قلبی:

دوسرا دائرہ ولایت قلبی ہے جس کو ولایت صغریٰ کہتے ہیں، اس دائرہ میں اقربیت کا مراقبہ ہوتا ہے اور اس دائرے میں دل کے نچلے حصّے میں بھی کشادگی ہوتی ہے اور تمام قلب آفتاب کے مانند ہو جاتا ہے کہ اس کی ہر جگہ اور ہر جانب سے روشنیاں چمکتی ہیں اور انوار ہر سمت سے ظاہر ہوتے ہیں وہ دائرۂ اوّل کے مانند موجودات ممکنہ سے متجاوز ہو کر لامکاں کی حد میں پہنچ کر غیر متناہی ہو جاتے ہیں، اور دل کی اصل باقی رہتی ہے، ایسا نہیں کہ دل نیست و نابود ہو جاتا ہے اور صرف انوار باقی رہتے ہیں مگر شاذ و نادر، بلکہ دل تمام سمتوں سے انوار کا مصدر و منبع ہوتا ہے۔

اس دائرہ میں اور سابقہ دائرہ میں فرق دو وجہ سے ہے، پہلی وجہ یہ کہ سابقہ دائرے میں نور کا منبع صرف دل کا اوپری حصّہ ہے اور اس دائرے میں پورا دل ہے، دوسرا یہ کہ سابقہ دائرے

میں پھیلا ہوا نور دل کے اوپر والے حصّے سے لمبے نور کی شعاع ہے، اصل اسی قدر ہے جو دل سے ستون کے مانند اوپر کو گیا ہوا ہے اور بقیہ تمام دائرے سورج کی شعاع کے طور پر اسی ستون سے پیدا ہوئے ہیں، اور اس دائرہ میں اس دائرہ کا پورا کا پورا اصلی نور ہے جو دل سے نکل کر پوری دنیا پر محیط ہو گیا ہے، بلکہ عالم امکان سے بھی متجاوز ہو گیا ہے، اور اس دائرہ میں کبھی کبھی توحید کا راز واضح ہو جاتا ہے یعنی پھیلا ہوا وجود جس کے ساتھ تمام ممکنات کا قیام ہے اسے اس طرح محسوس ہونے لگتا ہے کہ وہ تمام ممکنات کے وجود کو ایک ہی جاننے لگتا ہے اور کثرت کی وجہ سے جو امتیازات ہیں وہ اس کی نظر میں معدوم ہو جاتے ہیں اور اس کی نگاہ بصیرت صرف اسی پھیلے ہوئے وجود پر پڑتی ہے اور اس وقت دل بالکل فنا ہو جاتا ہے اور صرف نور باقی رہتا ہے۔

ولایت کبری:

تیسرا دائرہ ولایت کبریٰ ہے، یہ ولایت تین دائرے اور ایک قوس پر مشتمل ہے، دائرۂ اولیٰ میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ذات پاک کی معیت کا مراقبہ کرے اور مراقبہ اس طرح سے شروع کرے کہ اس کی ذاتِ پاک کو باوجود بے نظیر و بے مثل ہونے اور مکان و جہت سے پاک ہونے کے اپنے نزدیک اور اپنے ساتھ جانے اور خود کو اس سے دور اور غائب نہ سمجھے بلکہ اپنے کاموں میں شریک وشامل تصور کرے، معیت کے واسطے اقربیت ضروری ہے اور اقربیت کے واسطے معیت لازم نہیں ہے، کیوں کہ معیت کے واسطے قرب کے وجود کے ساتھ اعانت و مدد بھی ضروری ہے۔ جب تک کوئی شخص دوسرے کا معین و مددگار نہ ہو اس کو اس کے ساتھ معیت حاصل نہیں ہوئی اگر چہ وہ اقرب ہی ہو۔

یہاں سے معلوم ہوا کہ سیر وسلوک میں اقربیت معیت پر مقدم ہے اور جس نے معیت کو اقربیت پر مقدم کیا ہے تو اس نے قرب ومعیت کے ظاہر معنی کو متحد یا متقارب سمجھ کر اقربیت کی زیادتی کے لحاظ سے اس ترتیب کو اختیار کیا ہے، لیکن سلوک میں فی الحقیقت اقربیت معیت سے پہلے آتی ہے، لہٰذا اقربیت کا مراقبہ پہلے کرنا چاہیے۔ اور معیت کا معنی

صرف نزدیک اور ہم راہ ہونا نہیں ہے، بلکہ اس لفظ سے اعانت، امداد، کاموں میں شمولیت اور ایک رنگ میں رنگ جانا مفہوم لیا جاتا ہے اور اس کا مطلب ایسے ہی ہے جیسے فارسی میں لفظ ہم راہی اور اُردو میں لفظ ساتھی کا مطلب سمجھا جاتا ہے اور کلام مجید کی آیتیں اس معنی پر شاہد عدل کے طور پر کافی ہیں، اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصَّابِرِیْنَ (۱۷۶)، اِنَّ مَعِیَ رَبِّیْ سَیَهْدِیْنَ (۱۷۷)، اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا."(۱۷۸)

**معیت اور اقربیت:**

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ہمارے پیغمبر حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے استمداد و استعانت کی جگہ میں لفظ ''مع'' کا استعمال کیا ہے، لہٰذا واضح ہوا کہ معیت میں اعانت ضروری ہے اور اقربیت بغیر اعانت کے بھی ثابت ہوجاتی ہے، اس بنا پر مراقبۂ اقربیت مراقبۂ معیت سے پہلے ہونا چاہیے، ہر حال میں اسی طریقے پر مراقبہ کرتے ہوئے اس مرتبے تک پہنچ جائے کہ اللہ ربّ العزت کی معیت کا دھیان طالب کے ذہن و دماغ میں راسخ ہوجائے، اور اس کے کمالِ رسوخ کی علامت یہ ہے کہ تنہائی میں بھی خود کو تنہا نہ جانے، مثلاً اگر فرض کیا جائے کہ تنہائی میں اسے کوئی گناہ پیش آئے تو جس طرح سے وہ لوگوں کی موجودگی کی وجہ سے اس قدر شرمندہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے گناہ کی طاقت نہیں پاتا ہے اور اس کے اعضا و جوارح خود بخود اس معصیت کی طرف حرکت کرنے سے باز رہتے ہیں اور سست پڑ جاتے ہیں، اسی طرح سے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے قرب و معیت کے دھیان کا اثر ظاہر ہوتا ہے، اور وہ رکاوٹ جو گناہ کے ارادے میں دوسرے کی موجودگی کی وجہ سے پیش آتی ہے، وہ رکاوٹ اس دوسرے کے حسبِ حال کمال و نقصان میں متفاوت ہوتی ہے، مثلاً ایک بازاری اجنبی شخص آجائے اور انسان گناہ کے ارتکاب سے باز آجائے یا یہ کہ والد، استاد، یا واجب الاحترام مرشد یا ذو اقتدار عدالت شعار اور انتقام لینے والا بادشاہ سامنے آجائے اور ان کی وجہ سے رکاوٹ پیش آجائے تو ہر شخص جانتا ہے کہ پہلی رکاوٹ میں اور

دوسری رکاوٹ میں کس قدر فرق ہوگا، بلکہ باپ سے رکاوٹ الگ طرح کی ہوگی اور استاذ سے رکاوٹ الگ انداز کی ہوگی وعلیٰ ھذا القیاس۔

پس اللہ تبارک وتعالیٰ جو وجوہِ عنایات وکمالات کا جامع ہے اور وہ اوصاف جو مخلوقات میں ہیں ان اوصاف کا اس کے اوصاف سے بالکل کوئی جوڑ ہی نہیں، اگر وہ باپ کی شفقتوں سے شرمندہ ہوتا ہے تو حق تعالیٰ کے الطاف وعنایات کی کوئی حد ہی نہیں اور اگر استاد یا مرشد کی تعظیم گناہ سے روکتی ہے تو اللہ ربّ العزت کی تعظیم کا قیاس کرنا چاہیے کہ اس کی تعظیم کس قدر ہونی چاہیے اور اگر بادشاہ کی ہیبت گناہ کرنے سے مانع ہوتی ہے تو مطلق، انصاف پرور، حقیقی بادشاہ کی ہیبت کو سمجھ سکتے ہیں کہ اس ظاہری بادشاہ سے اس کو کیا نسبت؟ وعلی ھذا القیاس۔

### ولایت کبریٰ کی علامت:

اگر وہ جنگل وبیاں میں ہو تو خود کو تنہا نہ جانے اور اگر طاعت کی خلوت میں ہو تو اپنے محبوب ومقصود کو اپنی آنکھوں کے سامنے بلکہ تمام چیزوں سے زیادہ قریب پائے، اس قدر قریب یقین کرے کہ سراسر انسیت والفت اسے محسوس ہو اور اس پر وحشت وبے گانگی کا کوئی اثر نہ ہو، جب یہ آثار مترتب ہو جائیں تو معیت کے حصول پر خدا کا شکر ادا کرنے والا ہو اور یہ معیت اسی وقت ولایت کبریٰ کی علامت ہوگی جب اس دائرے کا نور بیان کردہ دونوں دائروں کے انوار کے مانند صفائی وچمک میں پہلے سے بدر جہا زیادہ ہو، اور حقیقت یہ ہے کہ مختلف رنگ کے انوار ذاتِ پاک کے حجب ہیں، جن کا طے کرنا ضروری ہے، بس کمالِ شغل، دوائر کے تفاوت اور بارگاہِ الٰہی میں طالبین کے قرب وعزت کے اختلاف کے مطابق وہ حجابات طے ہوتے ہیں، کسی دائرے میں کم اور کسی دائرے میں زیادہ تا کہ وہ ذاتِ خالص کا ادراک حاصل کر سکے۔ اور محبت وغیرہ دوسرے دوائر کے ساتھ سابقہ دائرے کے آثار کا ظہور اقربیت کے دھیان کے مانند جس کے آثار سابق بیان کے مطابق واضح ہوں، اس دائرے کی تکمیل نہیں ہے اگرچہ اس کا حصول ظنی، انتہائی عجیب اور دل چسپ ہے۔

### نور کا انکشاف اور قرب ومعیت:

جہاں تک ولایت کی بات ہے جو سلوک سے مقصود ہے تو وہ انوار ودوائر کے انکشاف کے بغیر حاصل نہیں ہوتی ہے اور حقیقت دائرہ اپنے کمال کو نہیں پہنچتی ہے، پس تکمیل دوائر دو چیزوں سے وابستہ ہے، اوّل انوار کے انکشاف ودریافت اور دوسرا قرب ومعیت اور محبت وغیرہ کے آثار کا حاصل ہونا۔ ہر صاحبِ دائرہ اپنی عزت وکوشش کے موافق کامیاب ہوسکتا ہے لیکن صاحب دائرۂ سفلیٰ صاحب دائرۂ علیا کے طریقے پر اپنے مقصود پر فائز نہیں ہوسکتا ہے، مثلاً اگرچہ صاحب دائرۂ قلبی کسی مقصد تک رسائی حاصل کرلے، لیکن جس شان سے صاحب دائرۂ محبت کامیاب ہوتا ہے اس شان سے صاحب دائرۂ قلبی نہیں ہوسکتا ہے۔

اس کے لیے "یحبّھم ویحبّونہٗ" (۱۷۹) کا مراقبہ ہے یعنی اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ذات سے اپنی محبت اور اپنی ذات سے اس کی محبت کا مراقبہ کرے، اس مقام میں دو دائرے اور ایک قوس یعنی نصف دائرہ ہے۔

### محبت کے تین درجے:

اس کی تفصیل یہ ہے کہ محبت کے تین درجے ہیں، پہلا درجہ ابتدائے محبت ہے جس طرح سے انسانوں کے درمیان محبت ودوستی کی شروعات ہوتی ہے اور ابتدائے محبت میں محبت کرنے والا اپنا نفع وفائدہ اور محبوب کی رضا وخوشنودی دونوں کا خیال کرتا ہے اور اپنا اور محبوب دونوں کا خیال ہاتھ سے جانے نہیں دیتا، یہ صورت پہلے دائرہ کی ہے اور جب محبت نے ترقی کی اور محبت کی ایک جانب کو نابودی لاحق ہوئی اور وہ فنا ہونے لگی تو تو پہلا دائرہ ختم ہوگیا اور دوسرا دائرہ شروع ہوا، اس دائرے میں حق تعالیٰ کی جانب کو اپنی جانب پر بلکہ تمام مخلوقات کی جانب پر ترجیح حاصل ہوگی، لیکن اس ترجیح سے عقلی وعلمی ترجیح مراد نہیں ہے جو نفع ونقصان کا موازنہ کرکے اور سمجھ کر ترجیح دے بلکہ یہاں پر ایسی ترجیح مراد ہے جو اس کے تہِ دل سے فوّارے کی طرح جوش مارے، اور جب نیستی ونابودی اپنے کمال کو پہنچ گئی اور

محبّ کی طرف سے کوئی نشانی باقی نہیں رہی تو سمجھ لو کہ دوسرا دائرہ پورا ہوگیا اور قوس کا آغاز ہوگیا، اور اس کا نام قوس اس وجہ سے ہے کہ اس مقام میں نصف ثانی یعنی محبّ کی جانب بالکل نہیں ہے، جب تک قوس کی ابتدا ہے محبّ کی جانب کی فنائیت و نابودی کا خیال نسیاً منسیاً ہوجائے گا پھر قوس محبت پوری ہوجائے گی، اس مقام میں فناء الفنا کا مقام حاصل ہوتا ہے۔

مراقبہ اسم ''الظاہر''

اس کے بعد اسم ''الظاہر'' کا مراقبہ ہے، اس کا بیان یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے دو نامِ پاک ہیں: ظاہر اور باطن اور ان دونوں کے بے شمار مظاہر ہیں، اور اس کی پاک ذات میں ان دونوں ناموں کے مصداق موجود ہیں، جس قدر معرفت گہری ہوگی اسی قدر مظاہر کی شناخت زیادہ ہوگی اور اس کی پاک ذات میں مصداقوں کا امتیاز بہتر و کامل تر ہوگا۔

اسم ظاہر کے مظاہر تمام جہان، اجسام، افعال اور احکام ہیں جو تشریع و تکوین میں ظاہر ہوتے ہیں، اور وہ کارخانے جو اس کی رزّاقیت سے متعلق ہیں وہ اس کے مظاہر میں سے ایک مظہر ہیں، اسی طرح سے وہ کارخانے جو شانِ ہدایت سے تعلق رکھتے ہیں جیسے، کتابیں نازل کرنا اور انبیا و مرسلین کی بعثت سے لے کر کلمۂ طیبہ کی توفیق تک جو ہر مسلمان سے صادر ہوتے ہیں، دوسرا مظہر ہے۔

اسی طرح سے گم راہ کرنے کا مظہر ہے جو ابلیس کی پیدایش سے لے کر ناچ گانے تک ہے، ایسے ہی دو مظہر اور ہیں جو ذکر کردہ دونوں مظہروں پر مترتب ہیں یعنی ثواب وعقاب، اس کا مطلب جنت، دوزخ، قبر اور جان نکلنے کے حالات، آگ، راحت اور خوف ودہشت ہیں جو کہ نیک و بد کو خواب میں نظر آتے ہیں۔

غرض اسم ظاہر کے مظاہر کا ملاحظہ کرکے اس اسم مبارک کے مسمّٰی کا جو کہ اس کی پاک ذات ہے، ملاحظہ و مراقبہ کرے اور وہ یہ نہ سمجھے کہ ایسا دھیان ممکن نہیں ہے، بلکہ اجمالی طور پر نہایت سہل اور آسان ہے اور جب نگاہ بصیرت زیادہ تیز ہوجاتی ہے، تو اس تیزی کے

بقدر تفصیلی ملاحظہ آسان ہوتا ہے، اسی باریکی کے پیش نظر اس مضمون "سبحان الله عدد خلقه، سبحان الله زنة عرشه، سبحان الله مداد كلماته" (۱۸۰) کے ساتھ عارف کی تسبیح غیر عارف کی ہزار ہا مرتبہ تسبیح کہنے کے برابر، بلکہ اس سے بہت زیادہ ہو جاتی ہے۔

اس کی تفصیل اس طرح پر ہے کہ جب الفاظ مذکورہ کے ساتھ تسبیح کرنے والا وسیع المعرفت عارف ہوتا ہے اور اس کا دھیان تمام خلقت کو گھیرے ہوتا ہے تو وہ اپنے دھیان کے موافق مستحق ثواب ہوتا ہے، بہ خلاف غیر عارف کے دھیان کے کہ اس کو کچھ وسعت نہیں۔

خلاصۂ کلام یہ کہ اس مراقبہ کی خوب مشق کرے اور جب اس مراقبہ کے فیوض کے موارد جو کہ بالذات لطیفۂ نفس اور بالتبع بقیہ تمام لطائف ہیں، اس کے فیوض سے مستفیض ہوں گے تو اس مراقبے کے آثار ظاہر ہوں گے، اور اس کے منجملہ آثار میں فنائے نفس بھی ہے یعنی اس کا اپنی دانست اور اپنی طرف افعال کی نسبت سے بے خبر ہونا، اور اخلاق کا درست ہونا بھی ہے جو کہ بدعادتوں کی نیک عادتوں سے تبدیلی سے عبارت ہے۔

لطیفۂ نفس کو اصل قرار دینے کی وجہ:

اس مراقبے کے فیوض و برکات کے ورود میں لطیفۂ نفس کو اصل قرار دینے کی وجہ یہ ہے کہ عقل اسم ظاہر کے مظاہر کا ادراک کر سکتی ہے، بخلاف اسم باطن کے مظاہر کے، کہ اس کے ادراک کا بغیر کشف والہام کے کوئی راستہ نہیں، اور چوں کہ لطیفۂ نفس کا مقام سر ہے جو کہ عقل وشعور کا محل ہے، اس لیے اس لطیفہ کو اسم ظاہر کے مراقبہ کے فیوض کے ساتھ زیادہ خصوصیت حاصل ہوگئی ہے۔ اور ان آثار کی ترتیب کا سبب یہ ہے کہ اس مراقبہ کی وجہ سے تمام حرکات وسکنات اور اسباب ومسببات کا اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات سے صادر ہونا اس طرح سے ذہن میں بیٹھ جائے گا کہ ذراسی بھی غفلت ہرگز اس کے پاس نہیں آئے گی اور امید وبیم اور محبت وخشیت صرف اسی ذاتِ پاک کے ساتھ وابستہ ہوگی اور سالک کی نظر میں غیر کا کچھ بھی اعتبار باقی نہیں رہے گا اور اس کے نزدیک غیر کی حیثیت ایسی ہو جائے گی

جیسے کاتب کے ہاتھ میں قلم کی ہوتی ہے۔ لہٰذا عالی ہمت شریف النفس کے لیے صرف اس ذاتِ پاک کی محبت والفت کی وجہ سے جو اس قدر کمالات کے ظہور کا سبب ہے، آثار مذکورہ پورے کے پورے مرتب ہوں گے، اور جو شخص بلند ہمتی وشرافت نفس میں کم درجے کا ہو وہ محبت وخوف کے سبب سے بعض آثار سے بہرہ ور ہوگا اور بمقتضائے ''وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى'' (۱۸۱) ہر ایک اپنا مقصد حاصل کرنے میں کامیاب ہوگا۔

اور یہ دائرہ بھی اسی وقت پورا ہوگا جب کہ اس کے آثار کے ساتھ ساتھ انوار میں بھی جیسا کہ چاہیے ترقیات ظاہر ہوں جیسا کہ پہلے مفصل طور پر گزرا اور اگر یہ دائرہ، محبت کے دائروں پر مقدم ہوتا تو بہتر ہوتا، کیوں کہ یہ دائرہ دوائر محبت کو بہت مدد فراہم کرتا ہے، لہٰذا احسن ترتیب کا تقاضا یہ ہے کہ یہ دائرہ دائرۂ محبت سے پہلے ہو۔

اسم ''الباطن'' کی سیر:

اس کے بعد اسم ''الباطن'' کی سیر کرنی چاہیے، اس کا بیان یہ ہے کہ ان ہی ظاہری چیزوں کے باطن ہیں جو اللہ تعالیٰ کے نام ''باطن'' سے فیض حاصل کرتے ہیں، اور اس کی مثال انتظام حکومت ہے جو کہ بالکل ظاہر ہے اور اس کا باطن بادشاہ کی عقل وتدبیر ہے، لہٰذا چاہیے کہ اپنی سمجھ کے مطابق بطون کے مظاہر کو معلوم کر کے اسم باطن کے مسمّٰی کا ان مظاہر میں اس کی سرایت کے اعتبار سے مراقبہ کرے، اور اس ولایت کو ولایت علیا کہتے ہیں۔ اس لیے کہ یہ ملأ اعلیٰ کی ولایت ہے اور ملأ اعلیٰ سے مراد معاملات کی تدبیر کرنے والے اور احکامِ الٰہیہ کے اخذ کرنے والے ملائکہ ہیں، جو بھی حکم نافذ ہوتا ہے اوّلاً وہ انھیں اخذ کرتے ہیں پھر وہ دنیا میں ظاہر ہوتا ہے، اور وہ تمام عالم اجسام کے اور ان روحوں کے جو مدبر اجسام ہیں، باطن ہیں، لہٰذا ان کا اسم ''الباطن'' سے گہرا تعلق ہوتا ہے۔

اس مراقبے کا فیض اجزائے جسم انسانی میں سے آگ، پانی اور ہوا کو پہنچتا ہے، کیوں کہ یہ تینوں عناصر جسد انسانی میں باطن ہیں اور مٹی اس میں ظاہر ہے، اس وجہ سے اس

کے فیض کا مورد یہ تینوں عناصر ہیں، اور اس کا اثر صدورِ آثار میں ان تینوں کا بدلنا ہے، کیوں کہ آگ اپنی حقیقت سے نہیں بدلتی ہے بلکہ اپنی طبیعت کے مقتضیٰ پر رہتی ہے، اور رہی بات اس کے طبعی تقاضے کی، تو وہ حق تعالیٰ کی خوشنودی کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے، مثلاً آگ کا مقتضیٰ غلبہ و بلندی ہے جو انسان میں غرور و تکبر پیدا کرتا ہے اور کبھی کبھی دعوائے خدائی تک پہنچا دیتا ہے، اور ابلیس کے لیے آگ کا مقتضا لعنت کا باعث ہوا اور اس کو عمیم الرحمت خدا کی بارگاہ سے بالکل ناامید کر دیا اور جب وہ (آگ) اس مراقبہ کے فیض سے مستفیض ہوگی تو احکامِ الٰہی کی فرماں برداری کے تعلق سے بلند عزائم اور اس کی طرف دوڑنے اور سبقت کرنے کی کوشش اس میں پیدا ہوگی۔

اور ہوا کا مقتضا اخلاق انسانی میں حرص وخواہش ہے اور اس کا تبدل یہ ہے کہ حرص وخواہش مرضیاتِ الٰہی میں مصروف ہو جائے اور دنیوی زیب وزینت سے دور ہو جائے۔

اور انسان میں پانی کا اثر سستی، افتادگی اور پستی ہے اور اس کی اصلاح معاصی سے سستی، بارگاہِ خداوندی میں بے بسی اور اللہ ربّ العزت کی عظمت کے سامنے عاجزی ہے، اور اس سیر میں اسم ''الباطن'' کی تجلیات نظر آتی ہیں اور یہ سیر بھی اپنے آثار کے ظہور کے باوجود اسی وقت مکمل ہوگی جب اس سیر کے موافق نورانی حجابات طے کیے جائیں۔

### ذاتی دائمی تجلی کی سیر:

اس کے بعد ذاتی دائمی تجلی کی سیر ہے اور ذاتی تجلی کا معنی ظاہر ہے یعنی ایسی تجلی جس کا منشا نفس ذات ہے اور دائمی سے مراد ایسی تجلی ہے جو زمین وآسمان کے مانند قائم وثابت قدم ہو، اگرچہ اس تجلی کی ثابت قدمی واستقراء میں بے شمار تفاوت ہے، لیکن دائمی سے ظاہری معنی کے علاوہ دوسری چیز مراد نہیں ہے اور انبیاء ومرسلین اور انبیائے اولوالعزم کے کمالات کا ظاہر ہونا اسی تجلی سے ہے، پس اس سیر کے تین درجے ہیں:

**اوّل:** اس لحاظ سے کہ یہ انبیاء علیہم الصلاۃ والسلام کے کمالات کا منشا ہے یعنی اس

طرح پر علوم ہدایت کا ظاہر ہونا کہ ان میں کسی بھی طرح سے غلطی کا امکان نہ ہو، یہ بات انبیائے علیہم السلام میں مستقل طور پر پائی جاتی ہے اور خواب کی حالت میں بھی ان کا وجود فیوض ہدایت کا سرچشمہ ہوتا ہے اور مخلوق کو ان سے فائدہ پہنچتا ہے اگرچہ انھیں خبر نہ ہو، لہٰذا ان کا وجود چراغ کے مانند ہے جس کی روشنی سے فائدہ حاصل کیا جاتا ہے مگر چراغ کو خبر نہیں ہوتی۔

لہٰذا انبیاء علیہم السلام ہمیشہ اپنے کام میں مشغول ہیں، اس واسطے ان کے فیوض تجلی ذاتی دائمی سے تعلق رکھتے ہیں، بہ خلاف فرشتوں کے جو کہ ہمیشہ ایک کام میں مستغرق نہیں ہوتے ہیں، بلکہ حکم وفرمان آنے کے وقت کوئی کام کرتے ہیں پھر رک جاتے ہیں اور منتظر و مستعد رہتے ہیں، اس لیے ملائکہ کے کمالات کا منشا تجلی ذاتی دائمی نہیں ہوتا ہے۔ اور یہ ایسے انوار وتجلیات ہیں جس میں پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کے ثمرات حاصل ہوتے ہیں اور اس سیر کا فیض دو وجہ سے مٹی کو حاصل ہوتا ہے، اوّل یہ کہ استقرار وثابت قدمی مٹی کی خاصیت ہے اس لیے یہ اس سیر کے مناسب ہے۔ دوم یہ کہ بیان کردہ تجلی میں ظہور کا معنیٰ ہے۔ لہٰذا ایک طرح سے کہا جاسکتا ہے کہ سارا جہان تجلی ذاتی دائمی ہے اور عالم کا ظہور ظاہر ہے اور عالم کے ظہور سے اس تجلی کا ظہور سمجھ لینا چاہیے۔ اور عنصر خاک بھی انسان کے اندر نمایاں ہے اور عنصر خاک میں اس سیر کے فیض کے ظہور کا اثر انسان کے اندر تواضع وفروتنی کا پیدا ہونا ہے، اور اس کا مطلب اپنے مالک کے سامنے عاجزی اور تواضع کرنا، اور اس کے احکام قبول کرنے سے انکار نہ کرنا ہے اگرچہ امتثالِ اوامر میں اپنے بدخواہوں پر ایک طرح کی تعلّی ثابت ہوتی ہے۔

اور تسفل جو آگ کی وجہ سے ہے وہ اس تواضع کے علاوہ ہے کیوں کہ تسفل میں مطلقاً اپنی پستی ہے اور تواضع کا معنیٰ دوسرے کے روبرو اور سامنا ہونے کے وقت عاجزی وانکساری اختیار کرنے کے ہیں، لہٰذا تواضع ایک امر جدید ہے جو ہر وقت پیش آتا رہتا ہے، بخلاف تسفل کے کیوں کہ تسفل ایک ایسا امر ہے جو اپنے صاحب سے کبھی جدا نہیں ہوتا اور

جیسا کہ پیچھے بیان ہوا ان کے آثار کے ظہور کا امتیاز کرنا چاہیے۔ اس لیے کہ کبھی کبھی عقلمند انسان نفسانی صفات میں سے کسی صفت کے تصور کو اس کا حصول سمجھ بیٹھتا ہے، اور وہ گفتگو جو ایک فلسفی حکیم اور عارف کامل کے درمیان ہوئی اس امر کی وضاحت کے لیے کافی وشافی ہے۔ منقول ہے کہ ایک دانا حکیم اور ایک کامل عارف کے درمیان ملاقات ہوئی اور ملاقات کے بعد کسی شخص نے حکیم کی غیر موجودگی میں عارف سے اس حکیم کے احوال کو پوچھا، عارف نے جواب دیا کہ وہ اخلاق مند نہیں ہے، یہ بات لوگوں نے حکیم تک پہنچائی تو حکیم نے اخلاق کی وضاحت میں ایک عمدہ اور بہترین کتاب تالیف کر کے عارف کی خدمت میں بھیج دی، عارف نے کہا کہ میں نے یہ کہا ہے کہ وہ اخلاق نہیں رکھتا ہے، یہ نہیں کہا ہے کہ وہ اخلاق نہیں جانتا، لہٰذا اس کا جاننا الگ ہے اور اس کا حاصل کرنا الگ ہے۔ کبھی عبادت کی وجہ سے اور کبھی نفسانی بہکاوے اور شیطانی مکر وفریب کی وجہ سے کمالات کا تصور اس کے حصول میں مشتبہ ہو جاتا ہے اور انسان جہل مرکب کی لاعلاج بیماری کا شکار ہو جاتا ہے اور یہ بذاتِ خود صریح محرومی کی نشانی ہے اور حصول وہی معتبر ہے جو دل کی گہرائی سے جوش مارے نہ کہ زبردستی خود پر اسے روکا جائے اور اس سیر کی تکمیل کے لیے انوار کی تبدیلی بھی ضروری ہے جیسا کہ کئی دفعہ ذکر کیا گیا۔

**دوم:** اور سیر تجلی کا دوسرا درجہ کمالاتِ رسالت کی بنیاد کے لحاظ سے ہے، رسولوں کے خصائص کو سمجھ کر اس بنیاد کی طرف رُخ کرے اور اسی بنیاد کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ کی ذات پاک کا مراقبہ کرے، وساطت اور سفارت کے لحاظ سے رسالت نبوت سے ممتاز ہے، رسالت کا مطلب خالق ومخلوق کے درمیان توسط وفرستادگی ہے، اور وعظ ونصیحت کرنا، دلائل وبراہین بیان کرنے میں خوب کوشش کرنا، معجزات دکھلانا اور اہل باطل سے مناظرہ ومقابلہ کرنا رسولوں کے لیے لازم ہے، انبیاء کے برخلاف کیوں کہ ان کے لیے مقابلہ کرنا ضروری نہیں ہے۔

اور رسول کی بات ان لوگوں کے حق میں جن کی طرف رسول بھیجے گئے، قبول ہوتی ہے کیوں کہ یہ منصب رسالت کا لازمی جز ہے، اور اس کی وجہ ظاہر ہے کہ جب کسی معتمد اور سچّے قاصد کو کسی قوم میں بھیجا جاتا ہے تو اس کی بات اس قوم کی فرماں برداری اور نافرمانی کے سلسلے میں مانی جاتی ہے۔

**سوم:** اور مراقبہ کا تیسرا درجہ اولوالعزم رسولوں کے کمالات کے لحاظ سے ہے، اور اولوالعزم رسولوں کا امتیاز تمام رسولوں سے کفار کو ہلاک کرنے اور مؤمنوں کی اصلاح کے باب میں ان کے مضبوط ارادے کی وجہ سے ہوسکتا ہے، لہٰذا کافروں کی ہلاکت میں اولوالعزم رسولوں کا پختہ ارادہ بھی دخل رکھتا ہے۔ بخلاف دوسرے رسولوں کے جو فقط احوال امت کا اظہار کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کا ارادۂ قہر یہ جو کافروں کی ہلاکت کی طرف متوجہ ہوتا ہے، اس کی نسبت سے اعضائے انسانی میں سے کسی عضو کے درجے میں نہیں ہوتے ہیں، بخلاف اولوالعزم رسولوں کے جو ملائکہ کے طریقے پر عضو کے مانند ہوتے ہیں اور شاید یہ عضو تین صورتوں میں متحقق ہوتا ہے:

**پہلی صورت:** یہ کہ فرشتہ اور انسان یعنی ذوالعزم رسول وساطت میں برابر ہوں۔

**دوسری صورت:** یہ کہ اصل فرشتہ ہو اور انسان تابع ہو۔

**تیسری صورت:** یہ ہے کہ معاملہ اس کے برعکس ہو یعنی انسان اصل اور ملک تابع ہو۔

اور یہ تیسری صورت ایک عظیم درجہ ہے جو جناب خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خاص ہے اور اس کا کامل ظہور بدر کے دن ہوا، اور جنگ بدر میں شریک ہونے والے صحابۂ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کو خاتم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت وصحبت کے طفیل اس خصوصیت میں سے وافر حصّہ ملا۔

رسول اور انبیاء کا فرق:

الغرض رسولوں کا فرق انبیاء سے اور الوالعزم رسولوں کا فرق دیگر رسولوں سے ان کے مخصوص خصائص کی بنا پر اس سیر کے مراقبے اور اس کے آثار کے حصول کے لیے ضروری

ہے، اور حصولِ آثار کے سلسلے میں وہ کلام جو ہر مقام کی سیر کے منتہا تک وصول کی دلیل ہو وہ یہ ہے کہ اس موقع پر تین چیزوں کا ہونا ضروری ہے:

پہلی بات انوار کا تبدل ہے جو کئی بار مذکورہ ہو چکا اور دوسری بات صفات کا تغیر ہے، اس کا بھی ذکر پہلے آچکا ہے، اور اس کی تازہ تشریح یہ ہے کہ جس صفت اور شان میں مراقبہ کیا جائے اس صفت اور شان میں سے کسی حصّے کا حاصل ہونا بھی تبدل صفات میں سے ہے۔

لہٰذا جو شخص کمالات نبوت کے لحاظ سے ذاتِ پاک کا مراقبہ کرے گا، اس کو خدا تعالیٰ نبوت کے معانی میں سے کسی معنی پر جس کا ادنیٰ سچّے خواب ہیں، ضرور فائز کر دے گا۔ اسی طرح سے درجۂ دوم میں رسالت کا معنیٰ اس پر جاری ہوگا اور غافلوں، جاہلوں اور سرکشوں کو سمجھانے بجھانے، دعوت و تعلیم اور بحث و مباحثہ کا الہام اس کو ہوگا، اور درجۂ سوم میں نافرمانوں اور سرکشوں کو ہلاک کرنے اور فرماں برداروں اور مخلصوں کو نوازنے کے سلسلے میں قوی ہمت اس کو عطا کی جائے گی۔

اور اس بات کو علی العموم جاننا چاہیے کہ وہ اسمائے الٰہی میں سے جس اسم کا مراقبہ کرے گا اس میں سے کچھ حصّہ وہ پائے گا، جو شخص اس کی رزّاقیت کا مراقبہ کرے گا اور اس مراقبہ کو انتہا تک پہنچائے گا، رزّاقیت کی کچھ شان اس میں جلوہ گر ہو جائے گی اور اس کا باعث اس کریم مطلق کا لامتناہی احسان و کرم ہے۔ مثلاً سخی اور فیاض لوگوں کی عادت یہ ہے کہ جو بھی شخص کھانا کھانے کے وقت ان کے سامنے ہوتا ہے اور للچائی ہوئی نگاہ اس پر ڈالتا ہے تو وہ ضرور اس میں سے کھلاتے ہیں، اسی مثال سے اس بات کو بھی سمجھنا چاہیے کہ جو شخص مثلاً اسم ''مُحیِ'' کا مراقبہ کرتا ہے گویا وہ اس کی شان احیاء کے سامنے کھڑا ہو تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے کرم و احسان کا تقاضا یہ ہے کہ وہ ضرور اپنی شان احیائی میں سے کچھ اسے مرحمت فرما دے۔

درجۂ سوم اللہ تعالیٰ کی ایک خاص عنایت ہے، اس کا بیان اس طرح پر ہے کہ جب برگزیدہ بندہ خدا تعالیٰ کے کسی کام کو بخوبی سرانجام دیتا ہے تو وہ دو چیزوں کا مستحق ہوتا

ہے ایک اجر اور دوسرا انعام، اجر اگرچہ بے انتہا ہو لیکن وہ مزدوری کے درجہ میں ہے اور اس کام کا معاوضہ اور اس کے مناسب ہے اور انعام خلعت فاخرہ کے قائم مقام ہے جس کا سبب مولیٰ کی رضا ہے، انسان جب اس سے سرفراز ہوتا ہے تو کما حقہ دونوں کا امتیاز کر لیتا ہے، انعام کی مثال مستجاب الدعوات ہونا یا ملأ اعلیٰ وغیرہ میں عزت پانا ہے اور وہ انعام ایسی چیز ہوتا ہے جو ہر کام میں کام آتا ہے، اور جنت میں اللہ تعالیٰ کا دیدار انعام ہے اور حور وقصور اور غلمان اجرت ہیں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَزِيَادَةٌ" (۱۸۲) صحیح روایتوں کے مطابق ''زیادۃ'' کی تفسیر رویت باری تعالیٰ ہے۔

اور اخیر کے دونوں درجوں کا فیض ہیئات وحدانی انسانی کو پہنچتا ہے اور کوئی بھی عنصر اور لطیفہ اس فیض کے ورود میں کوئی خصوصیت نہیں رکھتا ہے، اور اس کا سبب یہ ہے کہ جامعیت کے لحاظ سے رسولوں اور اولوالعزموں کے کمالات کا منشا اللہ تعالیٰ کی ذات اقدس ہے اور عمومی اجزائے انسانی اور تمام اجزائے انسانی کی اصلاح ہیئات وحدانی میں ان اصحابِ کمالات کے مقصود اصلی ہوتی ہے، اس لیے ان دونوں درجوں کے فیض کا مورد ہیئات وحدانی ہوتا ہے۔

### حقیقت کعبہ:

اس کے بعد حقیقت کعبہ کے ظہور کے لحاظ سے حق تعالیٰ کی ذات کا مراقبہ ہے اور وہ تمام مخلوق کے لیے اللہ تعالیٰ کی مسجودیت ہے، یہ بات بالکل ظاہر ہے اور حقانیت کے ساتھ اس سیر کے سائر کا معظم ومکرم ہونا اس مراقبے کا مناسب اثر ہے۔ اور اہل حق اس کی خوب تعظیم کرتے ہیں اور اس عمل کو اللہ تعالیٰ کی خوشنودی ورضا کا سبب جانتے ہیں۔

اور اسی سلسلے سے ہے جو بعض صحابۂ کرام کے دل میں خیال گزرا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سجدہ کرنا چاہیے اور حضرت آدم صلوات اللہ علیٰ نبینا وعلیہ تمام ملائکہ کے مسجود ہوئے اور ان کا قبلہ بنے اور حضرت یوسف علیہ السلام کو ان کے بڑے یعنی ان کے والدین اور بڑے بھائیوں نے سجدہ کیا۔

## مراقبہ ذات حق:

پھر اللہ ربّ العزت کی ذات کا مراقبہ حقیقت قرآنی کے ظہور کے لحاظ سے کیا جاتا ہے، اس کا منشا اس کی بے نظیر ذات کی وسعت کا آغاز ہے۔ اوّلاً بے مثل ذات پاک کی وسعت کا تصور کرنا چاہیے، اس کا طریقہ یہ ہے کہ ذات پاک کی ہمہ گیری کو ظہور افعال کے اعتبار سے یا کسی اور طرز سے ذہن نشیں کریں، رہی بات ظہور افعال کے اعتبار سے اس کی ہمہ گیری کے تصور کی تو ایسا تصور کریں کہ کائنات میں جو بھی حرکت ظاہر ہوتی ہے حقیقت میں اس کا محرک وہی ہے، لہٰذا اگر چیونٹی کا پاؤں حرکت کرتا ہے تو وہ اس کی طرف سے ہے اور اگر فلک الافلاک گردش کرتا ہے تو وہ اسی کی حرکت دینے سے گردش کرتا ہے، اور اگر ہم اس کی تحریک کے طریقے کو معلوم کرنا چاہیں تو بجز اس کے کہ ہم بے مثل و بے نظیر کہیں اور "لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَىْءٌ" کی تلاوت کریں کوئی دوسری بات ذہن میں نہیں آتی، تو جس طرح سے اس کے افعال اس قدر وسعت رکھتے ہیں کہ تمام عالم کو گھیرے ہوئے ہیں، اسی طرح سے اس کی بے نظیر ذات کی وسعت کو بھی سمجھنا چاہیے، یہ اس کی بے مثال ہمہ گیریت میں سے ایک حصّے کا بیان ہے۔

## کلامِ الٰہی کی معجز بیانی کی تین وجوہات:

اس کے ہر کلام کو بے نظیر وسعت میں ایک اثر جاننا چاہیے، کلام چوں کہ ہر چیز کو بیان کرتا ہے اس وجہ سے وہ اس قدر گنجایش رکھتا ہے کہ معدومات و موجودات سب اس میں سما سکتے ہیں اور اس وجہ سے کہ خواص محکی عنہ کا کوئی اثر اس میں نہیں پایا جاتا ہے، اس کو بے نظیر کہہ سکتے ہیں اور قرآن مجید دنیا کے حقائق پر مشتمل اور مہیمن ہونے کی وجہ سے ایسی وسعت رکھتا ہے اور اس قدر وسیع و عریض ہے کہ علم انسانی کا اس کے منتہا تک پہنچنا ناممکن ہے، اور چوں کہ ازلی حقیقت کا ظہور بے نظیر دست سے ہے، اس لیے وہ بھی بے نظیر ہے۔

**اوّلاً:** اس کی بے نظیری کی دلیل یہ ہے کہ عرب کے متداول حروف وکلمات پر مشتمل ہونے کے باوجود اس کے مثل ایک جملہ کی بھی ترکیب غیر اللہ سے نہ بن سکی۔

**ثانیاً:** اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کلام کی ترکیب میں بے نظیر ذات نے بے نظیر باتیں رکھی ہیں جن کی تہ تک ہزاروں بلغاء اور فصحا نہیں پہنچ سکتے، اور انسان جو کہ صفت کلام کا خاص مظہر ہے اور ابوالبشر (حضرت آدم علیہ السلام) اسی صفت کی وجہ سے تمام فرشتوں کے معزز ہوئے، جب وہ اس کے مثل ایک جملہ بنانے سے عاجز و بے بس ہو گیا تو غیر کو اس کے بالمقابل گونگا اور بے زبان کہا جا سکتا ہے، اور وہ ہرگز قرآن مجید کے مثل دوسرا کلام نہیں پیش کر سکتے ہیں۔

**ثالثاً:** قرآن مجید کی مبدئیت کی وجہ معلوم کرنی چاہیے، اگرچہ قرآن مجید غایات ونہایات پر مشتمل ہے لیکن بجز قرآن کے، معرفت کے آغاز کا کوئی راستہ نہیں ہے، مثلاً نوکری جو کہ تمام شاہی عہدوں جیسے بخشی گری، وزارت، صدارت اور امارت وغیرہ کی ابتدا ہے۔ پس یہی نوکری ہے جو وزارت ہوتی ہے اور یہی نوکری خدمت گاری بھی ہوتی ہے۔

اسی طرح سے قرآن مجید میں بے نظیر ذات کی ہمہ گیریت کی ابتدا بھی ہے اور اس کی انتہا بھی، لہٰذا وہ مبدئیت کے مناسب ہو گیا، اور جب تینوں باتیں ذہن نشیں ہو گئیں تو وسعت بے نظیری کی بنیاد کا معنی جو کہ حقیقت قرآنی کی اصل ہے، سمجھ میں آ گیا۔

پھر وسعت بے نظیری کے لحاظ سے جو کہ حقیقت قرآنی کا منشا ہے، ذاتِ پاک کے مراقبے کا شغل کرے اور اپنے اندر ظہور آثار اور تبدل انوار کو محسوس کر کے بے نظیر وسعت کے کمال کا طالب ہونا چاہیے۔ اور اس کے آثار میں سے صفائی و ستھرائی ہے جس کو اس سیر کا سائر اپنے اندر پاتا ہے اور وہ صفائی بے نظیر ذات اور کمال وسعت بے نظیری کے مناسب طرح طرح کی نیاز مندی اور قسم قسم کی تعظیم کی طرف نماز جن کا جامع ہے، اشارہ کرتی ہے۔

حقیقتِ نماز:

بیان کردہ کمال کے ساتھ حقیقت قرآن کی بنیاد کے لحاظ سے مراقبے کے بعد حقیقت نماز کی بنیاد کے لحاظ سے مراقبہ کرے، اور اس کا اثر مراقب کی انتہائی صفائی

وپاکیزگی ہے، لہٰذا ظاہری نجاستوں میں عین ملوث ہونے کی حالت میں بھی مثلاً بول وبراز کی حالت میں بھی وہ اپنے اندر صفائی وستھرائی پاتا ہے۔

### معبودیت کا مراقبہ:

اس کے بعد مسجودیت سے قطع نظر جس کو وہ ارکانِ نماز میں پاتا ہے، صرف معبودیت کا مراقبہ ہے، اس مراقبہ کا بیان یہ ہے کہ مثلاً نماز اس لحاظ سے کہ منعم حقیقی اور حاکم واقعی نے ہم پر فرض کی ہے اور اس کا تاکیدی حکم دیا ہے، یہ معبودیت مقیدہ ہے اور اس لحاظ سے کہ عین اس کی ذات اس تعظیم کی مستحق ہے، معبودیت محضہ ہے۔ اور اس کا اثر اپنی عظمت وبزرگی ہے جس کو وہ اپنے نفس میں بے وجہ اور بے سبب پائے گا۔ بخلاف اس عظمت کے جس کو اس نے حقیقت کعبہ کے مقام میں پایا تھا۔

### حقیقت ابراہیمی:

اس کے بعد حقیقت ابراہیمی کی بنیاد کے لحاظ سے ذات کا مراقبہ ہے۔ اس سلسلے میں مجمل بات یہ ہے کہ ہر صاحب کمال کو اپنے کمال کے پیش نظر اپنے ساتھ ایک انسیت ہوتی ہے، اس کا بیان یہ ہے کہ صاحب کمال کو خلوت میں کبھی کبھی وحشت پیش آتی ہے اور وہ کامل جب اپنے کمال کا ملاحظہ کرتا ہے تو بجز اس کے کہ کوئی عجب پیدا ہو وہ اپنے اندر ایک مونس اور رفیق پاتا ہے اور خود سے مانوس ہوتا ہے، اسی طرح سے اس انسیت کا تصور کرے جو اللہ تعالیٰ کو اپنے ساتھ ہے اور کمال ابراہیمی کی بنیاد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات اپنی ذات کے ساتھ مانوس ہے اس کو ملاحظہ کر کے مراقبہ کرے، اور جب یہ مراقبہ اپنی انتہا کو پہنچے گا تو اس مراقب میں خلت کا اثر ظاہر ہوگا اور دوسرے آثار جو بیان کیے گئے انھیں ہر جگہ جاننا چاہیے۔

### حقیقت موسوی:

اس کے بعد حق تعالیٰ کی ذات کا مراقبہ حقیقت موسویہ علیٰ صاحبہا الصلاۃ والسلام

کی بنیاد کے لحاظ سے ہے اور وہ ذاتِ پاک کی محبیت کا مراقبہ ہے اور محبیت کو ہر شخص جانتا ہے، ابتدا میں سالک کی اللہ تعالیٰ سے محبت ہونے اور اللہ تعالیٰ کی سالک سے محبت ہونے کے لحاظ سے محبیت کا مراقبہ ہوتا ہے اور اس سیر میں ذات کے ساتھ ذات کی محبیت کا مراقبہ ہے اور یہی حقیقت موسویہ کی بنیاد ہے۔

خلت اور محبت:

معلوم ہونا چاہیے کہ خلت کا مطلب ایسا تعلق ہے جو دو شخصوں کے درمیان ہوتا ہے اور محبت ایک طرف سے ہوتی ہے لیکن خلت سے زیادہ طاقتور ہوتی ہے لہٰذا خلت دوستی کے درجے میں ہے کہ دونوں دوستوں میں سے ایک کو دوسرے پر پورا بھروسا ہوتا ہے اور ہر ایک کی عزت وقدر دوسرے کے دل میں ہوتی ہے اور یہ خلت بڑے بڑے کاموں کی وساطت کی باعث ہوتی ہے مثلاً بادشاہوں کی نسبت وزرا اور امراو غیرہ۔

محبت کے درجے:

محبت کے تین درجے ہیں: پہلا درجہ یہ ہے کہ محبیت محبوبیت کی سرحد تک نہ پہنچی ہو، یہ محبت عزت وجاہت کے اعتبار سے خلّت سے کم تر ہے اور قرب ودوام حضوری کے اعتبار سے اس سے بڑھ کر ہے جیسے بادشاہ کا وہ خاص آدمی جو خدمت گاری میں نہایت خیر خواہ اور دل سوز ہو ضرور اسے بڑے امیر کی بہ نسبت قرب اور ہمیشگی کی حضوری زیادہ حاصل ہوگی۔

دوسرا درجہ یہ ہے کہ محبت محبوب کی سرحد تک پہنچ گئی ہو لیکن محبوب تک نہ پہنچی ہو حالاں کہ محبت کے اعلیٰ درجے تک پہنچ چکی ہو کہ اگر اس مقام سے جو کہ محبت کا منتہا ہے، آگے بڑھے تو محبوبیت تک پہنچ جائے یہ محبت خلت بھی ہے۔ اور محبت کا تیسرا درجہ یہ ہے کہ محبوبیت تک رسائی حاصل ہوگئی ہو، ایسی محبت خُلّت سے اعلیٰ اور افضل ہے اور یہی حقیقت محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی بنیاد ہے جیسا کہ آگے بیان ہونے والا ہے۔

اور چوں کہ یہاں پر ولایت کے مراتب کا بیان مقصود ہے اور ولایت کا دارومدار قرب اور ہمیشہ حضوری پر ہے اور یہ بات محبت میں خلت سے زیادہ پائی جاتی ہے، اگر چہ کاموں کی انجام دہی اور بڑے بڑے امور کے واسطہ ہونے میں خلت بڑھ کر ہے، اس لیے محبت کو خلت کے بعد بیان کیا گیا اور اگر محبت کے مقدم ہونے کی یہ وجہ نہ ہو تو دراصل حقیقت ابراہیمی حقیقت موسویہ سے افضل ہے۔

**حقیقت محمدیہ:**

اس کے بعد محبیت اور محبوبیت کے لحاظ سے ذاتِ پاک کا مراقبہ ہے جو حقیقت محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی بنیاد ہے۔

**حقیقت احمدیہ:**

اس کے بعد محبیت کے امتزاج کے بغیر صرف محبوبیت کے لحاظ سے ذاتِ باری تعالیٰ کا مراقبہ ہے جو کہ حقیقت احمدیہ ہے۔ اس کے بعد صرف محبت کا مراقبہ ہے محبوب یا محبّ کے ساتھ جس کا کوئی تعلق نہیں۔ اس کے بعد بغیر کسی تعیین کے مراقبہ ہے اس نیت کے ساتھ کہ اس کی پاک ذات کا ایسا مرتبہ ہے کہ تمام تعبیرات و بیانات اس سے عاجز ہیں، کوئی تعبیر و بیان وہاں تک نہیں پہنچ سکتا۔ واللہ اعلم بحقیقۃ الحال۔

# تکملہ

## راہِ ولایت کے دوسرے سلوک کا بیان

اس میں ایک تمہید اور ایک مقصد ہے:

### تمہید: غلط فہمیوں کے ازالے کا بیان

ناسمجھ سالکین جب معرفت ذاتِ باری تعالیٰ کے مقام تک پہنچ جاتے ہیں اور متعارف ومروّج سلوک کا راستہ طے کر لیتے ہیں تو سمجھتے ہیں کہ ہم بڑے اولیائے کرام مثلاً حضرت غوث الأعظم شیخ عبدالقادر جیلانی، نائب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت خواجہ معین الدین چشتی، حضرت قطب الأقطاب خواجہ قطب الدین بختیار کا کی، رہبر شریعت وطریقت حضرت خواجہ بہاؤالدین نقشبندی اور حضرت امام ربّانی قیوم زمانی، حضرت شیخ احمد مجددالفِ ثانی وغیرہم قدس اللہ اسرارہم أجمعین کے ہم رتبہ وہم پایہ ہو گئے ہیں، حالاں کہ یہ صریح غلطی اور نہایت فاسد خیال ہے، اس لیے کہ اس مقام تک اہل باطل اور برے لوگ بھی پہنچ سکتے ہیں اور جب اس مقام تک ان کی بھی رسائی ہو سکتی ہے تو کیسے اس کو دربارِ خداوندی کی قبولیت کا زینہ اور عنایتِ سرمدی کا راز سمجھا جا سکتا ہے۔

وَسَوفَ تَرى إذَا انكَشَفَ الغُبَارُ
أَفَرَسٌ تَحتَ رِجلِكَ أَم حِمَارٌ (۱۸۳)

اگرچہ مشہور سلوک جس طرح سے اس کتاب میں تحریر کیا گیا ہے۔ اہل باطل اس کو عمل میں نہیں لا سکتے ہیں، کیوں کہ ان کے اکثر اشغال شریعت کی تعظیم وآداب سے وابستہ ہیں، لیکن اس جگہ آداب شریعت کی آمیزش سے قطعِ نظر صرف ان اشغال کی حالت

کا بیان مقصود ہے۔ بس اس کی حقیقت یہ ہے کہ بے شک ذاتِ باری تعالیٰ کی معرفت تو حاصل ہوگئی، لیکن ردو قبول اس کے علاوہ ایک دوسری چیز ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی بارگاہ سے دھتکارے ہوئے لوگوں کا اس مقام (معرفت) تک رسائی حاصل کرنا ایسا ہے جیسے کوئی ڈاکو کوشش کر کے شاہی قلعہ میں داخل ہو جائے تو قریب ہے کہ اگر وہ اپنی بری حرکت سے توبہ نہیں کرتا ہے اور اس نے شاہی فرمان کے خلاف جو بغاوت و سرکشی کی ہے، صیغۂ عدالت میں اس کی اس سے علاحدگی ثابت نہیں ہوتی ہے تو وہ بادشاہ کے غصّے میں گرفتار ہو جائے اور بادشاہ سلامت اسے سزا دے۔

اس بے دین طالب کا حال یہی ہے جس نے ذاتِ پاک کی معرفت حاصل کر لی ہے۔ البتہ دین دار طالب کے حق میں یہ ایک عظیم اور بڑی چیز ہے، درحقیقت ترقی و کمال کا آغاز اسی جگہ سے ہوتا ہے اور یہ مقام ابجد خوانی کے درجے میں ہے۔ اور وہ مراتب جو شروع سے یہاں تک ذکر کیے گئے وہ سب مطلوب و مقصود کمال میں ناقابل شمار ہو سکتے ہیں۔ اور اس بات کی حقیقت اس مثال کے ضمن میں جو آئندہ افادے میں قلم بند کی جائے گی، ان شاء اللہ اچھی طرح واضح ہو جائے گی۔

پس بارگاہِ خداوندی کے ان مقبول بندوں کے لیے متعارف سلوک کے علاوہ اور ترقیات ومقامات ہیں جن ترقیات ومقامات کی وجہ سے وہ مقبولانِ حق کے زمرے میں شامل ہو گئے ہیں۔ بلکہ وہ ان مقامات پر فائز ہونے کی وجہ سے باقی تمام مقبول بندوں سے ممتاز ہو گئے ہیں۔

پس انھیں ترقیوں کو ہم سلوکِ ثانی کہتے ہیں، اور وہ القاب جو صوفیہ کی زبان میں ان مقامات کے لیے مقرر ہیں، ان کا منتہا قطب ارشاد ہے جو رحمتِ الٰہی کے افاضہ کا واسطہ ہوتا ہے، جو کچھ حاصل ہوتا ہے اسی کے واسطے سے ہوتا ہے۔ اور اکثر ناواقف لوگ سلوک اوّل اور سلوکِ ثانی میں فرق نہیں کرتے ہیں بلکہ سلوکِ ثانی سے بالکل بے خبر ہوتے ہیں، وہ سمجھتے ہیں کہ سلوکِ اوّل کے تمام ہوتے ہی کمال پورا ہو جاتا ہے، اور وہ نہیں جانتے ہیں

کہ پہلے سلوک کی انتہا دوسرے سلوک کی ابتدا ہے جو کہ مقصودِ اصلی ہے۔

اور کبھی کبھی بعض مقبولانِ بارگاہ الٰہی سلوک اوّل کی سیر کے بغیر سلوک ثانی کے مدارج پر فائز ہو جاتے ہیں۔ان کی مثال ایسی ہے جیسے ایک عقلمند اور صاحب ارادہ شخص ہے جو شاہی دربار سے دور ہے، احکام سلطانی اس کے پاس پہنچا تو اس نے ان احکام کی تعمیل میں اس قدر جدو جہد کی کہ مملکت کے خاص و عام رعایا اور فوجیوں کے درمیان شاہی دربار کا نمک حلال اور جاں نثار کے لقب سے ملقب ہو کر بادشاہ کے بہت سے قریبی لوگوں کا محسود بن گیا، جب ایسے شخص کو شاہی دربار میں حاضری میسر ہوگی تو اس کی اس قدر آؤ بھگت کی جائے گی اور اس کے ساتھ ایسا امتیازی سلوک کیا جائے گا جس کا حاصل کرنا سلوکِ اوّل کے اکثر سالکین کے لیے دشوار ہے۔

اور کبھی کبھی سلوکِ اوّل میں سلوکِ ثانی کے مدارج حاصل ہو جاتے ہیں اور ایسا شخص صوفیۂ کرام کی اصطلاح میں سلوک اوّل کا سالک ہے۔سلوکِ ثانی کے مدارج کے اعتبار سے اس کا حال اس شخص کے مانند ہے جو صاحب عقل و ارادہ ہے، جس کا تھوڑا سا ماجرا اس سے پہلے بیان ہو چکا۔اور اس کا سبب شریعت کے مطابق نیت کا خلوص اور طبیعت کی صفائی ہے کہ وہ سلوک اوّل کے اشغال کو محض عبادت اور دین کے طور پر صرف اللہ تعالیٰ کی رضا کے حصول کے لیے کرتا ہے، جس قدر اس کام میں اس کی نیت صاف ہوگی اسی قدر سلوکِ ثانی کے مدارج جلد حاصل ہوں گے۔ واللہ أعلم بحقیقة الحال۔

اور اگر چہ سلوکِ ثانی شریعت کا مقصود اور قرآن وحدیث سے ثابت ہے لیکن سلوکِ اوّل کے طرز پر اسے قید تحریر میں نہیں لایا گیا۔اس لیے اس کا خلاصہ اللہ تعالیٰ کی مدد اور اس کی حسن توفیق سے یہاں پر قلم بند کیا جاتا ہے۔

# مقصد

## راہِ ولایت کے دوسرے سلوک کا بیان

معلوم ہونا چاہیے کہ ولایت کے راستے میں دو سلوک ہیں، سلوکِ اول کو ضبط وربط کے ساتھ مدوّن کیا گیا ہے اور سلوکِ ثانی مدوّن نہیں ہے، باوجود یہ کہ مقصودِ اصلی اسی سلوک کی منتہا ہے، ہمیشہ اولیائے کرام نے یہ سلوک کیا ہے اور اس کا نام ''سیر فی اللہ'' رکھا ہے۔

کبھی کبھی ناواقفوں پر سلوکِ ثانی کی عدم تدوین کے باعث دونوں سلوک کے درمیان اشتباہ ہو جاتا ہے۔ وہ ایک کو دوسرے سے جدا نہیں جانتے ہیں، لہٰذا ہر ایک کا تفصیلی بیان مثال سے سننا چاہیے تاکہ دونوں ایک دوسرے سے ممتاز ہو جائیں اور یہ واضح ہو جائے کہ اصل مقصود دوسرے سلوک پر موقوف ہے۔

پس مقصودِ اصلی کی مثال یہ ہے کہ رعایا میں سے ایک آدمی ہے جس کا گھر دارالخلافہ سے دور ہے، اس کے دل میں شاہی عہدوں کا شوق پیدا ہوا تو اس نے اپنے مقصد یابی کو بادشاہ کی حضوری میں منحصر گمان کر کے شاہی دربار میں پہنچنے کے لیے خوب جدوجہد کرنے لگا، اور اصل مقصد کو دل میں چھپائے ہوئے ہے اور دربارِ شاہی میں حاضری کو اپنی غرض بتاتا ہے، حقیقی مقصد کو شاہی دربار میں رسائی سے پہلے مخفی رکھتا ہے، یا تو اس وجہ سے کہ اس کے اظہار میں مفاسد واقع ہونے کا اسے اندیشہ ہے یا اس لیے کہ وہ اس کے ظاہر کرنے میں فی الحال کوئی فائدہ نہیں سمجھتا ہے، اس لیے وہ اس کو کسی کے سامنے ظاہر کرنے سے باز رہتا ہے۔

پھر وہ منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لیے سفر کی تدبیر کرے گا اور رفیقانِ راہ کا حال اور منزلوں کے نام معلوم کر کے سیدھی راہ کا انتخاب کرے گا اور اسبابِ سفر مہیا کرے گا، اس کے

بعد اپنے اہل تعلق اور قرابت داروں سے رخصت ہو کر اپنے وطن وعلاقہ کو چھوڑ کر، ان سب کی محبت اپنے دل سے نکال کر اور ان سب کو پس پشت ڈال کر سفر شروع کرے گا اور اثنائے سفر راستے کے دائیں بائیں شہر، باغات، نہریں اور عجیب وغریب چیزیں جو اس نے کبھی نہیں دیکھیں، نظر آئیں گی تو اگر اس نے سیر وتماشا، لوگوں اور شہروں کے حالات کی دریافت اور سفر کے تجربے حاصل کرنے جیسی اغراض میں سے کسی غرض کی طرف متوجہ ہو کر راہِ راست سے ہٹ کر لمبی مسافت کو اپنے اوپر گوارہ کر لیا، تو عجب نہیں کہ اس حالت میں اب سیر وتماشا میں ایسا مشغول ہو جائے کہ اپنے مقصود کو بھلا بیٹھے، یا یہ کہ یادداشت کے باوجود منزل مقصود تک نہ پہنچ پائے اور اپنی پوری عمر اس سیر وسیاحت میں برباد کر دے۔ اور اتنی تو طے شدہ بات ہے کہ وہ بمشکل تمام ایک لمبی مدت گزرنے کے بعد منزل تک پہنچے گا، اور اگر وہ سیدھی راہ سے منحرف نہ ہوا ہوتا اور منزل بہ منزل سیدھی راہ طے کرتا ہوتا تو یقیناً دن بہ دن دار الخلافت کے آثار وعلامات نمودار ہوتے جو اس کے کانوں کو منزل مقصود کے حصول وقربت کی خوش خبری سناتے۔ اور جس قدر وہ دار الخلافہ سے قریب ہوگا اسی قدر وہ آثار جو دار الخلافت کے ساتھ خاص ہیں جیسے فیل خانہ، شتر خانہ، اصطبل اور ان جیسی دوسری چیزیں نظر آئیں گی۔ یہاں تک کہ وہ درالخلافہ میں پہنچ کر ایک طرح سے مقصود حاصل کر کے مطمئن ہو گیا اور شدائد سفر سے آرام وراحت کی سانس لی۔ اس کے بعد وہ دیوان خاص میں پہنچا تو اس محل کو شاہی شان وشوکت اور اقبال مندی کے مطابق خوبصورت اور پرشکوہ دیکھ کر حقیقت سلطنت کا ترجمان پایا اور ایک طرح سے بادشاہ کی حضوری سے سرفراز ہوا پھر بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہو کر ظاہری مطلوبِ اوّل حاصل کر کے مطلب ثانی کے حصول کا طریقہ ڈھونڈے، پس مقصود اوّل سلوک اوّل کی منتہا ہے اور مقصود دوم حاصل کرنے کا طریقہ سلوک ثانی ہے۔

اور اس مثال کی تطبیق شروع سے اخیر تک سلوکِ اوّل پر ظاہر ہے، وہ اس طرح سے کہ مرشد اور اولیاء اللہ قدس اللہ اسرارہم کے طریقوں میں سے کسی طریقے کو تلاش کرنا

یہاں تک کہ ایک مرشد تک پہنچنا اور کوئی ایک طریقہ متعین کرنا مسافروں اور راستوں کی دریافت اور ان میں سے کسی ایک کو مقرر کرنے کے درجے میں ہے۔ اور ذکر جہری ہو یا سری، زبان سے ہو یا لطائف سے یا سلطان الذکر ہو یہ سب سامان سفر فراہم کرنے کے درجے میں ہیں۔ اور اپنے گھر والوں اور اہل تعلق اور وطن وعلاقے کو چھوڑنا شغل نفی کے درجے میں ہے اور راستے کے دائیں بائیں بھٹکنا توحید صفاتی میں استغراق کے درجے میں ہے، اور کبھی کبھی وہ توحید صفاتی کے حقائق میں اس قدر ڈوب جاتا ہے کہ اللہ جل شانہ کی ذاتِ پاک تک پہنچنے سے غافل ہو جاتا ہے۔

اور بسا اوقات وصول کی یاد کے باوجود وہ ان وقائع میں ایسا پھنسا رہتا ہے کہ اس سے نکل نہیں پاتا اور اگر اس سے نکلا بھی تو بمشکل اور دیر سے پہنچنا ایک قطعی بات ہے۔ لہٰذا اگر وہ اپنی توجہ والتفات کو توحید صفاتی سے ہٹائے رکھتا تو براہِ راست بغیر اِدھر اُدھر پھرے منزل مقصود تک رسائی حاصل کر لیتا۔

اور دارالخلافت کے آثار وعلامات ذات خالص کے حجبِ نورانیت کے مانند ہیں اور وہ ہزاروں کے تعداد میں ہیں اور آخری حجاب دیوان خاص کے درجے میں ہے اور وہ نسبت بے رنگی ہے چوں کہ حضرت حق جل شانہ کی ذاتِ مقدسہ بے مثل و بے نظیر ہے اور یہ حجاب اس ذاتِ پاک کے ساتھ زیادہ خصوصیت رکھتا ہے، اس بنا پر وہ نہایت ہی لطیف و بے کیف ہے، لہٰذا اسے بے رنگی کہا جاتا ہے۔

اور معلوم ہونا چاہیے کہ نورانیت کے حجابات ایک دوسرے سے پیوستہ نہیں ہیں بلکہ ہر ایک حجاب دونوں جانب سے اپنی ایک متعین حد رکھتا ہے یہاں تک کہ وہ حد اسی حجاب سے متعلق ہوتی ہے اور اس کی مثال شاہی مکانات کے دروازوں کے پردوں سے معلوم کی جاسکتی ہے، مثلاً ہر وہ پردہ جو محل خاص کے دروازہ پر ہوگا اس کا علاقہ دونوں جانب سے ایک متعین حد تک ہوگا اور اس پردے کے خادم اور نگراں اسی حد تک کی نگرانی و دیکھ

بھال کریں گے اور آنے والے کو اسی حد تک آنے کی اجازت دیں گے یا منع کریں گے اور نو وارد شخص کو اپنی اجازت کے ساتھ دوسری حد تک پہنچا دیں گے تا کہ دیوان خاص کے اندر رہنے والے معتمد حضرات اس آنے والے کو اجنبی نہ سمجھیں اور اس کے داخل ہونے کی مخالفت نہ کریں اور تمام اطراف و جوانب سے صحراء کی حدود بھی اس کی مثال ہو سکتی ہیں۔

پس نسبت بے رنگی کو اسی طرح پر لمبا تصور کرنا چاہیے اور بیان کردہ مثالوں میں اس کی ابتدا دار الخلافت سے سمجھنی چاہیے، اس لیے کہ دار الخلافت کی خصوصیت بادشاہ کے ساتھ بالکل ظاہر ہے۔ اور جہاں تک نسبت بے رنگی کی انتہا کی بات ہے کہ تو وہ ذاتِ خاص تک وصول و مشاہدہ ہے۔ یہ ہے ابتدا سے انتہا تک سلوکِ اوّل پر تمثیل کی تطبیق۔

اور رہی بات سلوک ثانی کی تمثیل کی تو وہی شخص بادشاہ کی خدمت میں پہنچنے کے بعد جب ارادہ کرے کہ کسی خدمت و منصب کے حصول اور شاہی ملازمین کی جماعت میں شامل ہونے کی کوشش کریں تو اس پر لازم ہے کہ دربار کے تمام حاضر باشوں کو، قاصد و دربان سے لے کر وزیر اعظم تک سب کو اپنے سے خوش کرے تا کہ بوقت ضرورت اس کے متعلق ان کی زبان سے اچھی بات بادشاہ کے سامنے نکلے اور ہر ایک اپنے مرتبے کے مطابق اس کے لیے کوشش و سفارش کرے، اور وہ بادشاہ کی مرضیات میں خوب سرگرم اور چاق و چوبند ہو، اور دربار میں بادشاہ کی آمد و رفت اور سیر و سیاحت کے لیے نکلنے اور واپس آنے اور دربار میں حاضرین سے ملاقات کے وقت اس کی طرف سے کاہلی و سستی کا مظاہرہ نہ ہو کہ مبادا دربار میں کاہلی کے داغ سے داغ دار ہو کر نظر اعتبار سے گر کر بادشاہ کی حضوری کے قابل نہ رہے اور یہ بات وہاں سے اس کے اخراج کا باعث ہو۔

نیز معلوم ہونا چاہیے کہ خوش کرنا حسب مرتبہ متفاوت ہوتا ہے، جب تک وہ اپنے وطن میں تھا اس وقت اس کا خوش کرنا بس یہی تھا کہ وہ چوری، ڈکیتی اور بغاوت وغیرہ سے باز رہے اور اگر مال گزار ہے تو سرکار سے وابستہ مال کو بغیر کسی حیلہ و تکرار کے ادا کر دے اور

جب وہ اس مقام تک پہنچے تو اس کا بادشاہ کو راضی کرنا یہ ہے کہ شاہانہ آداب وتعظیمات اور حقوق کی رعایت کماحقہ بجالائے اور وہاں والوں کی رضامندی میں زر کثیر خرچ کرنے جیسے نذر، تواضع، ہدایا اور تحائف دینے کو خس وخاشاک کے برابر تصور کرے اور ان کی رضامندی کو اپنی جان ومال سے بہتر جانے اور قلعہ میں رہنے والوں کے مختلف درجے ہوتے ہیں، مثلاً جو لوگ دارالخلافت میں رہتے ہیں وہ ایک طرح سے سلطنت میں رہنے والے ہیں اور قلعے خاص کے حاضرین کا درجہ ان سے بڑا ہے اور دیوان خاص کے ملازمین کا درجہ ان سے بھی بڑا ہے اور جو لوگ دیوار کے پیچھے کھڑے ہو کر ہمہ وقت ڈیوٹی میں لگے ہوتے ہیں ان کا مقام ان سے بھی اونچا ہے، اور جو بادشاہ کے روبرو کھڑے ہوتے ہیں ان کا مقام ان سے بھی بلند ہے اور جو بادشاہ کے حضور میں کھڑے ہو کر اپنی نگاہ کو بادشاہ کے چہرے پر ٹکائے رہتا ہے اور بالکل کسی اور طرف متوجہ نہیں ہوتا ہے اس کا درجہ پچھلے تمام لوگوں سے اعلیٰ وارفع ہے۔

پس ان مراتب میں سے اعلیٰ مرتبہ کو اختیار کر کے اس قدر پابندی کرے کہ بادشاہ کے دل میں اس سے محبت پیدا ہو جائے اور اس کی وقعت وقدر بادشاہ کے دل میں بیٹھ جائے اور بادشاہ کو یقین ہو جائے کہ یہ شخص میرا بہت بڑا عاشق اور جاں نثار ہے اور اس وجہ سے اس کا وہاں قیام کرنا آسان ہو جائے اور جب وہ ہر وقت بادشاہ پر اپنی نگاہ لگائے رہے گا اور اس کی طرف بادشاہ کی توجہ وعنایت اہل دربار کو معلوم ہوگا تو تمام درباری بھی اس سے خوش ہو جائیں گے اور اس کا اس جگہ قیام کرنے کو درست سمجھیں گے۔

اور اس جگہ قیام پذیری کے بعد اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ ہمیشہ حاضر رہے اور بادشاہ کے چہرے کو جیسا کہ چاہیے بغور ملاحظہ کرتا رہے اور جو واقعات اور خبریں دربار میں گزرتی ہیں انھیں سن کر بادشاہ کے چہرے کی کیفیت کو جو ہر خوش کن یا ناخوش خبر کے بعد کیسے بدلتی ہے بڑی گہرائی کے ساتھ معلوم کرے، اور تبدیلی کی صورتوں کو اپنی قوت حافظہ وذہانت

کے سپرد کرے۔ اور ہر تغیر کے بعد بادشاہ کے حضور سے انعام یا سزا یا صلح یا جنگ یا بندوبست کا جو حکم صادر ہو، اس کو بھی علم میں رکھے اور ان وقائع واخبار میں چھوٹی بڑی تمام خبروں پر نگاہ رکھے، اور خوشی کی خبروں میں حقیر غلام کی صحت کی خبر سے لے کر وزیر اعظم کی صحت کی خوش خبری تک اور ناخوش خبروں میں ایک خچر کی موت سے لے کر وزیر اعظم کی وفات تک اور اسی قیاس پر جیب تراش کی گرفتاری سے لے کر ملک اور لشکر والے زور آور دشمن کی گرفتاری تک اور دور دراز جنگل میں کسی دیہاتی کی لوٹ کی خبر سے لے کر قلعہ خاص پر دشمن کی چڑھائی تک، غرض ان سب باتوں کا احاطہ کرے اور ان پر نظر رکھے۔ بہت سی چیزیں ایسی ہوتی ہیں جن کی جزا یا سزا یکساں ہوتی ہے اور اس بنا پر ان چیزوں میں بادشاہ کے چہرے کے تغیر میں کچھ فرق نہیں ہوتا ہے، لہٰذا وہ یہ نہ سمجھے کہ ہر خبر وواقعہ میں ایک علاحدہ تغیر ظہور پذیر ہوگا، بلکہ اگر خبر دو ہوں اور چہرہ ایک جیسا پائے تو سمجھ لے کہ یہ دونوں خبریں ایک جیسی ہیں، ان کی جزا یا سزا میں کوئی فرق نہیں ہے، وہ اسی طریقے پر عمل کرتا رہے تاکہ اس کی ذہانت وفطانت کے مطابق اس کے اندر بادشاہ کی مرضی شناسی کا ملکہ پیدا ہو جائے اور وہ واقعات واخبار میں بادشاہ کے منشا سے واقف ہو جائے اور یہ واقفیت اس حد تک پہنچی ہوئی ہو کہ صرف چہرے کے تغیر سے بادشاہ کی مراد کو سمجھ لے اگرچہ شاہی کلام اپنی اصلی لغوی معنی کے برخلاف ہو۔ مثلاً کبھی بادشاہ حکم دیتا ہے کہ اس چور کی اچھی طرح خدمت کی جائے اور اس کی غرض یہ ہوتی ہے کہ اس کو پوری پوری سزا دی جائے۔

اور جب وہ مرضی شناسی کی استعداد سے بہرہ ور ہو کر حکومت کے کاموں میں سے کسی کام کو انجام دے گا تو بادشاہ کی عنایات وتوجہات پہلے سے کئی گنا زیادہ اس پر ہوں گی۔ نیز اہل دربار کی کوشش وسفارش اس کے حق میں مدد ومعاون ثابت ہوگی، تو پھر ضرور بادشاہ اس کو کسی منصب وعہدہ سے نوازے گا، اور وہ اس طرح سے جس مقصد کے لیے اتنے سارے نشیب وفراز سے گزرا تھا اور تکلیفیں ومشقتیں اٹھائی تھیں، ان شاء اللہ اسے پالے گا۔

اس کے بعد وہ اپنی حالت کے مطابق اسی عہدے پر ہمیشہ برقرار رہے گا یا ترقی کر کے اس منصب سے منتقل ہو کر اس سے اعلیٰ منصب پر فائز ہو جائے گا، دوسرے سلوک کا یہی حال ہے، سالک کے لیے ضروری ہے کہ مرتبۂ مشاہدہ پر براجمان ہونے اور سلوک اوّل کی تکمیل کے بعد سلوکِ ثانی شروع کرے، اس سلوک کے لوازمات میں سے ماموارت ومنہیات کے ہر باب میں شریعت کی عزیمتوں پر عمل پیرا ہونا ہے۔

اس کی توضیح یہ ہے کہ اتباع شریعت ایمان کا لازمی جز ہے اور سالک کے لیے ضروری ہے کہ ہمیشہ متبع شریعت ہو کر شریعت کے کمال اتباع کے ساتھ سلوک اوّل کو پایۂ تکمیل تک پہنچائے، اور سلوک ثانی میں شریعت کے عزائم کو مضبوطی کے ساتھ تھامے، یہ عزیمت کبھی دل سے ہوتی ہے اور کبھی اعضا و جوارح سے مثلاً قرآن مجید کا اس قدر ادب کے بے وضوا سے نہ چھوئے شریعت کے واجبات میں سے ہے، ہر مسلمان کو چاہیے کہ بے وضوا سے ہاتھ نہ لگائے۔ اور سلوک ثانی کے سالک کے لیے اس سے زیادہ آداب بجالانا ضروری ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ قرآن مجید پکڑتے وقت دوسرے کاموں کی طرف متوجہ نہ ہو، باادب بیٹھے، اور کلامِ الٰہی کی عظمت کو خیال میں لائے اور اس سے عظمت قرآن کی طرف منتقل ہو کر اپنی کمینگی وگھٹیا پن کو یاد کر کے اس نعمت عظمیٰ کی قدر کو پہنچانے کہ مجھ جیسے فرومایہ اور گھٹیا انسان کے ہاتھ میں اتنی بڑی معظم شے محض اللہ تبارک وتعالیٰ کے فضل وکرم سے پہنچی ہے ورنہ ہرگز میں اس نعمت کے قابل نہیں تھا۔ اس قسم کے تصور سے اس کا دل خوشی سے پھولے نہیں سمائے گا اور قرآن شریف کی عظمت اس کی آنکھوں کے سامنے ہو جائے گی۔ اگر ایسی باتیں خود بخود اس کے ذہن میں آجائیں تو بہت بہتر، اور یہی اصلی غرض ہے ورنہ بتکلف اس قسم کی باتیں اپنے ذہن میں لائے۔

اسی قیاس پر ہر سورہ کی عظمت کو سمجھے اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اس کے شافع ہونے کو یاد کرے، اور اسی طریقے پر نماز، زکاۃ، روزہ، حج اور جہاد اور بقیہ تمام شعائر اسلامی

کی عظمت کا تصور کرے اور اسی فہرست میں مطلقاً شریعت مطہرہ کی تعظیم، خانہ کعبہ، انبیا اور مرسلین علیہم الصلاۃ والسلام کی تعظیم بھی شامل ہے اور اسی تعظیم کی قبیل سے ہے صرف اموال اور ایثار وقربانی کی روش اختیار کرنا۔

زکاۃ کی مقدار چند شروط کے ساتھ ہر مسلمان پر فرض ہے اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی میں مال خرچ کرنا ایک ایسی عزیمت ہے جو سلوک ثانی کے سالک کے لیے ضروری ہے اور تمام نوافل کا اہتمام جیسے تہجد وغیرہ وہ سب اسی سلسلے سے ہیں، اور دوسری طرف بری باتوں سے پرہیز کو بھی اپنے اوپر لازم کرلے تاکہ وہ ارباب عزیمت میں سے ہوجائے، مثلاً زنا کا وسوسہ اگر اس کے دل میں آئے تو وہ اس سے اس قدر نفرت کرے کہ گویا نجاست کھانے کے لیے اس کے سامنے رکھی گئی ہو، اسی پر تمام معاصی ومنکرات کا قیاس کرلینا چاہیے۔ نیز اس سلوک کے سالک کو چاہیے کہ انبیاء واولیاء بلکہ تمام مؤمنوں کے حقوق کی ادائیگی اور ان کی تعظیم وتکریم میں خوب سعی کرے تاکہ وہ سب اس کے لیے کوشش کرنے والے اور سفارش کرنے والے ہوجائیں، انبیاء اور اولیاء کی شفاعت تو بالکل ظاہر ہے۔

اور جہاں تک تمام مسلمانوں کی کوشش کی بات ہے تو وہ دعائے خیر ہے۔ لہٰذا اس دعائے خیر کی امید میں جو وہاں کام آنے والی ہے ہر مسلمان کا خیال رکھے اور اس کی خاطر داری کرے اور یہ سب حقوق وتعظیمات شریعت کے عزائم کی پیروی میں ادا ہوجاتے ہیں، جیسا کہ ابھی معلوم ہوا۔ اور قرآن، اس کی سورتوں، خانۂ کعبہ، نماز اور روزہ وغیرہ ان سب کو شفاعت کا مرتبہ حاصل ہے، لہٰذا ان سب کو اپنے آپ سے راضی کرے اور اس مقام کی رضا کا مرتبہ پچھلے بیان سے واضح ہوچکا ہے۔

اس سلوک کی اصل ''وجہ اللہ'' کا مراقبہ ہے اور وجہ اللہ کا لغوی معنی اللہ تعالیٰ کی توجہ ہے یعنی بندے کی طرف اللہ تعالیٰ کا متوجہ ہونا اور اس کو اس کے آثار سے معلوم کرنا چاہیے، اور اس کے آثار اس آیت کریمہ "فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ"(۱۸۴) کے بموجب ہر جگہ موجود ہیں۔

مثلاً اگر بندہ اپنی آنکھ و بینائی کی حالت میں خود غور کرے تو یقین کے ساتھ وہ جان لے گا کہ یہ نعمت عظمیٰ مجھے صرف اللہ تعالیٰ کی توجہ کی بنا پر ملی ہے یعنی حق تعالیٰ اس کے حال پر متوجہ ہوا اور اس کی طرف التفات کیا تو یہ نعمت عظمیٰ اسے حاصل ہوئی، ورنہ بندۂ بے چارہ کسی بھی طرح سے اس کا مستحق نہیں تھا، نہ ہی اس نے اس کے لیے دعا کی تھی، نہ اس کی خواہش و چاہت اس کے دل میں پیدا ہوئی تھی، نہ کسی شخص نے اس نعمت عظمیٰ کی عطا کے لیے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اس کے لیے سفارش کی تھی اور نہ ہی اس عاجز بندہ نے اس کے لیے کسی چیز کا واسطہ پکڑا تھا، لہٰذا ایسی عظیم نعمت صرف اس خدا کے فضل و کرم سے ہے جس کی رحمت کامل اور جس کی نعمتیں عظیم الشان ہیں۔

اور اسی قیاس پر ہزاروں ہزار نعمتیں ہیں اور ہر نعمت کا یہی حال ہے بلکہ درحقیقت دنیا میں جتنی چیزیں موجود ہیں اگر تم اس میں غور کرو تو ظاہر ہو جائے گا کہ وہ سب اس بندہ کے حق میں جلیل القدر نعمتیں ہیں، لہٰذا ہر چیز فلک و ملک سے لے کر خس و خاشاک تک اس کے لیے نعمت ہے اور اس کو اس کے ساتھ خصوصیت ہے باوجود یہ کہ اس کی استعداد اور کوشش و خواہش کا ہرگز اس میں کوئی دخل نہیں ہے۔

پس وہ خدا تعالیٰ کی نعمتوں میں غور وخوض کرے اور ہمیشہ اس بات کو پیش نظر رکھے کہ اللہ تعالیٰ کی وہ رحمتیں جو اس حد تک ہیں کہ ان کا بیان مشکل ہے بغیر کسی سبب اور وجہ کے میرے حال پر متوجہ ہیں اور تمام مخلوق انھیں رحمتوں سے فیض پا رہی ہیں، کوئی شخص ایسا نہیں ہے جس کے اندر نعمتیں بڑی تعداد میں موجود نہ ہوں، اگر کوئی شخص ایسا ہے کہ اپنی طبعی کثافت کی وجہ سے ان نعمتوں کا اپنے اندر ادراک نہ کر سکے تو اسے چاہیے کہ غیر کے اندر ان نعمتوں کا دھیان کرے۔ اور تمام لوگوں میں سب سے افضل و اعلیٰ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ لہٰذا آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو وقت پیدایش بلکہ نطفے کے وقت سے لے کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری وقت تک کے حالات کو یاد کرنا چاہیے کہ ایسی عظیم نعمتیں

بے حد وحساب رحمت الٰہیہ کے دریائے ناپید کنار سے کس طرح بغیر کسی درخواست ودعا اور بغیر کسی استحقاق واستدعا، اور بغیر کسی کی کوشش وسفارش کے کس طرح سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر برستی ہیں، صرف ولادت کے موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر کس قدر برکتیں اور عنایتیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی کے ساتھ وابستہ ہوئیں کہ وہ برکتیں ایک بڑی جماعت کے شامل حال ہوتی ہیں اور عقیدت ومحبت کا سبب بنتی ہیں۔

اور وہ نعمتیں جو بچپن میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر جاری ہوتی ہیں وہ آپ پر دوسری نعمتوں کے قیاس کے سامنے ایک معمولی شے ہیں، جو چنداں وقعت نہیں رکھتی ہیں، باوجود یہ کہ فی نفسہ بڑی جلیل القدر نعمتیں ہیں۔ غرض ایسی عظیم وجلیل نعمتوں کا تصور کرے کہ یہ سب بغیر کسی سبب اور وجہ کے محض اللہ تعالیٰ کی ذاتی رحمت کاملہ سے میسر ہورہی ہیں، جب اللہ تعالیٰ کی توجہ بندہ کی طرف ہوتی ہے تو اس قسم کے انعامات ظاہرہ وباہرہ بغیر کسی استحقاق، استدعا اور دعا کے حاصل ہوتے ہیں۔ پس وجہ اللہ کے معنی کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ رحمتِ الٰہیہ کی شانوں میں سے ایک شان ہے جو بغیر کسی سبب، وجہ اور بغیر کسی سابقہ استحقاق، درخواست، خواہش، دعا، شفاعت اور توسل کے عظیم الشان، کثیر انعامات کے بخشنے کا تقاضا کرتی ہے، اور وجہ اللہ کا مراقبہ اسی شان کا دھیان ہے۔

اور ان انعامات کی اصل عدم کی پوشیدگی سے وجود میں لانا ہے، اور وجہ اللہ کا یہ معنی تمام موجودات کو شامل ہے۔ البتہ ایک کو دوسرے پر تفوق کی وجہ سے ہر شخص کی نسبت وجہ اللہ کے معنی کے انعامات کی وجوہ میں اختلاف ہوتا ہے۔

اور تم یہ نہ گمان کرو کہ اس صورت میں خدا تعالیٰ کے کام میں عبث لازم آئے گا اور عبث کام کرنا بے وقوفی ہے، اور اللہ جل شانہ کی ذات اس سے پاک ومنزہ ہے۔ اس لیے کہ افعالِ الٰہیہ کی حکمتیں ومصلحتیں دوسری چیز ہیں اور اس شخص کی استدعا واستحقاق جس پر انعام ہوتا ہے، ایک الگ چیز ہے، اگرچہ درحقیقت حکم ومصالح ہی مقصود ہیں۔

پس اللہ تعالیٰ کی تخلیق میں ایسی چیزیں ہیں جن کا اس شخص کے ساتھ کوئی خصوصیت نہیں مثلاً اربابِ دانش اور اصحابِ نظر کی پیدائش حکم ومصالح کے لحاظ سے اس حکیم حقیقی کا مقصود ہے، البتہ اگر وہ اس کے علاوہ دوسرے کو علم ودانش عطا فرمادے بلکہ حیوانات میں یہ کمال رکھ دے تو کوئی شخص اور کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو اللہ جل شانہ کے ہاتھ کو اس طرف سے پھیر کر اس طرف متوجہ کردے اور اِس نعمت کو ان تک پہنچادے۔

پس یہ اللہ تعالیٰ کا محض فضل وکرم ہے کہ اس نے ہر ایک شخص کو بہت سے انعامات سے نوازا ہے اور بہت سی نعمتوں کے ساتھ ہر ایک کی تخصیص فرمائی ہے، اسی شان کو جو بے غرض رحمت کاملہ کا سرچشمہ ہے، ''وجہ اللہ'' کا نام دیا گیا، اور ''وجہ اللہ'' کے آثار تمام ظاہری وباطنی نعمتیں ہیں جو کسی غرض کی بنا پر نہیں ہیں بلکہ خالص ہیں اور ''وجہ اللہ'' انھیں آثار سے جانا پہچانا جاتا ہے۔

اور اس کے بالمقابل "وجہ العبد" ہے یعنی اللہ جل شانہ کی طرف بندہ کا متوجہ ہونا، اس کا بیان یہ ہے کہ ہر بندۂ مومن خواہ کم ہمت ہو یا عالی ہمت کوئی چیز حاصل کرنے کی نیت سے اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتا ہے اور اس کے احکام بجالاتا ہے۔ جہاں تک کم ہمت مؤمن کی بات ہے تو وہ جہنم کے خوف اور جنت کے شوق میں طاعت وعبادت بجالاتا ہے اور جہاں تک عالی ہمت مومن کی بات ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کے پاس عزت ووجاہت کے حصول، چیدہ افراد کے زمرے میں دخول اور قابل اعتبار خاص ملازموں کی فہرست میں شامل ہونے کی آرزو وتمنا میں طاعت وعبادت انجام دیتے ہیں۔

اگرچہ آگ سے خلاصی اور جنت کے درجات پر کامیابی مذکورہ عزت کے حصول پر یقیناً مترتب ہوتی ہیں بلکہ یہ تو اس کے آثار وتوابع میں سے ہیں لیکن ارباب ہمت عالیہ ان امور کی طرف توجہ نہیں کرتے ہیں بلکہ ان کا مقصد وہی خاص افراد کی لڑی میں پرونا ہے اور بس۔

پس ضرور دونوں جماعت میں سے ہر ایک کے دل میں اپنے خالق سے انسیت ومحبت پیدا ہوجاتی ہے اور روز بروز ترقی کرتی رہتی ہے یہاں تک کہ بعض بندوں کے حق

میں ہوتے ہوتے تمنا، شوق اور خوف کے تمام مراتب اس کے دل سے محو ہو جاتے ہیں اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی الفت ومحبت اس کے دل میں اس طرح سے مستحکم ہو جاتی ہے کہ وہ احکام خداوندی کو بجالاتا ہے اور قرب کے مراتب میں سے کسی مرتبے کے حصول اور جنت کے ثوابوں میں سے کسی ثواب کا خیال اس کے دل میں نہیں گزرتا ہے۔ اگرچہ عزت واعتبار کا حصول اس پر قطعی اور یقینی ہے جیسا کہ حصولِ ثواب کا یقین عزت واعتبار کے حصول پر بدیہی ہے، البتہ احکام کی تعمیل میں اس کے دل سے عزت واعتبار کے حصول کی تمنا اور ثواب کا تصور بالکل چلا جاتا ہے۔

اسی طرح سے وہ منہیات سے پرہیز کرتا ہے اور اس میں وہ صرف اللہ تعالیٰ کے منع کو ملحوظ خاطر رکھتا ہے، اگرچہ ملأ اعلیٰ میں ذلّت سے حفاظت، اہل عزت واعتبار کے مراتب سے عدمِ سقوط اور عذاب دوزخ سے نجات اس پر مرتب ہوتی ہیں لیکن یہ بندہ ہرگز ان سب باتوں کا خیال نہیں کرتا ہے، اس کا مطمح نظر صرف اللہ تعالیٰ کی رضامندی وناراضگی ہوتی ہے، چوں کہ وہ جانتا ہے کہ اس کے حکم کی تعمیل میں ہی اس کی رضا ہے، اس لیے وہ اس رضا کو اپنے حق میں قرب وعزت کے مدارج اور ثواب جنت کے درجات میں ہزاروں ترقیوں سے بہتر شمار کرتا ہے اور جب وہ کسی کام میں اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا تصور کرتا ہے تو اس ناراضگی کو ہزاروں ذلّت سے بدتر یعنی اہل عزت واعتبار کے مراتب سے سقوط ذلیلوں کے زمرے میں دخول بلکہ دوزخ کے ہزاروں عذاب سے بدتر سمجھتا ہے۔

پس جس طرح سے وجہ اللہ بندے کی طرف بغیر کسی غرض کے رحمتِ الٰہیہ کا متوجہ ہونا ہے، اسی طرح سے وجہ العبد صرف اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے بغیر عزت واعتبار کے مراتب میں سے کسی مرتبہ کی آرزو اور ثواب جنت کے حصول کی توقع اور عذاب دوزخ سے نجات کی امید کے، بندہ کا اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونا ہے، اور ان آیتوں میں اسی بات کی طرف اشارہ ہے: "اَلَمْ یَجِدْكَ یَتِیْمًا فَاٰوٰى، وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى، وَوَجَدَكَ

عَـائِلاً فَـاَغْنیٰ" (۱۸۵) یہ تینوں آیتیں، ''وجہ اللہ'' کی طرف اشارہ ہیں اوراس سورہ کی آخری تینوں آیتیں، وجہ العبد، کی طرف اشارہ ہیں۔

اور جب ''وجہ اللہ'' اپنے آثاراور مقابل کے ساتھ پہچان لیا گیا، تو اس کے مراقبے کا طریقہ یہ ہے کہ اپنی نظر کو اس شان کی طرف جو بے غرض رحمت کا منشا ہے، متوجہ کرے اور ہمیشہ اپنی نگاہ کو اس پر ٹکا کر زبانِ حال اور قال سے التجا وسوال کرے کہ جب تو نے اس قدر بڑی بڑی نعمتیں مجھ پر یا میرے علاوہ پر بغیر کسی استحقاق اور استدعا کے مرحمت فرمائی تو فلاں نعمت بھی عطا فرما، اگر چہ وہ بہت بڑی و بزرگ ہے اور میں نہایت ہی نالائق و عاجز ہوں، کیوں کہ تیرا انعام عام کسی بھی امر پر موقوف نہیں ہے، اوراس کے لیے کسی بھی چیز کی ضرورت نہیں پڑتی ہے۔

اور یہ مراقبہ کبھی بلا جہت ہوتا ہے اور کبھی مراقب کے باطن کی توجہ کے موافق اوپر یا نیچے کی جہت کے ساتھ مقید تصور میں آتا ہے، اس مراقبہ کے باعث اللہ تبارک وتعالیٰ کی خاص عنایت اس کے حال پر متوجہ ہوتی ہے اور خاص عنایت کی بھی خاص صورت ہوتی ہے، مثلاً حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق باوجود یہ کہ تمام مخلوق حق تعالیٰ کی قدرت سے پیدا شدہ ہے، لیکن حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق میں خاص عنایت متوجہ ہوئی اور ان کی مخصوص صورت ظہور میں آئی، اللہ تعالیٰ کے اس قول "خَـلَقْتُ بِیَدَیَّ" (۱۸۶) میں اسی خصوصیت کی طرف اشارہ ہے۔ اور یہی خصوصیت ختم المرسلین حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج کے ساتھ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کوہِ طور پر کلام کے ساتھ حاصل ہے، اوراسی مخصوص عنایت کی وجہ سے بارگاہِ ایزدی کے بزرگ لوگ اس سالک سے بہت خوش ہوتے ہیں، وہاں ٹھہرنے سے اس کو نہیں روکتے ہیں اور عزت وقار کے ساتھ اس کو جگہ دیتے ہیں۔

پس اس مراقبہ کے ساتھ شریعت کے عزائم کی پابندی کرے اور بارگاہِ الٰہی کے بزرگ بندوں کو راضی کرنے کا کام مسلسل جاری رکھے اور یہ بات درباریوں کو راضی کرنے اور بادشاہ کا چہرہ ملاحظہ کرنے کے درجے میں ہے۔ البتہ بادشاہ کو اس جہالت کی وجہ سے جو

بشریت کالازمہ ہے کسی کے حال اورانجام کی خبرنہیں ہوتی، اسی واسطے حاضر باشی اور بادشاہ کی طبیعت کی خوشنودی کے باوجود بغیر حاضرین کی تجویز کے بدظنی، خیانت اور خباثت کے اندیشہ کی وجہ سے کسی شخص کو کوئی منصب نہیں عطا کرتا ہے، یہاں تک کہ ایک زمانہ گزرنے کے بعد اس کی فطری خوبی کا تجربہ ہوجائے اور اس کی طرف سے امن حاصل ہوجائے، بخلاف عالم الغیب کے جس کا علم ہر چھوٹے بڑے کے ظاہر و باطن پر محیط ہے، اور اس بارگاہ میں بندے کی طرف سے صرف وجہ اللہ کا مراقبہ بخوبی انجام پالے اور کما حقہ ادا ہوجائے اور وہ بارگاہِ ایزدی کا مقبول ہوجائے (کیوں کہ بندوں کے باطن کی حقیقت وہاں ظاہر ہے) تو ایک ازلی مقدس نور جو ازل میں ہر مومن کے نصیب میں لکھا گیا ہے، اس کو مرحمت ہوتا ہے اور وہ نور عقل کا تخم ہے اور عقل اس کا درخت ہے اور ایمان اس کا ثمرہ اور آیت "رَبَّـنَا اَتْـمِمْ لَنَا نُوْرَنَا" (۱۸۷) اسی نور کی طرف اشارہ کرتی ہے، پس وجہ اللہ کے اس مراقب کو وہ نور روشن ستارہ کے مانند دور سے نظر آتا ہے اور آہستہ آہستہ نزدیک ہوتا ہے یہاں تک کہ سجدہ گاہ کے مقام پیشانی پر پہنچ کر تمام بدن میں سرایت کر جاتا ہے، اور جیسے آنکھ کی روشنی رنگوں اور منور چیزوں کا ادراک کرتی ہے، اسی طرح سے اس نور کا خاصہ اللہ تعالیٰ کی مرضیات کو معلوم کرنا ہے اور جس طرح سے بہادری جو جنگی امور کو انجام دینے کے لیے پیدا کی گئی ہے اور سخاوت جو نفع رسانی کے لیے وجود میں لائی گئی ہے۔ اسی طرح سے یہ نور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی دریافت کرنے کے لیے ہے، اور رضائے الٰہی معلوم کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ جب وہ کوئی کام کرنے کا ارادہ کرے گا یا کسی چیز کی طرف متوجہ ہوگا تو اس تجلی میں جو اس کے کمال کے محاذی ہے، ایک واضح تغیر رونما ہوگا، اور اس قسم کا تغیر ہوگا کہ اس سے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور ناراضی سمجھی جاسکتی ہے۔

بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کا معاملہ ابھی دل سے تجاوز نہیں کیا ہوا ہوتا ہے وہ اسی راستے سے حق تعالیٰ کی رضامندی اور ناراضی پر مطلع ہوتے ہیں۔ مثلاً جب وہ کوئی معین

کام کرنے کا ارادہ کرتے ہیں تو اگر اس سے رضا متعلق ہوتی ہے تو خوشی و بشاشت، شرح صدر اور اس کام کی طرف وفور رغبت ان کے دل میں پیدا ہوتا ہے اور اگر ناراضی اس سے متعلق ہوتی ہے تو اکتاہٹ، کڑھن اور اس کام سے نفرت ان کے دل میں پیدا ہوتی ہے۔

اور وہ حضرات جن کا حال دل سے آگے بڑھ چکا ہے اور وہ مقامات عالیہ پر پہنچ چکے ہیں وہ حق تعالیٰ کی رضا مندی و ناراضی کو اس تجلی میں تغیرات واقع ہونے کی وجہ سے جو ان کے کمال کے محاذی ہے، معلوم کرتے ہیں۔ اور وہ تغیرات جو تجلیات میں واقع ہوتی ہیں، ان سے اللہ جل شانہ کی ذات پاک، منزہ ومبرا ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ عام آثار جو بے مثل و بے نظیر ذات سے صادر ہوتے ہیں، ان آثار میں سرے سے کوئی تغیر نہیں ہوتا ہے جیسا کہ ''الآن کما کان'' اس کا وصف ہے، اس طرح ان آثار کی نسبت وہ ایک ہی وصف پر ہے ازل سے لے کر ابد تک اس میں تغیر نہیں ہوسکتا ہے، اور رہی بات امور خاص کی نسبت تو تھوڑی تبدیلی ہوتی ہے اور اس تغیر اور عدم تغیر کی مثال سورج ہے، سورج ایک حالت پر اور ایک جگہ ہوتا ہے اور اس کے عام آثار اشیاء کی حسب استعداد بہت مختلف ہوتے ہیں، اور یہ اختلاف سورج کی ذات یا اس کی وضع وجگہ کے اختلاف کا متقاضی نہیں ہوتا ہے۔ اور قیامت کے دن اس کا خاص اثر مطلوب ہوگا اس بنا پر اس کی صورت وجگہ تبدیل ہو جائے گی اور وہ اہل محشر کے سر کے قریب ہو جائے گا۔

ایسے ہی آثار خاصہ کے ظہور کے لیے تغیر وتبدل واقع ہوتا ہے اور یہ تغیر اس کی ذاتِ پاک میں نہیں ہوتا ہے، اس کی شان اس سے بہت بلند ہے، بلکہ اس کی تجلی وظہور کی خاص صورت ہوتی ہے، اس صورت میں تغیر واقع ہوتا ہے اور یہ تغیر ذات میں نہیں ہوتا۔

اس کی مثال انسان سے دی جاسکتی ہے، کیوں کہ صیغہ "من" سے جس چیز کی تعبیر کی جاتی ہے وہ جسم عنصری نہیں ہے، اس لیے کہ مرنے کے بعد جسم موجود ہوتا ہے اور وہ احکام جو انسان پر مرتب ہوتے ہیں وہ سب بدل جاتے ہیں۔ پس وہ حقیقت انسانی جس کی طرف من سے اشارہ

کیا جاتا ہے وہ اس جسم عنصری کے واسطے سے چھپ گئی ہے اور اس نے اس کے ساتھ ایسا اتحاد اور یگانگت پیدا کر لی ہے کہ معاملہ تو جسم کے ساتھ ہوتا ہے اور نسبت اس حقیقت کی طرف کی جاتی ہے مثلاً کہتے ہیں کہ میں زید کے پاس گیا اور اس کے ساتھ بیٹھا اور اس کو ایسا ویسا کیا اور جوں ہی انسان مر گیا، جسم کے اپنے حال پر باقی رہنے کے باوجود احکام مذکورہ میں سے کوئی حکم اس جسم پر نہیں لگایا جا سکتا ہے، کوئی نہیں کہے گا کہ میں زید کے پاس گیا اور اس کے ساتھ بیٹھا۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ کی بے مثل و بے نظیر ذات پاک کسی صورت ولباس میں چھپ کر ظاہر ہوتی ہے، البتہ اس قدر فرق ہے کہ حقیقت انسانی ایک ہی جسم کے ساتھ مقید ہوتی ہے، لہٰذا نہیں کہا جا سکتا ہے کہ وہ دوسرے جسم کے واسطے سے اپنے احکام کا جلوہ بکھیرے، اور اللہ جل شانہ کسی بھی صورت کے ساتھ مقید نہیں ہے، وہ اپنے اطلاق پر باقی ہے، وہ جس شکل میں چاہتا ہے کلام فرماتا ہے اور اسی شکل میں تغیر واقع ہوتا ہے۔ یہاں سے واضح ہو گیا کہ بندہ اپنے خالق کے ساتھ جو اخص الخواص معاملات رکھتا ہے، وہ پیش آتے ہیں، لیکن وہ ذات سے دور ہوتا ہے۔

پس اس با کمال بندہ کو ہر معاملے میں اللہ تعالیٰ کی رضا و ناراضی معلوم ہو جاتی ہے، اور یہ وہم نہ ہو کہ احکامِ شرعیہ بدل جاتے ہیں، کیوں کہ احکامِ شرعیہ تو اسی طرح سے ہیں جیسے شریعت سے ثابت ہیں اور یہ رضا و ناراضی کا معاملہ مباح امور میں پیش آتا ہے مثلاً اس بندہ کو معلوم ہو جائے گا کہ اس وقت فلاں جگہ جانا رضائے الٰہی کا باعث ہوگا اور فلاں جگہ جانا گو شریعت کے رو سے جائز ہو، اس کی ناراضی کا سبب ہوگا، اور اسی قیاس پر ہر معاملے میں اسے بصیرت حاصل ہوگی اور یہ علم و آگہی کوشش و اجتہاد سے نہیں ہے، بلکہ ظاہری آنکھوں سے دیکھنے کے درجے میں ہے۔

اور جب سالک کو یہ کمال حاصل ہو جاتا ہے تو وہ درجۂ مکالمہ پر فائز ہو جاتا ہے اور ایک طرح سے کلیم اللہ ہو جاتا ہے ( گو کلام حقیقی آپس میں نہیں ہوتا ) کیوں کہ اشاروں اور احوال سے مراد و مدعا کو سمجھنا بھی ایک طرح کا کلام ہی ہے، اور کبھی کبھی حقیقی کلام بھی

ہو جاتا ہے، اور وہ کلام کے مدلول کے برعکس مراد کو بھی بھانپ لیتا ہے۔

اور جب یہ بندۂ کامل حق تعالیٰ کی خوشنودی پر مطلع ہو کر اس کو راضی کرنے والا کوئی کام کرے گا اور اس کی کارگزاری منصہ شہود پر آئے گی تو اللہ تعالیٰ اس پر اپنی عنایتوں اور رحمتوں کی بارش کریں گے، اور بارگاہِ ایزدی کے جلیل القدر اشخاص خود بخود اس کے لیے کوشش اور سفارش کرنے والے ہیں۔

اور چوں کہ کسی مفید شخص کو بے کار چھوڑنا خلافِ حکمت ہے، اس لیے کسی خدمت سے اس کی عزت بخشیں گے اور وہ خدمت اس کے حسب حال ہوگی، پھر وہ اسی خدمت پر برقرار رہے گا یا اس اونچے منصب سے ترقی کر کے ایسے منصب پر پہنچ جائے گا جس کے اوپر اس کے لیے کوئی منصب نہیں، اور اس مقام میں اہل ولایت کو نبوت کا پرَتو حاصل ہوتا ہے، اگر وہ ان باتوں کے پہنچانے پر مامور نہ ہوں جو ان پر منکشف ہوتی ہیں، اور اگر وہ ان کے پہنچانے پر مامور ہوں تو پرَتو رسالت انھیں میسر ہوتی ہے اور اگر اس کے ساتھ ساتھ مقابلہ ومخاصمہ کا بھی حکم ہو تو ان پر اولوالعزم رسولوں کا عکس پڑتا ہے۔

اس مقام میں بعضے خلیفۃ اللہ ہوتے ہیں اور بعضے خلیفۃ اللہ نہیں ہوتے ہیں، خلیفۃ اللہ اس کو کہتے ہیں جس کو تمام اہم امور کے فیصلے کے لیے مقرر کر کے نائب کی طرح بنا دیا گیا ہو، اور جو شخص ایسا نہ ہو تو وہ خلیفۃ اللہ نہیں ہے۔ اگر چہ کبھی کبھی وہ کام جو خلیفۃ اللہ کے ہاتھ سے سرانجام پاتے ہیں، دوسرے سے بھی کرا لیتا ہے، لیکن وہ دوسرا خلیفۃ اللہ نہیں ہوتا۔ البتہ خدمت گار ضرور ہوتا ہے۔

اس کی واضح مثال یہ ہے کہ کبھی کبھی بادشاہ وزارت کا کام اپنے خاص لوگوں سے بھی لے لیتا ہے، تو وہ خاص افراد اگرچہ وزارت کا کام انجام دیتے ہیں لیکن وزیر نہیں ہوتے۔

یہ مقام راہِ ولایت کی انتہا ہے، اس کے بعد راہِ ولایت کے لیے کوئی کمال نہیں۔

والله تعالىٰ أعلم.

# باب چہارم

# طریق سلوک راہِ نبوت کا بیان

اس باب میں چھ افادات ہیں:

## پہلا افادہ: توبہ کا بیان

راہِ نبوت کے طالب کو اخلاق و ملکات قلبیہ کی تہذیب اور عبادات شرعیہ کی اس طریقے کے مطابق ادائی کے بعد جیسا کہ باب دوم سے معلوم ہو چکا ہے، پہلی چیز جو لازمی ہے وہ مقام توبہ میں راسخ القدم ہونا ہے، تفصیل اس کی یہ ہے کہ اس طریق کے طالب کو چاہئے کہ منہیات شرعیہ کو خواہ وہ اعتقادات سے ہوں، خواہ اخلاق و ملکات کے جنس سے ہوں، یا عبادات میں افراط و تفریط کے قبیل سے ہوں، کتاب وسنت سے تنقیح و تفتیش کرے، اگر خود کتاب وسنت کا عالم ہے تو خود ورنہ علمائے محدثین سے دریافت کرے، اس کے بعد اللہ تبارک وتعالیٰ کا جو احسان اور اس کی جو تربیت اس ذرّۂ بے مقدار پر مبذول ہے اس پر بار بار غور کرے اور اس کو ذہن نشین کرے، اور اس بے نیاز کی طرف اپنے کمال عجز واحتیاج کو پیش نظر رکھے، اس کے بعد تنہائی میں بیٹھ کر اپنے دل میں سوچے، کہ ایسے محسن حقیقی کی ناخوشی ایسے عاجز بے مقدار کے حق میں کہ سرتاپا احتیاج در احتیاج ہے، کس قدر مذموم و معیوب ہے، اس خیال کو ذہن میں ایسا جاگزیں کرے کہ اس محسن کی ناخوشی کی اہمیت اس کے ایسی ذہن نشین ہو جائے کہ اس کا اگر تصور کرے تو اس کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں، پھر صمیم قلب سے اس کو ایسا قبول کرے کہ تمام منہیات شرعیہ کے تصور سے اس کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں، اور ان ممنوعات کی برائی اس کے دل و دماغ پر طاری ہو جائے اور اس کے دل میں ان منہیات کی طرف سے خوف اور دہشت بیٹھ جائے، یہاں تک کہ جان جانے کو ان منہیات کے صادر ہونے کے مقابلہ میں آسان سمجھے۔

# قرآن کی عظمت

اس کے بعد قرآن مجید کی عظمت کا تصور کرے اور دل سے سوچے کہ یہ اللہ کی صفات ازلیہ میں سے ایک صفت ہے جس کو عالم امکان سے کوئی مناسبت نہ تھی، حضرت حق جل وعلا نے محض اپنی عنایت سے زبان عربی کے لباس میں اس وصف ازلی اور کمال ذاتی کو نازل فرمایا، اور اس کو اپنے اور بندوں کے درمیان واسطہ بنایا، جس طرح کے ایک بادشاہ عظیم القدر اپنی دستار کو ہاتھ میں لے، اس کے ایک کنارے کو اپنے ہاتھ سے تھامے اور دوسرے کنارے کو ایک مفلس و عاجز فقیر بے مایہ کو تھمائے، جو ہرگز کسی التفات شاہانہ کے لائق نہ تھا اور حکم دے کہ جب کبھی تجھ کو ضرورت پیش آئے اس دستار کو حرکت دے کر مجھ کو اپنی ضرورت کی اطلاع دے، میں فورا توجہ کروں گا۔ پس اگر اس فقیر کی حالت پر اچھی طرح سے غور کیا جائے تھوڑی دیر کے لیے قانون ادب سے آدمی ہٹ جائے تو صاف صاف کہا جاسکتا ہے کہ اگرچہ بظاہر فقیر کے ہاتھ میں دستار کا صرف ایک کنارہ ہے لیکن فی الحقیقت اس کے ہاتھ میں خود بادشاہ اور اس کی بادشاہت ہے، غرض اس کلام پاک کی عظمت اس کے ذہن میں ایسی راسخ ہونی چاہئے کہ جب وہ مصحف پر نظر کرے اور اس کلام پاک کے تعلق کا مصحف کے ساتھ لحاظ کرے، اس کی نگاہ اس مصحف کو دیکھنے سے خیرہ اور اس کا سینہ اس کلام کی عظمت سے پاش پاش ہو جائے اور پھر جب وہ دیکھے کہ وہ کلام پاک اس مصحف کے واسطے سے میرے قابو میں ہے جس وقت توجہ کروں بے تکلف اس کو زبان پر جاری کرلوں، اور جس وقت ارادہ کروں بلا جان و مال صرف کئے ہوئے اپنے ہاتھ کو اس تک پہونچادوں اور اس کو اپنے سینے پر رکھ لوں تو ضرور اس کو اس بات کا خیال کر کے اپنی حالت پر تعجب و حیرت ہوگی، جس طرح ایک یاقوت درخشاں ایک مفلس کم مایہ کے ہاتھ لگ جائے، جب وہ اس کو دیکھتا ہے تو نگاہ اس کی چمک سے خیرہ ہوتی ہے، جب اپنے افلاس و کم مائیگی پر نظر ڈالتا ہے تو حیرت میں غرق ہو جاتا ہے۔

## سچی توبہ سلوک راہِ نبوت کا پہلا قدم

جب اس کلام پاک کی عظمت اس کے ذہن میں جم جائے اور اس کلام پاک کے سبب سے بارگاہ الٰہی سے اپنے تعلق وارتباط کی پختگی کو سمجھ لے تو توبہ کا عزم کرے، اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ مبارک دنوں میں کسی دن مصحف پاک کو اپنے ہاتھ میں لے کر کسی تنہا جگہ پر جائے اور خدا کے سامنے زیادہ سے زیادہ الحاح وزاری کرے، اور کہے کہ ''بارخدایا! میں ہر طرح سے عاجز اور تو ہر طرح سے قادر ہے، توبہ کہ راہ نبوت کا پہلا قدم ہے مجھ کو نصیب فرما، میری نالائقی کو نہ دیکھ، اپنی لاانتہا عنایات کو دیکھ، کہ لیاقت بھی تیرے ہی ہاتھ ہے''۔

چوں ساقی شوی درد تنگ ظرفی نمی ماند
بقدر بحر باشد وسعت آغوش ساحلہا (۱۸۸)

اس کے بعد تکفیر سیئات اور توبہ کی حقیقت کے حصول کی نیت سے نہایت خضوع اور توجہِ قلب سے صلاۃ التسبیح پڑھے، اور بیشتر ارکان صلاۃ میں اپنے دل کو تکفیر سیئات کی طلب کی طرف متوجہ رکھے، اس کے بعد حضرت حق کے انعامات اس کی ناخوشی کی بے حد برائی اور منہیات شرعیہ سے کمال تنفر کا خیال کرے، اگر باطن میں یہ حالت ظاہر ہو اور دل و دماغ، فکر وخیال سب پر اس کا اثر نمایاں ہو تو خیر، ورنہ اس کام کو دوسرے روز پر اٹھا رکھے، اور دوبارہ کرے یہاں تک کہ یہ حالت پیدا ہو، اور اس حالت میں کلام مجید کی عظمت اور اپنے اور رب العزت کے درمیان تعلق وارتباط کی پختگی کا لحاظ کرے، جب اس کلام پاک کی عظمت اور اللہ اور اللہ کے بندوں کے درمیان اس کی وساطت سے اس کا سینہ مالامال ہو جائے اور اس کلام پاک کی ملابست سے وہ باغ باغ ہو جائے، ایسی نگاہ جس میں اعلیٰ تعظیم قلبی شامل ہو، مصحف پاک پر ڈالے اور کہے کہ بارخدایا! میں نے تیرے اس کلام پاک کو تیرے حضور اپنا شفیع بنایا اور اس کو وسیلہ پکڑا، اور تیرے اس حبل متین سے اپنے کو مضبوط طریقہ پر باندھا، اس کے بعد فرائض شریعت کی پابندی اور منہیات سے اجتناب کا

مجملاً خیال رکھتے ہوئے یہ طالب جس کے لیے بلا ضرورت رخصتوں سے تمسک بھی منہیات میں سے ہے، توبہ کا عہد و پیمان کرے، اور اس کی صورت یہ ہے کہ جس طرح ایک شخص کسی کام کے کرنے یا کسی چیز سے بچنے کا اپنے طور پر عہد کرتا ہے اور اس معاہدہ کو پختہ کرنے کے لیے محبوب ترین شے کی قسم کا التزام کرتا ہے، مثلاً اگر مومن ہے تو حق تبارک وتعالیٰ کی قسم کھاتا ہے اور اگر اس کے نزدیک محبوب ترین چیز اولاد یا مال یا آبرو یا اپنی جان ہوتی ہے تو اسی کی قسم کھاتا ہے، اگر عاشق ہے تو معشوق کی قسم کھاتا ہے، اس کے مؤکد قسم کھانے سے اس کام کے کرنے یا اس چیز سے بچنے پر اس کو خاص توجہ ہوتی ہے، اس کو عقد یمین کہتے ہیں، اسی طرح قوی توجہ سے کام لے کر قرآن مجید سے توسل کرتے ہوئے اپنی زبان سے کہے

''کہ بار خدایا! تیری عنایت پر بھروسہ کرتے ہوئے شریعت کی پیروی کو اپنے اوپر لازم کرتا ہوں، اور جانب شرع کو نفس و مال، جان وآبرو، فرزند و عیال، استاد و پیر وآقا اور تمام مخلوقات کے جانب پر ترجیح دوں گا۔

بار خدایا! میں محض عاجز ہوں، تیری مہربانی پر بھروسہ کر کے اس عظیم الشان کام کو اپنے ذمہ لیتا ہوں، بس اپنے کرم سے اس معاہدہ کو تکمیل تک پہونچا''۔

اس کے بعد ہمیشہ اس معاہدۂ توبہ کی پابندی کی طرف توجہ ضروری ہے۔

## عہد توبہ کی پابندی اور قرآن سے از حد تعلق پیدا کرنا ضروری ہے

سمجھنا چاہئے کہ میں نے شہنشاہ برحق، قادر مطلق، عالم ظاہر و باطن، شدید العقاب اور سریع الانتقام کے حضور میں یہ معاہدہ کیا ہے، مبادا بال برابر اس سے تجاوز کروں اور عہد شکنی کا داغ ہمیشہ کے لیے اپنی پیشانی پر لگاؤں، جیسے کہ ایک شخص نے کسی بادشاہ عالی شان کی عدالت میں جو صاحب قدرت وانتقام ہے مچلکہ دیا ہو کہ فلاں کام کروں گا اور فلاں کام نہ کروں گا، ضروری ہے کہ اس کو حرکت وسکون، قول وفعل میں اس مچلکہ کا خیال رہے گا، یعنی جب کبھی کسی کام کے کرنے یا کسی بات کے کہنے یا حرکت وسکون کا ارادہ اس کے دل

میں آئے گا تو پہلے وہ اس کو اپنے میزان عقل میں تولے گا، کہ یہ اس نوشتے کے مطابق ہے یا مخالف، اس کے بعد وہ اس ارادہ کو عمل میں لائے گا، نیز اس کو چاہئے کہ قرآن مجید کے ساتھ اپنے دل میں زائد خصوصیت اور قوی مناسبت مستحکم کرے، جیسے کہ ایک طالب علم کو اپنے شیخ کے ساتھ ہوتی ہے۔

مثلاً جو شخص طریقہ قادریہ میں بیعت کا ارادہ رکھتا ہے، اس کو حضرت غوث الاعظم رحمۃ اللہ علیہ سے اعتقاد عظیم ہوتا ہے، اور جب یہ بیعت عمل میں آتی ہے تو اس کو سابق اعتقاد سے زائد مناسبت پیدا ہو جاتی ہے، اور اپنے تئیں آں جناب کے غلاموں کے زمرہ اور آپ کے حلقہ بگوشوں کی جماعت میں شمار کرتا ہے، اسی طرح سے قرآن کی عظمت کا اعتقاد اگر چہ ہر صاحب ایمان پر واجب ہے، لیکن اس طالب کو اس کلام پاک کے ساتھ دوسری ہی مناسبت حاصل ہے، اس کے بعد اسی توبہ کو کسی ایسے بزرگ کے ہاتھ پر جو کتاب وسنت کے اتباع اور بدعت سے اجتناب میں اس زمانہ میں اپنے معاصرین سے ممتاز ہو ظاہر کرے۔ قرآن مجید کو شیخ حقیقی اور اس بزرگ کو شیخ ظاہری سمجھے، اس بناء پر وہ قرآن کی اتباع کو اصل اور اس بزرگ کے اتباع کو فرع سمجھے گا، اور بخوبی ظاہر ہے کہ جب فرع واصل باہم متعارض ہوں گے، فرع درجہ اعتبار سے ساقط ہو جائے گا، یہ مقام توبہ کی صورت ہے، جو اس طریق کے مناسب ہے، اور اس طرح سے معاہدہ توبہ میں بڑے بڑے فوائد ہیں۔

## توبہ کے فوائد

جس میں خاص فائدہ یہ ہے کہ اس سے توبہ میں استقامت حاصل ہوتی ہے تفصیل اس کی یہ ہے کہ تجربہ صحیحہ سے یہ بات پایہ تحقیق کو پہونچ گئی ہے کہ جس وقت کوئی طالب کسی بزرگ کے ہاتھ پر بیعت کرتا ہے، عنایت الٰہی اس بزرگ کی وجاہت کی برکت سے اس طالب کی طرف متوجہ ہوتی ہے اور ارتکاب معاصی کے مواقع اور ملابست منہیات کے مقامات سے انواع واقسام کے لطائف غیبیہ اور حیل قدسیہ کے ذریعہ سے اس کو باز

رکھتی ہے، اور یہ بات دو طرح سے ہوتی ہے ایک اس طرح کہ وہ بزرگ وجاہت عنداللہ کے ساتھ کامل النفس، قوی التاثیر، صاحب کشف صحیح ہو، پس حق جلّ وعلا اس بزرگ کو اس طالب کے مواقع منہیات میں پڑنے سے مطلع کر دیتا ہے اور اس کو معاصی کے ارتکاب سے باز رکھنے کا حکم فرماتا ہے، پس وہ بزرگ کسی تدبیر سے خواہ وہ خواب میں ہو خواہ بیداری میں، اس طالب اور ان قبائح کے درمیان حائل ہو جاتا ہے۔

دوسرے یہ کہ حق جلّ وعلا اپنی عنایت سے جو اس کو اس بزرگ کے حال پر ہوتی ہے غیب الغیب سے کوئی نازک تدبیر بروئے کار لاتا ہے، جو اس طالب کی حفاظت کا ذریعہ بن جاتی ہے اور یہ تدبیر خفی کسی طرح سے اس بزرگ سے منسوب ہو جاتی ہے حالانکہ وہ بزرگ اصلا اس معاملہ سے واقف نہیں ہوتا، بلکہ اس تدبیر کا ظہور اس طرح پر کہ وہ بزرگ سے منسوب ہو جائے محض اس بزرگ کی وجاہت کے اضافہ کے لیے پردہ غیب سے ہوتا ہے، جیسے کہ منقول ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام جب زلیخا کے ساتھ خلوت میں تنہا ہوئے اور وہ عاشقہ تباہ حال حصول وصال کی طامع ہوئی، تو حضرت یعقوب علیہ السلام دانتوں میں انگلی دبائے ہوئے ظاہر ہوئے، اور اس سے تمام معاملہ درہم برہم ہو گیا، حالانکہ حضرت یعقوب علیہ السلام کو اصلاً حضرت یوسف علیہ السلام کے حال کی خبر نہ تھی، حضرت جبریل علیہ السلام حضرت یعقوب علیہ السلام کی صورت میں ظاہر ہوئے تھے، جاننا چاہئے کہ یہ دونوں وجوہ قرآن مجید میں اس طرح پائے جاتے ہیں کہ ممکنات میں سے کسی چیز میں اس طرح متصور نہیں۔

## حقیقت قرآنی

اس لیے کہ حقیقت قرآنی ان امور قدسیہ میں سے ہے جو حقائق امکانیہ میں سے کسی حقیقت میں پائی نہیں جاتی، اس لیے کہ وہ واجب وممکن کے درمیان برزخ کی طرح ہے، اور اس کی وجاہت اللہ تعالیٰ کے یہاں ایسی ہے جس کا کسی کو ادراک ممکن نہیں، چہ جائے کہ اس کا حصول، کیوں کہ یہ کلام منجملہ صفات ازلیہ اور حضرت حق کے کمالات ذاتیہ

کے ہے، اور جو تعلق صفات و ذات کے درمیان ہے وہ ممتنع التصور ہے، پس ضروری ہے کہ حضرت حق کی توجہ اس طالب کی حفاظت کی طرف مکمل ترین طریقے پر ہوگی خواہ پہلے طریقے پر ہو، خواہ دوسرے طریقے پر، یعنی اس طالب کی حفاظت اس طرح ہو کہ اس حقیقت قرآنی کی طرف سے کہ نور مقدس ہے، طالب اور امور منکرہ کے درمیان کسی طریقے پر خواب یا بیداری میں کوئی چیز حائل ہو جائے یا اس طرح کہ حق جلّ وعلا بذات پاک خود ملائکہ عظام یا ارواح مقدسہ کے ذریعے سے قرآن مجید سے توسل کی برکت سے طالب کی حفاظت کرے۔

دوسرا افادہ: ذکر ایمانی اور مراقبۂ صمدیت کا بیان

جب طالبِ راہ نبوت مقام توبہ میں راسخ القدم ہو جائے اس کو لازم ہے کہ قدم ہمت ذکر ایمانی اور مراقبہ صمدیت میں راسخ کرے، ذکر ایمانی کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے قرآن مجید کے معانی لغویہ اور اذکار منقولہ و ادعیہ ماثورہ کی تحقیق کرے، اگر خود فنون عربیہ سے واقف ہے تو خیر، ورنہ اس کو ان فنون کے محققین سے کہ معتبر اور اہل بصیرت ہوں، دریافت کرے، اور معانی لغویہ کے حاصل کرنے میں قدیم عربوں کی زبان کی طرف ہی التفات کرے، اور فنون ادب کے ان متعمقین کی موشگافی سے دھوکہ نہ کھائے، جنہوں نے اظہار فضیلت کے لیے خود کو محققین عربیت قرار دیا ہے، اور مسلمانوں کے ایک جم غفیر کی راہ مقصود ماری ہے، کہ یہ بدعت محض اور عمر کو لہو و لعب میں ضائع کرنا ہے۔ ؎

ترسم نہ رسی بکعبہ اے اعرابی
کیں راہ کہ میروی بترکستان است (۱۸۹)

اس کے بعد اس مطلب کا خلاصہ اور ان مضامین کی تفصیل جیسی کہ باب اوّل میں گزری، ملحوظ رکھے اور اس کو ذہن نشیں کرے اور ان باتوں کا خیال رکھتے ہوئے اذکار و ادعیہ ماثورہ کے ساتھ زبان سے قرآن کی تلاوت مابین الجهر والاخفاء اکثر اوقات

میں شروع کرے، جہر مفرط اور اخفائے مفرط بعض اوقات مفید ہوتا ہے، اور ان کا اعتبار چنداں مفید نہیں، جہر مفرط کی حد اذان وتلبیہ سے سمجھنی چاہیئے اور اخفائے مفرط کی حد یہ ہے کہ آواز کان میں آئے اور اوسط کی حد یہ ہے کہ جیسے لوگ آپس میں اہل ادب وتمیز دار لوگوں کی مجلسوں میں گفتگو کرتے ہیں، یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ ذکر ایمانی سے مقصود محض کثرت ذکر یا مجاہدۂ نفس یا ضبط اوقات نہیں ہے، بلکہ اس سے مقصود اس حالت کا پیدا ہو جانا ہے جس کا ذکر باب اول میں ہو چکا ہے۔ پس جب وہ حالت پائی جائے تو اس کو ذکر ایمانی سمجھنا چاہیئے، لیکن اگر وہ حالت پیدا نہ ہو تو وہ ذکر منجملہ ریاضات نفسانیہ کے ہے، ذکر ایمانی میں اتنی کثرت نہیں کرنی چاہیئے کہ ذاکر کی طبیعت اکتا جائے اور آخر سستی و کاہلی پیدا ہو جائے، تدریجاً طبیعت کو اس کا عادی بنایا جائے۔

## مراقبۂ صمدیت

اس مراقبہ کے اصول کی بنیاد یہ ہے کہ (جیسے باب سوم میں بیان ہوا ہے) اللہ تعالیٰ کے احسانات اور اس قادر مطلق کی عجائبات قدرت کا ملاحظہ کیا جائے، لیکن فرحت و مسرت کا جوش اور اپنے قصور واحتیاج کا احساس اور حضرت حق کی عظمت کا انکشاف اور اس حکیم مطلق کی حکمت کا اذعان جو کہ مراقبۂ صمدیت کا مرکز ہے، ابتداء میں مشترک احسانات اور روزمرہ کی تاثیرات سے نہیں ہوتا، مثلاً بارش کا ہونا، کھیتی کا اگنا، کہ ہر چند عظیم الشان احسانات میں سے ہے، لیکن چوں کہ اس احسان میں تمام افراد نوع انسانی شریک ہیں، اس لئے اس کا خیال کرنے سے ایک عام شخص کو وہ کیفیت جس کا بیان ہو چکا ہے، نہیں پیدا ہوتی، اسی طرح آسمان وزمین کی پیدائش اور اجرام فلکی کا وجود اگرچہ قدرت ظاہرہ کی عظیم ترین نشانیوں اور حکمت باہرہ کے آثار اور عظمت قاہرہ کی علامات میں سے ہے، لیکن چوں کہ یہ چیزیں اکثر انسان کے پیش نظر رہتی ہیں، اس لیے ان چیزوں کو دیکھ کر اس کا ذہن حضرت حق کے کمالات کی طرف منتقل نہیں ہوتا، اس لیے طالب کو چاہیئے کہ وہ مخصوص

احسانات جو اس کے نفس یا اس کے ہم جنسوں پر ہوئے اور وہ عجائبات قدرت جو خلاف عادت ظہور میں آئے اور اسی طرح کی باتیں خیال میں لائے، اور وہ واقعات جو اس طرح کے مضامین پر مشتمل ہوں بار بار گوش ہوش سے سنے، اور بار بار اپنے ذہن میں لائے اور وقتاً فوقتاً اپنے کو اس عظیم بالاستحقاق کے بحر عظمت اور اس منعم علی الاطلاق کے بادیہ انعامات میں متحیر بنائے، کہ سر رشتۂ مراقبہ صمدیت اس کے ہاتھ آئے۔

## مخلوق کے ساتھ حسن سلوک

جب مراقبہ صمدیت جیسے باب اوّل وثالث میں مذکور ہوا، ذہن نشین ہو جائے اس کو ذکر ایمانی کے ساتھ شریک کرے، اگر ممکن ہو تو ذکر ایمانی کے درمیان میں مراقبۂ صمدیت کرے، ورنہ کچھ وقت ذکر میں، کچھ وقت فکر میں صرف کرے، ابتداء میں فکر کو ذکر سے اور مراقبہ صمدیت کو ذکر ایمانی سے اہم سمجھے، کچھ مؤیدات ہیں جن کے سبب سے ذکر و فکر کو رونق حاصل ہوتی ہے اور اس کے آثار قوت وسرعت کے ساتھ ظاہر ہوتے ہیں، ان مؤیدات میں قوی تر اور سب سے بڑھ کر خلق اللہ خصوصا یتیموں، مساکین وفقراء کی خدمت، حاجت مندوں کی حاجت روائی، بیماروں کی خبر گیری اور عاجزوں اور لاچاروں اور ناامیدوں کی کار برآری وامداد ہے، ذکر و فکر پر مداومت کرنے سے سعادت دارین کے خزانوں کی کنجی یعنی حب ایمانی اس کے ہاتھ آ جائے گی، اور اسی محبت کا حاصل ہو جانا ذکر و فکر کی تکمیل کی علامت ہے۔

### تیسرا افادہ: فنائے ارادہ کا بیان

جب حب ایمانی اپنے کمال کو پہونچ جاتی ہے تو طالب کی توجہ کا طائر بلند پرواز اس طریق کی ظاہر ترین علامت اور اس راہ کی بلند ترین چوٹی پر آشیانہ بناتا ہے، یہ فنائے ارادہ ہے جیسا کہ باب اوّل میں مذکور ہوا، اور اسی کمال کا حصول حب ایمانی کی تکمیل کی علامت ہے۔

جاننا چاہئے کہ نفس کو ارادہ سے خالی کر دینا راہ نبوت میں بمنزلہ شغل نفی کے ہے،

راہ ولایت میں یہ دونوں شغل ان دونوں طریق کے اصل الاصول ہیں،تشریح اس کی یہ ہے کہ سلوک راہ نبوت کا کمال شدت انقیاد اور علاقہ عبودیت کے استحکام سے عبارت ہے،اور بخوبی ظاہر ہے کہ اپنے تئیں پتھر لکڑی بنا دینا مولیٰ کے ہاتھ میں اور اپنی لوح طبیعت کو ارادہ کے نقوش اور عزائم سے پاک کر دینا انتہائے انقیاد ہے،اور علاقۂ عبودیت کے استحکام کے مراتب میں قوی ترین مرتبہ ہے۔

## غلام اپنے مالک کا پابند ہے

ہاں،بعض اوقات بعض اطاعت شعار غلام اپنی عقل وتدبیر کی مداخلت سے ایک طرح کی وجاہت حاصل کر لیتے ہیں،لیکن اس وجاہت کا حصول اسی طور پر متصور ہوسکتا ہے کہ غلام اپنے آقا سے زیادہ عاقل ہو،وہ آقا بعض چیزوں کا حکم دے اور یہ خیر خواہ ونصیحت شعار غلام اپنے ذکائے فطرت سے جان جائے کہ اس حکم کی تعمیل سے آقا کے کارخانوں میں سے کوئی کارخانہ برباد ہو جائے گا،پس اگر وہ غلام اس وقت تعمیل حکم پر اکتفاء کرے اور اپنی عقل وسمجھ کو دخل نہ دے،تو وہ ملامت وعتاب سے محفوظ رہے گا اور معذور ہوگا،اور اگر بحکم عقل وفہم اس میں کچھ مداخلت کرے گا،اور اس مداخلت کے سبب سے آقا کے کاموں میں کوئی کام نہیں بگڑے گا،پس اگرچہ شرعاً مستحق عتاب وملامت ہوگا لیکن آقا کے ساتھ اپنی خیر خواہی کی بدولت اپنے آقا کے یہاں مزید وجاہت حاصل کرے گا۔

لیکن جب بندگی کا یہ معاملہ ایک نادان وجاہل بندہ اور ایسے آقا کے درمیان ہو جو حکیم علی الاطلاق اور ظاہر و پوشیدہ کا جاننے والا ہے تو وہاں سوائے اطاعت اور تعمیل حکم کے کوئی دوسرا طریقہ اختیار کرنا اپنے تئیں ہلاکت ونافرمانی میں مبتلا کرنا ہے۔

## جاہت کو فنا کرنا مقصود ہے

یہاں ایک نکتہ ہے جس کا جاننا اس موقع پر ضروری ہے اور وہ ارادہ سے طبیعت کو

پاک کرنے کے اقسام ہیں، پس جاننا چاہئے کہ اس کی تین قسمیں ہیں۔

پہلی قسم جو سالکین راہ ولایت کا مقصود ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ خواہش وارادہ یکسر فنا ہو جائے، تشریح اس کی یہ ہے کہ مقام فنا میں کمال رسوخ کی وجہ سے تمام اشیاء کی رغبت و خواہش باطل ہو جاتی ہے اور توحید افعالی کے انکشاف کے سبب سے عزم وارادہ کی بیخ کنی ہو جاتی ہے، پس اس مقام کے لوگ خود کو دست تقدیر میں لکڑی یا پتھر سمجھتے ہیں اور جمادات کی طرح از خود رفتہ وخود فراموش ہو جاتے ہیں۔

دوسری قسم جو سالکین مبادی راہ نبوت کا حصہ ہے، یہ اپنے ارادہ کو حق تعالیٰ کے ارادہ کے تابع کر دینے سے عبارت ہے۔ تشریح اس کی یہ ہے کہ وہ اقتضائے رغبت اور خواہش اور شہوت سے خالی نہیں ہوتے اور ان کا عزم وارادہ بالکل فنا نہیں ہو جاتا، بلکہ امور مرغوبہ کی رغبت اور امور مکروہہ سے نفرت پوری طرح موجود ہوتی ہے، لیکن رضائے مولیٰ کی طلب میں اس اقتضاء ورغبت اور کراہت ونفرت پر اپنے مولیٰ کی اجازت کے بغیر عمل نہیں کرتے، اور اپنے ارادہ کو اپنی طبیعت کے اقتضاء کے موافق استعمال نہیں کرتے، اور اس کو محض اپنے مولیٰ کی رضاء کی طلب میں اختیار کرتے ہیں۔

تیسری قسم ان لوگوں کی ہے جو راہ نبوت کے مناصب عالیہ پر فائز ہو چکے ہیں، وہ یہ ہے کہ وہ اپنے ارادہ کو اپنے مولیٰ کے حکم کے انتظار میں معطل کر دیتے ہیں، تشریح اس کی یہ ہے کہ چوں کہ اس راہ کے مناصب عالیہ پر پہونچنے والوں کو رحمت ربانی اور حکمت یزدانی کا انکشاف ہوتا ہے، اور وہ دل سے سمجھتے ہیں کہ جو بھی انسب اور اولیٰ ہوگا حکمت الٰہی اسی کا تقاضہ کرے گی، اور کسی انسب و اولیٰ کام کو وہ حکمت نظر انداز نہیں کرے گی، ہم جیسے مطیع غلاموں کو رحمت الٰہی مہمل و معطل نہ چھوڑے گی، بلکہ ہم غلاموں کے حق میں جو بھی انسب و اولیٰ ہوگا اسی کا ہم سے کام لے گی اور اسی کا ہم کو حکم دے گی، اس لیے اپنی عقل اور ارادوں کو خدائی کارخانے میں دخل دینا محض لغو و بیکار ہے، پس ہر وہ شخص جو اس جیسے حکیم ورحیم وعلیم

آقا کے غلاموں کے زمرہ میں اپنے کو منسلک کردے اس کا کام یہی ہے کہ اس کے کارخانہ میں اپنی عقل اور ارادہ کو دخل نہ دے، بلکہ اپنی نظر اپنے آقا کے چہرہ پر رکھے، اس کے حکم کا منتظر رہے اور کسی خدمت معینہ کو اپنے آقا کی خدمات میں سے لازم اور اپنا شعار نہ سمجھے، بلکہ خدمت گار کی طرح دوام حضوری اور ملازمت کو اپنا شعار بنائے اور اپنے آقا کے اوضاع واطوار سے اس کی مرضی سمجھ کر اس کی نگاہ کے روبرو رہے، اور ہمیشہ اس کے احکام کا منتظر رہے، تاکہ آقا کی جانب سے جو حکم صادر ہو اس کی بجا آوری کے لیے وہ کمر بستہ ہو۔

## چوتھا افادہ: مراقبۂ عظمت کا بیان

جب فنائے ارادہ کمال کو پہنچ جائے اور اس کے کمال کی علامت یہ ہے کہ طالب محدثین وشہداء کے زمرہ میں داخل ہوجائے تو مراقبۂ عظمت شروع کرے، اس کی تشریح یہ ہے کہ جس طرح سے سالکین راہ ولایت پہلے ملکۂ یادداشت یعنی حضرت حق کی طرف دوام توجہ حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اور جب یہ ملکۂ یادداشت طبیعت کی گہرائی میں جم جاتا ہے تو اس کو کسی صفت کے ساتھ ملاتے ہیں، مثلا تمام کائنات کا احاطہ یا مظاہر متعددہ میں ظہور یا کثرت کونیہ کا صدور اس ذات منبع البرکات سے یا قرب ومعیت وجودیہ اس طالب کے ساتھ۔

## معیت الٰہی کا تصور

اسی طرح اس راہ نبوت کے طالب کو چاہئے کہ حصول ملکۂ یادداشت کے بعد صفت سلطنت وحکومت کو ملائے اور مضمون ''لَهُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ''(۱۹۰) ''وَلَهُ مَا سَكَنَ فِي اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ'' (۱۹۱)''وَهُوَ اللّٰهُ فِي السَّمَاوَاتِ وَفِي الْأَرْضِ يَعْلَمُ سِرَّكُمْ وَجَهْرَكُمْ'' (۱۹۲) کالحاظ کرے، اور معیت وقرب علمی کو پیش نظر رکھے اور اس کی بساط سلطنت وحکومت کا آسمان وزمین، بحر وبر، آبادی اور ویرانی، بسیط ومرکب، اپنے اندرو باہر پر پھیلا ہوا خیال کرے، پس جو حرکت وسکون اس سے یا دوسرے سے صادر ہوتا ہے اس کو دیکھتے ہی دل سے یہ یقین کرے کہ حق تبارک وتعالیٰ اس کو جانتا اور دیکھتا ہے اور اپنے

کو خلوت و جلوت میں اور تمام حالات میں تنہا نہ سمجھے، بلکہ یہ سمجھے کہ اس کی حالت اس شخص کی حالت کی طرح ہے جس کے ساتھ ہمیشہ ایک شخص رہتا ہے اور اس شخص کو اس سے تعلق پدری بھی ہے اور تعلق تربیت بھی، تعلق دوستی بھی ہے اور تعلق سلطنت بھی، تعلق آقائی بھی ہے اور تعلق استادی بھی، تعلق پیری بھی ہے اور تعلق محبت و محبوبیت بھی ہے، اور محض قرب وجودی پر اکتفا نہ کرے یعنی محض اسی قدر نہ جانے کہ وہ شخص میرے ہمراہ ہے بلکہ یہ بھی جانے کہ وہ شخص دیکھتا اور سنتا اور مطیع کی اطاعت اور مخلص کے اخلاص کو قبول فرماتا اور اس پر تحسین و آفریں کرتا ہے، اور عقبٰی میں ثواب عظیم اور دنیا میں قرب و وجاہت عطا فرماتا ہے اور اس کو اپنے مخصوصین کے زمرہ میں شمار کرتا ہے اور نافرمان کی نافرمانی کو رد کر دیتا ہے اور اس پر لعنت و نفریں بھیجتا ہے، اور عقبٰی میں سخت سزا اور دنیا میں اس کو بُعد و ذلت نصیب کرتا ہے اور اس کو اپنے ناشکروں میں شمار کرتا ہے، بڑے گناہوں کو معمولی طاعات سے جن میں کمال اخلاص اور شدت انقیاد شامل ہوتا ہے معاف فرما دیتا ہے، اور جلیل القدر طاعات کو اس ادنیٰ معصیت سے جس میں خبث نفس اور مخالفت حق شامل ہو، اکارت کر دیتا ہے۔ بالجملہ نکتہ گیری اور نکتہ نوازی اس کی شان ہے، تفصیلاً اس مضمون کو ذہن میں رکھنا ضروری نہیں، حاشا وکلا تصورات عقلیہ سے کیا فائدہ؟ مقصود یہ ہے کہ اس طالب کا حال تمام احوال میں اس شخص کا سا ہونا چاہئے جو ایسے شخص کے ہمیشہ ہمراہ رہتا ہے جس کی صفات اوپر گزر چکی ہیں۔

## اللہ کا ہاتھ ہم سب کو تھامے ہوئے ہے

اسی طرح حضرت حق کی بساط سلطنت کے تمام کائنات پر پھیلے ہونے سے مقصود صرف یہ نہیں ہے کہ اس کو صرف ذہن میں تصور کر کے اذعان عقلی کرے، بلکہ مقصود یہ ہے کہ جس طرح آفتاب ریگستان کے ہر ہر ذرہ اور بحر زخار کے ہر ہر موج میں چمکتا ہے اور دیکھنے والے کو ایک دریائے نور متلاطم الامواج نظر آتا ہے، اسی طرح فیض رحمانی کی تدبیر ہے جو تمام کائنات پر محیط ہے، دنیا کے ذرات میں سے ہر ذرہ اس سے جلوہ گر ہوتا ہے اور

علویات وسفلیات میں مجموعاً وفرداً فرداً ایک ہی تاثیر ظاہر ہوتی ہے اور زمین کے جس حصہ کے اوپر اور آسمان کے جس حصہ کے نیچے وہ کھڑا ہوتا ہے، اس کی حالت اس شخص کی حالت کی طرح ہوتی ہے کہ ایک شخص اس کا ہاتھ پکڑ کر ایک دریائے زخار کے سامنے پانی میں لٹکا دیتا ہے جب وہ شخص دریا کو دیکھتا ہے اس کو قابل عبور نہیں پاتا، جب وہ ہوا کو دیکھتا ہے اس کو بھی اپنے بس سے باہر پاتا ہے، اور آسمان کو دیکھتا ہے تو اس تک پہونچنا بھی محال نظر آتا ہے، آخر کار اس آدمی کا ہاتھ ہی اس کو پناہ کی جگہ معلوم ہوتا ہے، پس وہ یقین کے ساتھ سمجھنے لگتا ہے کہ جب تک یہ شخص میرا ہاتھ پکڑے ہوئے ہے مجھے نہ بحر زخار کی موجوں کا ڈر ہے نہ ہوا کے جھونکوں کا، اور اگر وہ شخص میرا ہاتھ چھوڑ دے تو کہیں میرا ٹھکانہ نہیں، جس موج پر میں گروں گا وہ مجھے غرق کر دے گی اس میں کسی موج کا امتیاز نہیں، اس خیال کے پختہ ہو جانے سے اس کا یہ حال ہو جاتا ہے کہ شیرژیاں یا پیل (فیل) مست اگر اس پر حملہ کرے یا کوئی دشمن اس کے حلق پر شمشیر برہنہ رکھ دے، اس حالت میں بھی وہ طالب دل سے سمجھے گا کہ جب تک حضرت حق اپنا دست حفاظت مجھ سے نہ اٹھائیں گے مجھے ذرہ برابر بھی کوئی نقصان نہیں پہونچے گا، خواہ کتنا ہی یقینی خطرہ ہو، اور اگر وہ حافظ مطلق دست حفاظت میرے سر سے اٹھالے تو ایک حقیر چیونٹی اور ایک ذلیل مکھی بھی میرا کام تمام کر سکتی ہے۔

اسی لیے اس طریقہ کے پیشواؤں نے جو اس مراقبہ کے خلاصہ پر فائز ہوئے، جیسے انبیائے کرام اور ان کے وارث، جبار بادشاہوں کا اپنے اعوان وانصار کی قلت کے باوجود مقابلہ کیا، جیسے کہ حضرت موسیٰؑ اور فرعون کا قصہ مشہور ہے، یہ نہ سمجھنا کہ اس طالب پر کوئی خوف یا اطمینان مہلکات کے اسباب کے قرب یا بعد کی وجہ سے اصلا طاری نہیں ہوتا، کیوں کہ یہ بات لوازم بشریت سے بالکل نکل جانے سے ہوسکتی ہے، اور لوازم بشریت سے انسلاخ اس دنیا میں خصوصاً طالبین راہ نبوت (جس کا خلاصہ فطرت انسانی کی تکمیل ہے) کے حق میں متصور نہیں، بلکہ مقصود یہ ہے کہ وہ خوف یا اطمینان جس کا تعلق قلب سے

ہے اور جو عقل و ہوش کو پراگندہ کر دیتا ہے، ہلاکت کے اسباب کے قرب یا بعد سے اس طالب پر طاری نہیں ہوتا، بخلاف طبیعی خوف واطمینان کے، جو پیش آسکتا ہے اور آتا ہے۔

## خوف قلبی اور خوف طبعی

اس خوف قلبی اور خوف طبیعی کا نازک فرق بغیر مثال کے سمجھ میں نہیں آسکتا، اس کی مثال یہ ہے کہ ایک شخص ایک لکڑی ہاتھ میں لیتا ہے اور اس لکڑی کو اپنے بیٹے کی آنکھ کی طرف کرتا ہے اور کہتا ہے کہ میں تیری آنکھ ہرگز نہ پھوڑوں گا، مجھے محض امتحان مقصود ہے تو جب تک کہ وہ لکڑی آنکھ سے دور رہے گی لڑکے کی حالت میں کچھ تغیر نہ ہوگا اور جب وہ لکڑی آنکھ کے قریب آئے گی تو کچھ نہ کچھ اس کی حالت میں تغیر ہوگا، اور اس کی آنکھیں اضطراراً بند ہو ہو جائیں گی، حالانکہ اس کے دل میں لکڑی کے دور رہنے یا قریب آنے میں کوئی فرق نہیں، اس لیے کہ وہ قطعی طور پر جانتا ہے کہ اس لکڑی کا نقصان خواہ وہ دور ہو یا قریب، ہرگز مجھ کو نہیں پہونچے گا، لہذا اضطراب قلب اور تشویش اس کو پیدا نہیں ہوگی، اور اندھے ہو جانے کا خیال بھی اس کو نہ آئے گا، مگر جب لکڑی قریب آئے گی تو اس کی آنکھ خود بخود بند ہو جائے گی، اسی طرح سے یہ طالب صادق تمام کائنات کو حضرت حق کے ہاتھ میں لکڑی یا پتھر کی طرح سمجھتا ہے اور تمام موجودات کو اس کی عظمت کے سامنے سرنگوں جانتا ہے، مگر امور ضارہ ونافعہ کے قرب وبُعد کی وجہ سے اس کو طبعی خوف یا اطمینان پیدا ہوتا ہے، کیا تم نے قرآن مجید میں حضرت زکریا علیہ السلام کا قصہ نہیں پڑھا کہ آں جناب علیہ السلام نے اپنی کبرسنی اور اہلیہ کی عقم کے باوجود جناب واہب العطیات سے فرزند سعادت مند کی درخواست کی، اور اثنائے طلب میں آں جناب علیہ السلام کو ان موانع کے باوجود فرزند عطا ہونے میں کوئی استبعاد نہیں ہوا، ورنہ یہ دعا اس طرح دل سے نہ نکلتی، لیکن جس وقت غیب سے فرزند کی بشارت پہونچی آپ کی زبان سے کلمۂ استبعاد صادر ہوا، "أَنّٰى يَكُونُ لِي غُلَامٌ وَكَانَتِ امْرَأَتِي عَاقِراً وَقَدْ بَلَغْتُ مِنَ الْكِبَرِ عِتِيّاً" (۱۹۳)۔

## پانچواں افادہ: مراقبۂ الوہیت کا بیان

جب مراقبۂ عظمت اپنے کمال کو پہونچ جائے اور اس کے کمال کی علامت یہ ہے کہ روح توکل جس کا باب اوّل میں ذکر ہو چکا ہے حاصل ہو جائے، اور بعض ارباب کمال اس مقام میں اہل خدمات کے زمرے میں بھی داخل ہو جاتے ہیں، تو مراقبۂ الوہیت شروع کرے۔

## اخلاق الٰہی کا پرتو

### شان حلم وعفو

تشریح اس کی یہ ہے کہ حق تبارک وتعالیٰ کی بیشمار شانیں ہیں، منجملہ ان کے ایک شان حلم بھی ہے کہ باوجود مخالفین کی شدت مخالفت کے ان کے مواخذہ میں تعجیل نہیں فرماتا، انھیں میں سے ایک شان عفو ہے کہ ہر چند نافرمان بدترین برائیاں اور بدترین نافرمانیاں کرتے ہیں، لیکن جس وقت وہ اس کی چوکھٹ پر جبین نیاز رکھ دیتے ہیں اور اخلاص کے ساتھ توبہ کرتے ہیں، ضرور وہ رحیم مطلق اس کے جرائم سے درگزر فرماتا ہے، اور اپنے دامن رحمت میں بکمال عنایت و مہربانی اس تائب کی پرورش کرتا ہے، اور اس جرم قبیح کو نسیاً منسیا کر دیتا ہے، اور تعذیب کو تنعیم کے ساتھ بدل دیتا ہے۔

## فیض عمومی

اسی طرح منجملہ ان کے ایک شان فیض عمومی ہے، جیسے بارش کا نازل کرنا، کھیتی پیدا کرنا، اور اسی طرح کہ کامل و ناقص، فرماں بردار و نافرمان، مکلّف و غیر مکلّف اس میں شریک ہوتے ہیں، اور دریائے رحمت سے یکساں سیراب ہوتے ہیں "وَرَحْمَتِیْ وَسِعَتْ کُلَّ شَیْءٍ" (۱۹۴) میں اسی طرف اشارہ ہے۔

## شان وسعت

اور انھیں میں سے ایک شان وسعت ہے کہ انسان کے نفس کاملہ میں وسعت

حوصلہ اس کا نمونہ ہے۔ اس کی تشریح یہ ہے کہ جس طرح کہ بعض مکمل بشری نفوس فراخی سینہ میں اعلیٰ مرتبہ میں ہوتے ہیں کہ مختلف امور کے ہجوم، مختلف معاملات، متعدد کارخانوں سے دل تنگ اور پراگندہ خاطر نہیں ہوتے، بلکہ ہر معاملہ پر توجہ مبذول رکھتے ہیں، اور ہر کام کو بحسن وخوبی انجام دیتے ہیں، اور ہر کارخانہ کو جیسا کہ اس کے لائق ہے چلاتے ہیں، نہ اتنی زیادتی کرتے ہیں کہ ایک ہی کارخانہ میں محو ہو جائیں اور دوسرے کارخانہ کو تباہ کر دیں، یا اس کارخانہ کے لوگوں کو اتنا تسلط دے دیں کہ دوسرے کارخانہ والے رعایا کی طرح ان کے ہاتھوں میں مجبور ہو جائیں اور ان کو بھول جائیں، اور نہ اتنی کمی کرتے ہیں کہ وہ کارخانہ بے رونق ہو جائے، اور اس کے متعلقین چادر مذلت اوڑھ کر زاویہ خمول اور تعطیل میں بیٹھ رہیں، اور اسی طرح لوگوں سے ملاقات کرنے میں بڑی وسعت رکھتے ہیں، مختلف الاستعداد، مختلف الطباع، متغائر الحاجات والأغراض اشخاص میں سے ہر ایک کے ساتھ اس طرح سے پیش آتے ہیں جیسے اس کے لائق ہوتا ہے، اور اس سے ایسا معاملہ کرتے ہیں جو اس کے پیمانۂ استعداد کے مطابق ہوتا ہے، اور اس کے ذہن میں بیٹھ جاتا ہے کہ جو تعلق اور خصوصیت مجھ سے ہے وہ ایسے شخص سے بھی نہیں ہے جو باعتبار خدمت ومرتبت کے مجھ سے ارفع واعلیٰ ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ وسعت حوصلہ کے مطلب کا اچھی طرح تصور کرنا چاہئے، اس کے بعد سمجھنا چاہئے کہ جو فرق خدائی کارخانہ اور ان نفوس کاملہ کے کارخانہ میں ہے، وہی فرق وسعت الٰہی اور ان اکابر کے وسعت حوصلہ میں ہے، جو شخص وسعت الٰہی کا مطلب اچھی طرح سمجھ لے وہ جس قدر رنگا رنگ کارخانوں اور گوناگوں معاملات پر نظر کرے گا، اسی قدر وسعت الٰہی کا پھیلاؤ اس کے ذہن نشین ہوگا۔

## شانِ بے نیازی

ان میں سے ایک شان دشمنوں کی دشمنی سے بے پرواہی بھی ہے، اس لیے کہ

حضرت حق کے یہ دشمن اور اس جواد مطلق کے یہ ناشکرے واحسان فراموش اس منعم حقیقی سے ضد کرنے میں اور اس مالک تحقیقی کے احکام کی مخالفت، شریعتوں سے مقابلہ اور انبیاء کی تحقیر کرنے میں کیا کیا کوششیں نہیں کرتے، لیکن وہ منبع جودو کرم اپنی سخاوت وفیض کا دروازہ ان بدبختوں پر بند نہیں کرتا، اور اپنی حمایت و پرورش کے دامن سے ان کو نہیں نکالتا، بلکہ اگر بطریق تادیب ایک طریقہ سے ان سے مواخذہ فرماتا ہے، تو ہزاروں طریقوں سے ان پر پے در پے نعمتیں نازل فرماتا ہے۔

## شفقت کی مثال

مختصر یہ کہ اس دنیا میں اس کی داروگیر وسرزنش بھی اکثر اوقات ایک مشفق باپ کی اس تادیب کی طرح ہوتی ہے، جو وہ اپنے نافرمان لڑکے کی کرتا ہے کہ اگر چہ وہ شفیق باپ انتظام وتربیت کے لیے نافرمان لڑکے کی گوش مالی کرتا ہے، لیکن عین اس سرزنش اور تادیب میں خیرخواہی وشفقت پدری پوشیدہ ہوتی ہے، وہ اس کو بالکل برباد نہیں کردیتا، اگر چہ یہ نفس تادیب خود شفقت وتربیت کی ایک قسم ہے، لیکن اس مقام پر مقصد یہ ہے کہ یہ تادیب وہ اس طرح سے نہیں کرتا کہ وہ نافرمان لڑکا برباد ہوجائے، بلکہ ہر داروگیر اور ہر سرزنش میں اس کی نیت اچھی ہوتی ہے۔

اگر وہ ناشکرا اس مواخذہ سے کسی طرح بچ جائے اور اپنی ناشکری پر نادم ہو تو ہلاکت سے اس کو راہ نجات مل سکتی ہے۔ ان تمام شانوں کی اصل علو ذاتی ہے کہ اس کا پرتو نفوس کاملہ پر پڑتا ہے اور علو ہمت کہلاتا ہے، کیوں کہ جو شخص علو ذاتی کے اعلیٰ مرتبہ میں ہوتا ہے، وہ دنیا کے ان ذلیل امور کو اس لائق نہیں سمجھتا کہ ان افکار کے ہجوم سے اس کے دل میں تشویش پیدا ہو، یا اس کے معاملات میں تزلزل نمایاں ہو، اس لیے کمینوں کے سب وشتم سے عالی ہمت بادشاہوں کے دل میں انتقام کا کوئی جذبہ پیدا نہیں ہوتا، اور وہ اس کو خس و

خاشاک کا غبار سمجھتے ہیں، اور ان کو قابل انتقام نہیں خیال کرتے، مختصراً اس علو ذاتی الٰہی کو باعتبار انشراح کے ان شانوں سے تعبیر کیا جاسکتا ہے جن کا اوپر ذکر ہوا، اور عالم امکان میں قانون حکمت کے اقتضاء سے ان شانوں کے آثار کے ظہور کے اعتبار سے اس کو الوہیت کہا جاسکتا ہے، الوہیت کو ایک درخت کی طرح سمجھنا چاہیئے، اور علو ذاتی کو بمنزلۂ تخم کے اور ان ذکر کی ہوئی شانوں کو بمنزلۂ شاخ و برگ کے اور عالم امکان میں ان کے آثار کے ظہور کو بمنزلۂ ثمرہ کے سمجھنا چاہیئے۔

## طالب راہ نبوت کے اخلاق

پس طالب راہ نبوت کو مراقبۂ عظمت کے آثار کے ظاہر ہونے کے بعد لازم ہے کہ مراقبۂ الوہیت شروع کرے، مراقبۂ الوہیت سے مقصود محض الوہیت کے مطلب کا تصور نہیں ہے، بلکہ مقصود یہ ہے کہ اس کمال کا تصور کرکے اپنے نفس کے آئینہ میں اس کے انعکاس کے طالب بنیں، کہ "تخلقوا بأخلاق اللّٰہ" (۱۹۵) میں اسی طرف اشارہ ہے، اور جب کبھی معاملات مذکورہ میں سے کوئی معاملہ پیش آئے، مثلاً کسی جماعت کی سرداری ملے، یا مختلف ومتفرق معاملات اس پر ہجوم کریں، یا کوئی مخالف اس کی مخالفت کرے، الوہیت کا مطلب یاد کرکے اس شان الٰہی کے مطابق محض تشبیہاً باللہ عمل کرے۔

مختصراً اس کا حال اس شخص کا سا ہونا چاہیئے کہ نشست و برخاست، جامہ ولباس اور لوگوں کے ساتھ معاملہ کرنے میں محبوب کی وضع اس کے دل و دماغ میں بس گئی ہے اور تمام جسم میں رچ گئی ہے، جب وہ بات کرنے لگتا ہے تو اسی کی ڈھب آجاتی ہے، جب وہ چلتا ہے تو چلنے میں بھی محبوب کی شباہت آجاتی ہے، اسی طرح سے اخلاق الٰہی مراقبہ کرنے والے کی طبیعت کی گہرائی میں بیٹھ جانے چاہئیں۔

### فائدہ: مراقبوں کے اثرات کا بیان

جاننا چاہیئے کہ مراقبوں کے آثار تین طرح ظاہر ہوتے ہیں:

۱۔ ایک تو یہ کہ طالب جس چیز کا مراقبہ کرتا ہے اس کے لوازم اس کی طبیعت میں ظاہر ہو جاتے ہیں، جیسے کہ ایک کریم النفس شخص غذائے لطیف کھا رہا ہو اور ایک مفلس بھوک کا مارا اس پر نظر لگائے ہوئے ہو، تو ضروری ہے کہ وہ کریم النفس اس کھانے کا ایک لقمہ اس مفلس کو بھی دے دے گا، اسی طرح جب طالب حق اپنے دیدۂ بصیرت کو فرط طلب اور کمال خواہش کے ساتھ خداوندی شانوں میں سے کسی شان مثلاً عظمت یا الوہیت یا معاملات ربانیہ میں سے کسی معاملہ پر لگا دے گا، تو وہ کریم مطلق ان شانوں کے لوازم اور اس معاملہ کے آثار میں سے کچھ نہ کچھ طالب کی استعداد کے مطابق اس کی طبیعت کے اس آئینہ میں جو نامرضیات حق کے زنگ سے صاف ہے، منعکس کر دے گا۔ مثلاً:

☆ اگر اس نے مراقبۂ عظمت کیا ہے تو اس کو ملأ اعلیٰ میں کچھ وجاہت اور بعض کائنات پر کچھ اقتدار و حکومت حاصل ہو جائے گی۔

☆ اگر اس نے مراقبہ الوہیت کیا ہے تو اس کو فراخ حوصلگی اور برائی کا بدلہ بھلائی سے دینے کی طاقت اور عفو و حلم کا ملکہ نصیب ہو جائے گا۔

☆ اگر اس نے مراقبہ خلت کیا ہے تو خلت (محبت و دوستی) کے معاملات میں سے بعض معاملات مثلاً مکالمہ و سرگوشی ظاہر ہو گی۔

۲۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اس طالب کے لیے ملأ اعلیٰ، ملأ سافل، ارواح مقدسہ اور صلحائے بنی آدم کے قلوب میں قبولیت پیدا ہو جاتی ہے، اس کی تفصیل باب اوّل میں حب ایمانی کے ثمرات کے ذکر میں گزر چکی ہے۔

۳۔ تیسرا طریقہ نوافل و عطایا کا ہے، جیسے کہ ایک مفلس لذیذ کھانوں اور مزیدار پھلوں اور میوؤں اور نفیس لباسوں پر نظر لگائے رہتا ہے، اور انھیں چیزوں کے حصول کا متوقع رہتا ہے، اور ان اشیاء کا مالک کچھ ان میں سے بھی دیدیتا ہے اور کوئی دوسری چیز جو ان چیزوں میں سے نہیں ہوتی، لیکن اس مفلس کے مناسب حال ہوتی ہے اس کو ارزانی

فرماتا ہے، مثلاً اگر اس شخص کی کھانے ہی میں نیت لگی ہے تو اس کو کھانے کا بھی ایک لقمہ دے دیتا ہے، اور اس کے سوا کچھ نقد بھی دیتا ہے، تاکہ وہ اپنی ضرورتیں پوری کرے۔

بعض اوقات ایسا اتفاق ہوتا ہے کہ وہ شخص اس مطلوب شے کی لیاقت نہیں رکھتا، مثلا بیمار ہے اور لذیذ فواکہ کی خواہش رکھتا ہے، پس ضروری ہے کہ ان فواکہ کا مالک اس کو بجائے فواکہ کے کوئی کلاہ یا قبا دے کر تسلی دے، ان عطیات کو جن کے حصول کی توقع نہیں ہوتی ہم نوافل عطایا سے تعبیر کرتے ہیں، اسی طرح سے جب طالب حق خدا کی شانوں میں سے کسی شان یا اس کے معاملات میں سے کسی معاملہ کا مراقبہ کرتا ہے، تو نوافل عطایا سے مشرف ہوتا ہے اور اس مراقبہ کے ثمرات کے حصول کے ساتھ یا بغیر ان کے حصول کے ان نوافل عطایا کا کسی قاعدہ یا قانون عقل کے جس کا عقول بشریہ ادراک کر سکیں مطابق ہونا ضروری نہیں، اس لیے کہ عطیۂ نافلہ کا تعین اس مراقبہ یا اس کے آثار کے مناسب نہیں ہوتا، بلکہ طالب کی استعداد کے مطابق ہوتا ہے، مثلا کوئی شخص فطرتاً ذکی العقل پیدا ہوا ہے، اور راہ نبوت کی طلب کے اثناء میں اس نے مراقبۂ عظمت کی مزاولت کی ہے بس اس کے آثار مرتب ہوں یا نہ ہوں، لیکن ذکاوت ذہن کی ترقی اور علوم مرضیۂ حق میں فہم کی قوت اس کو حاصل ہوگی۔

اسی طرح اگر طہارت فطرت پر پیدا ہوا ہے تو عبادات کی توفیق اور تقویٰ کا ملکہ اس کو حاصل ہوگا، اگرچہ یہ امور مراقبۂ عظمت کے آثار سے کچھ مناسبت نہیں رکھتے، اسی وجہ سے راہ حق کے اکثر طالبین اس طریق کے اعمال و اشغال کی مزاولت کرتے ہیں، اور چوں کہ اس کے آثار کما حقہ اپنے میں نہیں دیکھتے، اس لیے صدائے محرومی بلند کرتے ہیں اور یاس و ناامیدی کے کلمات ان سے صادر ہوتے ہیں، حالانکہ وہ نہیں جانتے کہ شاید انھیں اعمال و اشغال کی برکت سے کوئی دوسری بات امور مقبولہ عنداللہ میں سے جو ان اعمال و اشغال کی جنس میں سے نہیں ہے ان کو حاصل ہوئی ہو، اور اس کے اور ان اعمال و اشغال کے درمیان عدم مناسبت کی وجہ سے ان کے ذہن میں وہ بات نہ آتی ہو۔

اسی طرح سے اس راہ کے بعض طالب جو گذشتہ اہل کمال بزرگوں کے واقعات سنتے ہیں کہ فلاں بزرگ کو فلاں فلاں شغل وعمل سے فلاں کمال حاصل ہوا تھا، وہ خود اس شغل وعمل کو کرتے ہیں لیکن اس کمال کا کوئی اثر نہیں پاتے، وہ حیران ہوتے ہیں، کبھی ان واقعات کی تکذیب کی جراءت کرتے ہیں، کبھی سمجھتے ہیں کہ اس عمل کے شروط وارکان میں کچھ کمی رہ گئی ہے، یا بے قاعدگی ہوگئی ہے، شاید وہ عمل دوسرا تھا اور یہ دوسرا ہے، اور یہ نہیں سمجھتے کہ یہ کمال نوافل عطایا کی جنس سے تھا نہ کہ اس عمل کے آثار میں سے۔

والله أعلم بالصواب وهو الهادي إلى طريق الرشاد.

## چھٹا افادہ: مراقبۂ الوہیت کے آثار کا بیان

جب مراقبہ الوہیت اپنے کمال کو پہونچ جاتا ہے اور اس کے آثار بیش از بیش ظاہر ہوتے ہیں اور طالب کو مقام تکمیل وکمال عطا ہو جاتا ہے اور خلافت من اللہ کا مرتبہ اس کو نصیب ہوتا ہے، اس وقت بعض اکملین کو ایسا مقام حاصل ہوتا ہے کہ خلعت تحریر وتقریر اس کے قد تصویر پر نازیبا وکوتاہ ہے، یہ مقام مقام انکشاف وجہ اللہ ہے، اور آیت "وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ (۱۹۶) میں اسی طرف اشارہ ہے، اگرچہ اس مضمون کی وضاحت تقریر وکلام سے بہت مشکل ہے۔ ع

لذت مے نہ شناسی بخدا تا نہ چشی

لیکن اس کا تخیل اگرچہ ناقص ہو، ایک مقدمہ کی تمہید پر موقوف ہے۔

## اللہ کا نور ہدایت

اس کی تشریح یہ ہے کہ امور محسوسہ ومغیبہ میں سے ہر امر کا ادراک اسی کے مثل کی وساطت سے ہوسکتا ہے، مثلاً انوار شہادیہ کا احساس نور بصارت سے ہوسکتا ہے، اسی طرح سے تمام عوارض جسمانیہ محسوسہ کا ادراک انہیں آلات جسمانیہ ظاہرہ سے ہوسکتا ہے، جن کو

حواس کہتے ہیں، اسی طرح سے عالم مثال کا ادراک اس قوت خیال سے ہوسکتا ہے جو انسان کے قالب میں اس عالم کا تمثال ہے، اور وہ امور جو تجرد و تعلق کے بین بین ہیں، ان کا تصور اس قوت واہمہ سے ہوسکتا ہے، جو بین العقل والحواس ہے، اسی طرح کی کلیات عقلیہ اور جزئیات مجردہ کا ادراک اس قوت عاقلہ سے ہوسکتا ہے جو تجرد و بساطت میں ان امور کی مماثل ہے، اسی پر باقی لطائف انسانیہ کو قیاس کرنا چاہئے، مثلاً تجلی اعظم اور حقائق ملأ اعلیٰ کا ادراک لطیفۂ سر سے اور وجود منبسط کا ادراک لطیفہ خفی سے ہوسکتا ہے، جو حقیقت جامعہ انسانیہ کا لب لباب ہے اور اس کو دل کہتے ہیں، پس سمجھنا چاہئے ذات بے کیف و بے چون و چگون و بے شبہ و بے نمون تمام تجلیات سے بلند و بالا ہے، یہاں تک کہ اس تجلی اعظم سے بھی جو تمام تجلیات کی اصل ہے، اور تمام تنزلات سے معرّیٰ، یہاں تک کہ وجود منبسط سے بھی، جو تمام تنزلات میں سب سے زیادہ شامل و جامع ہے اور ہر صفت میں تمام موجودات کی مماثلت سے منزہ ہے۔

تو اس مرتبۂ ذات کا تصور کہ جس کو مجہول مطلق اور ممتنع التصور کہتے ہیں، بجز نور قدسی الٰہی کے ممکن نہیں، چنانچہ حدیث شریف میں ہے ''ان اللّٰہ خلق خلقہ فی ظلمة فألقیٰ علیهم من نورہ ، فمن أصابه من ذلك النور اهتدیٰ، ومن أخطأہ ضل '' (۱۹۷)۔ پس اللہ تعالیٰ نے اسی نور قدسی کو سعداء کے عقول میں ابتدائے فطرت میں ودیعت کیا ہے، نور حق کا وہ قطرہ بمنزلہ اس نور بصارت کے ہے جو مجمع النور میں پوشیدہ ہے اور جیسے کہ بینائی کا سبب درحقیقت وہی نور ہے اور تمام پردہائے چشم بلکہ خود جرم چشم اس کے قوالب ہیں، اور تمام ظاہری روشنیاں جیسے چراغ، شمع، آفتاب و ماہتاب کی روشنی اس کی مؤیدات میں سے ہے، اس لیے کہ اگر اس نور بصارت کو مجمع النور میں ودیعت نہ رکھا جاتا تو یقیناً اس شخص کا شمار نابیناؤں میں ہوتا اور نابینا کو جرم چشم اور انوار ظاہرہ سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا، پس اگرچہ عوام الناس ظاہر نظر میں یہی خیال کرتے

ہیں کہ ہم آنکھ یا آفتاب یا ماہتاب کی روشنی کی وساطت سے دیکھتے ہیں، لیکن اگر وہ غور کرے تو ان کو معلوم ہوگا کہ آلۂ بصارت درحقیقت وہی نور بصارت ہے، لیکن چوں کہ وہ نور آنکھ کے راستے سے آتا ہے اس لیے اس سببیت کی نسبت آنکھ کی طرف بھی کر سکتے ہیں، اور چوں کہ انوار ظاہرہ اسی نور بصارت کے مؤید ہیں اس وجہ سے ان انوار کو بھی اسباب بصارت کہہ سکتے ہیں، حالانکہ خود ان انوار کا ادراک اسی نور کی وساطت سے ہے، چہ جائیکہ دوسری چیزوں کا ادراک۔

اسی طرح سے ذات بحت کے ادراک کا آلہ اور توجہ الی اللہ کا سبب وہی قطرۂ نور قدسی ہے کہ ارواح کے ظہور کی ابتداء میں اہل سعادت کے نصیب میں آیا، اور اجسام کی خلقت کے بعد لطیفہ عقل کی تہہ میں پوشیدہ ہوگیا، اور اس کی شعاع انسان کے باطنی لطائف میں رنگا رنگ انواع اور گوناگوں الوان کے ساتھ ظاہر ہوئی، جس طرح سے کہ آفتاب کی شعاع بسیط مختلفۃ الالوان والأشکال شیشوں میں ظاہر ہوتی ہے، اور انوار قاہرہ غیبیہ کے ساتھ ظاہر ہوئی، مثلاً کتب سماویہ کے نزول، انبیائے کرام، علمائے ذوی الاحترام اور اولیائے عظام کے وجود کے ساتھ اس نے انبساط وانشراح پایا۔

یہ بات نہیں ہے کہ یہ انوار غیبیہ نفس انسانی میں اس نور قدسی کے ظہور کا سبب ہیں، بلکہ وہ نور قدسی ازل الآزال سے نفوس میں ودیعت ہے اور یہ انوار غیبیہ اس کے انبساط و انشراح کا سبب بن جاتے ہیں، پس اگرچہ سالکان راہ ولایت اور طالبان راہ نبوت ابتدائی حالات میں خیال کرتے ہیں کہ حق جل وعلا کا ادراک لطیفۂ قلب یا لطیفۂ سر یا لطیفۂ خفی وغیرہ سے حاصل ہوا ہے، یا آسمانی کتابوں کے نزول اور انبیاء واولیاء کے وجود سے ہم کو توجہ الی اللہ حاصل ہوئی ہے۔

## حجر بحت

لیکن حقیقت یہ ہے کہ توجہ الی اللہ کا حقیقی سبب وہی نور قدسی ہے جو ازل الآزال

سے ان کے حصہ میں آیا تھا اور اس نے تمام لطائف باطنہ کو رونق بخشی اور کتب وانبیاء کی حقیقت اسی نور کے سبب سے ان کے ذہن نشین ہوئی، لہٰذا جو شخص ازل الآزال میں اس نور سے محروم رہا، جیسے ابوجہل وابولہب، اس کے حق میں یہ انوار قاہرہ عظیمہ اور لطائف باطنہ انسانیہ کچھ مفید نہیں، اور ایک مادرزاد اندھے کی طرح وہ عین روز روشن میں ٹھوکر کھائے گا اور گرے گا، ہاں اتنی بات ہے کہ اس نور قدسی کی شعاع ان لطائف انسانی کے رنگ میں ظاہر ہوتی ہے اور لطائف کے اختلاف کے مطابق اس میں تفاوت عظیم ہوتا ہے، اور وہ ہر لطیفہ میں توجہ الی اللہ کی خاص قسم اور تجلیات ربانیہ کا مخصوص انکشاف اور حضرت حق کے معارف کے خاص آثار جو اس لطیفہ کے مناسب ہوتے ہیں بخشتی ہے، اور دوسرے لطیفہ میں ان چیزوں میں سے کوئی دوسری چیز پیدا کرتی ہے اس لطیفہ نورانیہ کو ہم حجر بحت سے موسوم کرتے ہیں، اس حجر بحت کو عقل کے جگر میں اس طرح تصور کرنا چاہئے جیسے مختلف الالوان شیشوں کے پردے میں ایک چراغ روشن ہو۔

جب یہ مقدمہ ذہن نشین ہوگیا، تو اب جاننا چاہئے کہ جس طرح سے کہ اجرام علویہ کے انوار رات کے وقت نمایاں ہوتے ہیں اگرچہ دراصل وہ آفتاب کی روشنی ہے جو ان کواکب کے اجرام صیقلیہ میں منعکس ہوکر مختلف رنگوں اور گوناگوں لباسوں میں ظاہر ہوتی ہے، لیکن جب آفتاب افق سے طلوع ہوتا ہے تو تمام انوار مختلفہ آفتاب کے نور بسیط میں ماند پڑ جاتے ہیں اور تمام علویات وسفلیات کے بساط پر ایک یک رنگی نورانی چادر تن جاتی ہے، اور اس کی حقیقت یہی ہے کہ آفتاب کی اس روشنی کے مراتب انعکاس اس کے مرتبۂ اصلی میں ماند پڑ جاتے ہیں اور اس وقت فرع واصل ایک ہوجاتے ہیں، اسی طرح جب نفس کاملہ کا حجر بحت سے بے پردہ سابقہ پڑتا ہے، تو حجر بحت کی ایک شعاع مقدس اٹھتی ہے اور تمام لطائف کو اپنا ہم رنگ بنادیتی ہے، اور اس سالک کے پورے باطن کو سرتاپا حجر بحت کردیتی ہے جیسے کہ کسی شخص کے تمام بدن میں نور بصارت سرایت کرجائے، اور اس کا تمام جسم نرگس کی طرح دیدہ وا ہوجائے۔

یہ حالت اس حالت سے مختلف ہے جو راہ ولایت کے سالک کو مبادیِ سلوک میں پیش آتی ہے اور وہ یہ ہے کہ اس کا قلب وسیع ہوجاتا ہے اور تمام بدن اس میں گم ہوجاتا ہے، بس اس کا پورا وجود قلب ہوجاتا ہے، اس لیے کہ یہ حالت حجر بحت کے انبساط کے مقابلہ میں دریائے اخضر کے مقابلہ میں قطرہ کا حکم رکھتی ہے، اس لیے کہ اس حالت کی غایت یہ ہے کہ سالک کا تمام وجود تجلیِ قلبی کا آلۂ ادراک ہوجاتا ہے، اور اس حالت کا مآل یہ ہے کہ اس صاحب کمال کا پورا باطن ذات بحت کے ادراک کا واسطہ بن جاتا ہے، اور دونوں میں بڑا فرق ہے، وہ شخص جس کا تمام وجود قلب ہوگیا ہے اس شخص کے مقابلہ میں جس کا تمام باطن حجر بحت ہوگیا ہے، کیا حیثیت رکھتا ہے۔

جب کوئی کامل شخص اس مقام کو پہونچ جاتا ہے تو وہ امور جو دوسروں کے لیے باعث کدورت وانقباض ہوتے ہیں، اس شخص کے باطن میں ان کا کچھ اثر نہیں ہوتا، جیسے کوئی شخص علوم دقیقہ کی مزاولت رکھتا ہو، اور اس کے تمام کاروبار کا تعلق قوت عاقلہ سے ہوتو وہ امور جو حواس ظاہرہ کی کدورت کا باعث ہوتے ہیں، مثلاً آنکھ کے سامنے پردہ کا آجانا، یا کانوں میں روئی رکھ لینا وہ اس کے کام میں کچھ خلل انداز نہیں ہوسکتے، اس مقام کی جتنی تصویر تحریر وتقریر کے اندر آسکتی تھی اس کی کوشش کی گئی، رہی اس مقام کی حقیقت۔

فوراء الوراء ، ثم وراء الوراء

## فائدہ: طالبین راہ نبوت خاصان خدا ہیں

طالبین راہ نبوت کی لوح خاطر حب ایمانی کے استیلاء اور فنائے ارادہ کی پختگی کی وجہ سے امیدوں اور آرزوؤں کے نقوش سے صاف وسادہ ہوجاتی ہے، یہاں تک کہ حضرت حق کی رضا کے سوا کسی چیز کی طلب اور دونوں جہان کی نعمتوں میں سے کسی نعمت کی خواہش ان کے دل میں جگہ نہیں پکڑتی، اور دنیا وآخرت کی خوشحالیوں اور عیش وعشرت کا شوق نہیں پیدا ہوتا، یہاں تک کہ ایک بار زبان سے خدا کا نام لینے کے مقابلہ میں اگر ان کو دونوں جہاں کی نعمتیں پیش کی جائیں تو وہ اس کو سب وشتم کی طرح سمجھیں گے اور وہ تمام کام اللہ کی خوشی کے لیے کرتے ہیں، اور ان کا کوئی مطلب نہیں ہوتا، "اَلَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ رَبَّھُم بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِیِّ یُرِیْدُوْنَ وَجْهَهٗ" میں انہی لوگوں کی تعریف ہے، اور چوں کہ یہ ارباب طریق نشۂ محبت کے مقام سے آگے بڑھ چکے ہوتے ہیں، اور مدارج عالیہ کو پہونچ چکے ہوتے ہیں، ان کے دل میں مناسب طبع امور میں سے کسی امر کی رغبت اور مکروہات دارین میں سے کسی امر کی کراہت بھی کبھی پیدا ہوتی ہے، لیکن اس طرح نہیں کہ اپنی طاعات کے عوض میں کسی امر مرغوب کی استدعاء کریں، حاشا وکلا اس لیے کہ یہ بزرگوار اپنے اعمال کو اپنی طرف سے نہیں سمجھتے کہ اس کے عوض میں کسی جزا کے امیدوار ہوں، بلکہ جس طرح کہ بادشاہ عالی جاہ کی رعایا میں سے کوئی شخص اس کو خوش کرنے کے لیے مدتوں حیران وسرگرداں رہا ہو، اور سلطنت کے عہدوں، سپاہ گری و جماعت داری وغیرہ میں منتقل ہوتا رہا ہو، آخر بادشاہ کی خوشی اور قبولیت کے مقام اور شاہی کفالت و وکالت میں پہنچ کر بلند مرتبہ اور اس کے مصاحب خاص کا لقب پائے، پس اس حالت میں وہ تمام چیزیں جو اس کے آقا کے زیر حکومت اور اس کی مملکت میں موجود ہیں، ان کی فرمائش کرنے کا اس کو حق ہے، اس طرح نہیں کہ وہ اپنا حق خدمت یا صلۂ محنت یا مصاحبی کا معاوضہ چاہتا ہے، اس لیے کہ اس طرح کی فرمائش وخواہش اس کے لیے بہت بڑا عیب ہے، اور اگر وہ یہ کرے گا تو اپنے کو اس

مرتبہ عالی سے اتار کر مزدوروں کے گروہ میں داخل کر دے گا، بلکہ اس تعلق کا تقاضہ ہی یہ ہے کہ اپنی تمام ضرورتیں صرف اپنے آقا کے سامنے پیش کرے۔

اسی طرح جب ارباب کمال انتخاب و برگزیدگی اور مقبولیت و محبوبیت سے مشرف ہوتے ہیں، اور اس مقام بلند میں راسخ القدم اور رفیق اعلیٰ سے مل جاتے ہیں، تو بندۂ خاص اور عبد مخصوص کا لقب پاتے ہیں، اور امور مرغوبہ کی طرف میلان ان میں باقی رہتا ہے، نہ اس طرح کہ ان کے امور کو اپنے اعمال کے معاوضہ کے طور پر طلب کرتے ہیں، بلکہ اس لیے کہ اس سے بندگی کے تعلق کو رونق حاصل ہوتی ہے، پس حظوظ نفسانی کی طلب ان کے حق میں زیادتیٔ قرب کی موجب ہوتی ہے نہ کہ بُعد کی۔

موسیٰ اندر درخت آتش دید　　سبز ترمی شد آں درخت از نار
شہوت و حرص مرد صاحب دل　　ایں چنیں داں و ایں چنیں انگار (۱۹۸)

## ارباب کمال کے تین گروہ

القصہ جب یہ ارباب کمال اس مقام و حال کو پہونچتے ہیں، تو فطری استعداد کے اختلاف کے سبب سے ان کے تین گروہ ہو جاتے ہیں۔

☆　ایک وہ گروہ جو علو مرتبہ کے کمال کے سبب سے اور مقام قبولیت میں راسخ القدم ہونے کی وجہ سے دنیا و آخرت کے مرغوبات و مکروہات اور مصائب و مشکلات کو ادنیٰ امور میں سے سمجھتا ہے، اور ان کی طرف کچھ بھی التفات نہیں کرتا، اس وجہ سے نہیں کہ وہ لوگ نشۂ محبت میں سرشار ہوتے ہیں اور پسندیدہ و ناپسندیدہ میں ان کو کوئی تمیز نہیں ہوتی، بلکہ اپنے علو مرتبہ اور ان اشیاء کی حقارت کی وجہ سے کرتے ہیں۔

اور حق یہ ہے کہ ان کا پایہ اس بات سے بہت بلند ہے کہ ان امور کی طرف ان کا التفات ہو، اور ان مناصب و درجات کی جو فرحت و مسرت ان کو حاصل ہے وہ اس سے کہیں بالاتر ہے کہ ان کو کسی اور فرحت کی تلاش ہو، اگرچہ ان کو ضرورتوں کے پیش کرنے کا

مرتبہ حاصل ہے، اس لیے کہ عنایات ربانی اور کفالت یزدانی کی وجہ سے ان کی دعا واجب الاجابت اوران کی پناہ طلبی واجب القبول ہے۔

☆ دوسرے وہ لوگ ہیں جو ضرورتیں پیش کرتے رہتے ہیں، مشکلات کو دور کرنے، مرغوبات کے حاصل ہونے اور مکروہات سے بچنے کی دعاؤں میں مشغول اوراپنے تعلق بندگی کو مستحکم کرنے کے لیے اور اظہار ضرورت کے لیے (جو بندگی کا شعار ہے ) اور پریشاں حال ضرورت مندوں پر شفقت کی وجہ سے لوگوں کی سفارشوں میں ہر وقت ساعی وکوشاں رہتے ہیں۔

☆ تیسرا گروہ ان بزرگوں کا ہے جن کے دل میں مرغوبات کی طلب کا تقاضہ، مشکلات سے نجات اور ضرورت مندوں کی سفارش کا خیال پیدا ہوتا ہے لیکن کمالِ ادب کی وجہ سے اور حضرت حق کی کفالت پر پورا اعتماد کرتے ہوئے اور یہ اعتقاد کر کے کہ وہ دنیا کی تمام پوشیدہ چیزوں اور راز ہائے سربستہ سے واقف ہے، اوراس کا علم محیط ہے، زبان حال پر اکتفاء کرتے ہوئے زبان قال کو استعمال نہیں کرتے "حسبی سوالی علمه بحالی" ان کا مسلک ہوتا ہے، حق جلَّ وعَلا ان کی دعائے حالی کو ضرور قبول فرماتا ہے، اوران کی حوائج قلبی کو ضرور پورا کرتا ہے، اس طرح سے کہ ان کے تقاضائے قلبی کو خود بخود بلا تقریب ظاہر کر دیتا ہے اوران کو بلکہ محافل قرب کے تمام مخصوصین کو اطلاع دے دیتا ہے کہ یہ محض ان لوگوں کی رضا جوئی اور ان کے اقتضائے قلبی کو پورا کرنے کے لیے یہ کام کیا گیا ہے، اوراس بات سے ان کا اعتبار اور بڑھتا اور ان کا فخر اور ترقی کرتا ہے، اور ان کو اس وجہ سے اپنے امثال واقران میں بڑی وجاہت حاصل ہوتی ہے۔

فائدہ: ہر گروہ مقام بلند پر فائز ہے

اگر چہ ان تینوں گروہوں میں سے کسی گروہ کو دوسرے گروہ پر ترجیح دینا ہر طرح سے غلط اور بیجا ہے۔ ع

ہر گل را رنگ و بوئے دیگر است (۱۹۹)

لیکن تیسری قوم کو ملأ اعلیٰ میں ترقی جاہ و اعتبار کے لحاظ سے فریق ثانی پر جو فضیلت ہے وہ اہل فہم سے پوشیدہ نہیں، اسی طرح سے دوسرے گروہ کو بلحاظ علاقۂ عبودیت کے مقتضیات کے ظہور کے اور اللہ اور اس کے مخلوق کے درمیان فیوض غیبیہ کے پہونچنے میں واسطہ بننے اور لوگوں کی حاجت روائی اور سفارش کرنے کی وجہ سے گروہ اول پر جو فضیلت ہے وہ اہل حق سے مخفی نہیں۔

والعلم عند اللّٰہ

## خاتمہ۔ حضرت (سید احمد شہیدؒ) پر دونوں طریقوں (راہِ ولایت اور راہِ نبوت) کے سلوک کے دوران جو بعض واردات اور معاملات وارد ہوئے، ان کا بیان

اگرچہ یہ کمالات جن پر یہ کتاب مستطاب مشتمل ہے اپنی حقیقت پر حجت قاطعہ اور مضبوط دلیل ہے، لیکن چوں کہ اس زمانہ میں اکثر لوگ قال کو حال سے پہچانتے ہیں نہ کہ حال کو قال سے یعنی ان کے نزدیک بات کا اعتبار اس وجہ سے ہوتا ہے کہ اس بات کا کہنے والا معتبر ہو حالاں کہ اہل دانش بات کی وجہ سے متکلم کو معتبر جانتے ہیں، اس لیے اس اچھی کتاب میں وہ مضامین قید تحریر میں لائے گئے ہیں جن کا ماخذ واضح ہو، تاکہ ان مضامین کو پڑھنے اور دیکھنے والا ان مضامین کے ماخذوں پر مطلع ہونے کی وجہ سے کہ حضرت سید صاحب نے یہ مضامین کہاں سے اخذ کیا ہے اور کس سے استفادہ کیا ہے، اطمینان حاصل ہو۔

پس جاننا چاہیے کہ حضرت ایشان (سید احمد شہیدؒ) کی جبلت ابتدائے فطرت ہی سے کمالاتِ طریق نبوت پر اجمالاً مائل تھی۔ اِس طریق کے آثار یعنی وجدانی طور پر مناجات کی لذت پانا، بالخصوص نماز میں، اور شرع شریف کی تعظیم، اتباعِ سنت کی نہایت درجہ رغبت، آلودگیٔ بدعت سے کمال نفرت، طاعات کی طرف طبعی میلان اور معاصی وسیئات سے جبلی کراہت بچپن سے آپ پر ظاہر و باہر تھی۔ القصہ طہارت جبلیہ کے آثار آپ کی طبیعت کی تہ میں ظاہر اور سعادت ازلیہ کے انوار آپ کی جبین مبارک پر ہویدا تھے۔ حتی کہ

سعادتوں کے خزائن کی کلید کہ جس کی مدد سے ہر دو طریق یعنی طریق نبوت اور طریق ولایت کے بند دروازے کھل جائیں، آپ کے ہاتھ آ گئی، یعنی آپ جناب ہدایت مآب، قدوۂ اربابِ صدق وصفا، زهدۂ اصحاب فنا وبقا، سید العلماء وسندالاولیاء، حجة الله علی العالمین، وارث الانبیاء والمرسلین، مرجعِ هر ذلیل وعزیز، مولانا ومرشدنا الشیخ عبدالعزیز متع الله المسلمین بطول بقائه وأعزنا وسائر المسلمین بمجدهٖ وعلائهٖ (۲۰۰) کی خدمت میں پہنچے۔ آپ کو ان کے حضور طریقۂ نقشبندیہ میں بیعت کا شرف حاصل ہوا۔ حصول بیعت کے یمن اور آں جناب کی توجہات کی برکت سے آپ پر نہایت عجیب و نادر معاملات ظاہر ہوئے۔ انھیں وقائعِ عجیبہ کے سبب کمالاتِ طریق نبوت جو ابتدائے فطرت ہی سے اجمالی طور پر مندرج تھے، تفصیل وشرح کے ساتھ انجام پائے اور مقالاتِ طریق ولایت نہایت اچھی صورت میں جلوہ گر ہوئے۔

ان معاملات میں سب سے اوّل اور افضل یہ ہے کہ آپ نے جناب رسالت مآب صلوات اللہ وسلامہ علیہ کو خواب میں دیکھا، آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تین کھجوریں اپنے دست مبارک سے آپ کو کھلائیں، اس انداز سے کہ ایک ایک کھجور اپنے دست مبارک میں لے کر آپ کے دہن میں رکھتے تھے، اس کے بعد جب آپ بیدار ہوئے تو اپنے اندر اس رویائے حقہ کا اثر ظاہر و باہر محسوس کیا، اس واقعہ سے آپ کو سلوکِ طریق نبوت کی ابتدا حاصل ہوگئی۔

بعد ازاں ایک دن جناب ولایت مآب علی مرتضٰی کرم اللہ وجہہ اور جناب سیدۃ النساء فاطمۃ الزہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو خواب میں دیکھا، پس جناب علی مرتضٰی رضی اللہ عنہ نے آپ کو اپنے دستِ مبارک سے غسل دیا اور آپ کے بدن کو خوب اچھی طرح سے مَل مَل کر دھویا جس طرح والدین اپنے بچوں کو نہلاتے دھلاتے ہیں، پھر جناب حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا نے ایک نہایت نفیس لباس اپنے دستِ مبارک سے آپ کو پہنایا۔ پس اس واقعہ کے سبب سے کمالاتِ طریق نبوت نہایت جلوہ گر ہوئے اور مقبولیت ازلی جو

کہ ازل الآزال میں مخفی تھی منصۂ ظہور پر آ گئی، عنایت رحمانی اور تربیتِ یزدانی بغیر کسی واسطے کے آپ کے حال کی متکفل ہوئی۔ اور ''معاملاتِ متواترہ'' اور ''وقائعِ متکاثرہ'' پے در پے وقوع میں آئے۔ یہاں تک کہ ایک روز حضرت جل وعلا نے آپ کا داہنا ہاتھ اپنے ''دستِ قدرتِ خاص'' میں پکڑا اور ''امورِ قدسیہ'' میں سے ایک چیز جو کہ نہایت رفیع و بدیع تھی، آپ کے سامنے کر کے فرمایا، ہم نے تجھے ایسی چیز عنایت کی ہے اور دیگر چیزیں بھی دیں گے۔

حتی کہ ایک شخص نے حضرت سید صاحبؒ کی خدمت میں بیعت کی استدعا کی۔ حضرت اُن دنوں عام طور پر بیعت نہیں لیا کرتے تھے، اِس بنا پر اُس شخص کی التماس قبول نہ فرمائی۔ اُس نے نہایت درجہ الحاح کی، حضرت نے اُسے فرمایا: کہ ایک دو روز توقف کرنا چاہیے بعد میں جو کچھ مناسب وقت ہوگا وہی عمل میں آئے گا، پھر آپ حضرت حق کی جناب میں استفسار و اجازت کے لیے متوجہ ہوئے اور عرض کیا کہ آپ کے بندوں میں سے ایک بندہ مجھ سے بیعت کی استدعا کرتا ہے، آپ نے میرا ہاتھ پکڑا ہوا ہے اور اس جہان میں جو کوئی کسی کا ہاتھ پکڑتا ہے تو ہمیشہ دست گیری کا پاس کرتا ہے، آپ کے اوصاف کو مخلوقات کے اخلاق سے کچھ بھی نسبت نہیں، پس اس معاملہ میں کیا منظور ہے؟ بارگاہ حق سے حکم ہوا کہ ''جو لوگ تمہارے ہاتھ پر بیعت ہوں گے، اگرچہ وہ لاکھوں کی تعداد میں ہوں، ہم سب کو کفایت کریں گے۔''

القصہ اس قسم کے واقعات اور ایسے ایسے معاملات سیکڑوں پیش آئے، یہاں تک کہ کمالاتِ طریق نبوت اپنی انتہائی بلندی کو پہنچے اور الہام اور کشفِ علومِ حکمت کے ساتھ انجام پذیر ہوئے، یہ ہے طریقِ استفادۂ کمالاتِ راہِ نبوت۔

اور کمالاتِ راہِ ولایت کے استفادہ کا طریق، اوّل اس طرح سمجھ لینا چاہیے کہ اولیاء اللہ کے طریقوں میں سے ہر طریق میں مجاہدات و ریاضات، اذکار و اشغال اور مراقبات معین کیے ہوئے ہیں۔ ان امور میں سے ہر ایک امر طالب کے نفس میں اثر پیدا

کرتا ہے اور اشغال کے ثمرات وارد ہونے کے سبب سے ایک ''امر مستقر'' طالب کے اندر پیدا ہو جاتا ہے۔ اس امر کے سبب سے طالب عالمِ قدس سے ارتباط رکھتا ہے۔ اور وہی امر حضرت حق جل وعلا کے ساتھ طالب کے علاقے کا موجب ہوتا ہے، وہ امر ہمیشہ طالب کے نفس میں موجود رہتا ہے، خواہ اس امر کی جانب طالب کی نظر ہو یا نہ ہو۔ ہاں اس امر کی طرف توجہ کے سبب اس کے آثار منصّۂ ظہور پر آجاتے ہیں ورنہ اس کے جوہر نفس میں مخفی رہتے ہیں۔ اس امر کو عرفِ قوم (صوفیہ) میں ''نسبت'' کہتے ہیں، مثال اس کی یہ ہے کہ ایک شخص جو معقول کی کتابوں کی بتکرار خواندگی کرتا ہے یا دوسرے صنائع جیسے موسیقی یا آہنگری یا زرگری کی مشق کرتا ہے تو کچھ مدت کے بعد اس کے اندر ایک ''امر مستقر'' پیدا ہو جائے گا، جسے ملکۂ صناعت کہتے ہیں۔ وہ ملکہ اُس شخص کے نفس میں دائماً مستقر رہتا ہے خواہ وہ شخص اس ملکہ کی جانب التفات کرے یا نہ کرے۔ ہاں البتہ جب یہ شخص اس ملکہ کی طرف التفات کرتا ہے اور اس کو بروئے کار لاتا ہے تو اس کے آثار ظہور پذیر ہوتے ہیں ورنہ پردۂ اخفا میں مخفی رہتے ہیں۔

جب اس مقدمہ کی تمہید ہو چکی تو جاننا چاہیے کہ اگرچہ عادت اللہ اس قانون پر جاری ہے کہ مجاہدات وریاضات واذکار واشغال کے مبادی کی تحصیل کے بعد ''نسبت'' ہاتھ آتی ہے، لیکن خرقِ عادت کے طور پر بعض نفوسِ کاملہ کو اوّلاً نسبت حاصل ہوتی ہے بعد ازاں مبادی۔ مثلاً عادۃ اللہ اس قانون پر جاری ہے کہ کتاب وسنت کے مضامین کتب عربیہ اور فنونِ ادبیہ کی تحصیل کے بعد ہاتھ آتے ہیں لیکن بعض نفوسِ کاملہ کو خرقِ عادت کے طور پر اوّلاً ان مضامینِ لطیفہ پر اطلاع بخشی جاتی ہے، اسے اصطلاح قوم (صوفیہ) میں علم لدنی کہتے ہیں۔ فنونِ ادبیہ انھیں ثانیاً حاصل ہوتے ہیں، کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ تحصیلِ مبادی میں وہ دوسرے مبتدیوں کی مانند ان فنون کے اساتذہ کے محتاج ہوتے ہیں، بلکہ کبھی کبھی مبادی سے عاری ہی رہ جاتے ہیں۔

القصہ حضرت ایشان (سید صاحب) کو تینوں طریقوں یعنی قادریہ، چشتیہ اور نقشبندیہ کی نسبت مبادی سے پہلے حاصل ہوگئی۔ نسبتِ قادریہ ونقشبندیہ کا بیان تو اس طرح ہے کہ آں جناب ہدایت مآب (حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز قدس سرہٗ) کی بیعت کی برکت اوران کی توجہات کے یُمن سے جنابِ حضرتِ غوث الثقلینؒ اور جنابِ حضرتِ خواجہ بہاء الدین نقشبندؒ کی مقدس روحیں آپ کے متوجہ حال ہوئیں اور قریباً ایک ماہ تک آپ کے حق میں ہر دو روحیں مقدسین کے مابین فی الجملہ ایک تنازع رہا، کیوں کہ ان ہر دو اماموں میں سے ہر ایک آپ کو بتمامہٖ اپنی جانب جذب کرنے کا متقاضی تھا۔ یہاں تک کہ تنازع کا زمانہ گزرنے اور شرکت پر مصالحت واقع ہونے کے بعد ایک روز دونوں مقدس روحیں حضرت پر جلوہ گر ہوئیں اور تقریباً ایک پہر تک دونوں امام آپ کے نفس نفیس پر ''توجہ قوی'' اور ''تاثیرِ زور آور'' فرماتے رہے، حتی کہ اسی ایک پہر میں حضرت کو ہر دو طریقہ کی نسبت نصیب ہوگئی۔

اور نسبت چشتیہ کا بیان اس طرح ہے کہ ایک روز حضرتِ ایشان (سید احمد شہید) حضرت خواجۂ خواجگان خواجہ قطب الاقطاب بختیار کاکی قدس سرہٗ کے مرقدِ منور کی طرف تشریف لے گئے اور اُن کے مرقدِ مبارک پر مراقب ہوکر بیٹھ گئے۔ اس اثنا میں اُن کی روحِ پُر فتوح سے ملاقات متحقق ہوئی، آں جناب حضرتِ قطب الاقطاب نے آپ پر نہایت قوی توجہ فرمائی، اس توجہ کی وجہ سے نسبت چشتیہ کا ابتدائی حصول متحقق ہوگیا۔ اِس واقعہ سے ایک مدت گزرنے کے بعد ایک روز مسجد اکبر آبادی واقع شہر دہلی (اللہ تعالیٰ اسے آفاتِ زمانہ سے محفوظ رکھے) میں آپ اپنے مستفیدوں کی ایک جماعت میں بیٹھے ہوئے تھے، چناں چہ راقم الحروف بھی اس محفلِ ہدایت منزل کے آستان بوسوں کی سِلک میں منسلک تھا، سب حاضرینِ محفل مراقبہ کے گریبان میں سر ڈالے ہوئے تھے، اور حضرت سب مستفیدوں پر توجہ فرما رہے تھے۔ اِس مجلسِ ملائک مانس کے اختتام کے بعد کاتب الحروف کی طرف متوجہ ہوکر فرمایا کہ آج حق جل وعلا نے محض اپنی عنایت سے بلا واسطہ کسی کے

نسبت چشتیہ کا اختتام ہمیں ارزانی کیا ہے۔ اس کے بعد آپ نے طریقۂ چشتیہ کی تلقین و تعلیم میں بازوئے ہمت کھولا اور اشغال کی تجدید فرمائی جن پر یہ کتاب مستطاب (صراطِ مستقیم) مشتمل ہے۔ یہ ہے طریقہ تینوں نسبتوں کے استفادے کا۔

اور باقی تمام نسبتوں، نسبتِ مجددیہ و شاذلیہ وغیرہ کا استفادہ، تو جاننا چاہیے کہ کمالاتِ راہِ نبوت، اربابِ کمال کی بصیرت کو کحلِ قدسی سے سُرمہ ناک کردیتے ہیں اور کُحل قدسی کی وجہ سے اُن کا نورِ بصیرت حدت و تیزی اختیار کرلیتا ہے۔ اُن کی روحِ قدسی آنکھ کی مانند کھل جاتی ہے حتیٰ کہ وہ جس چیز کی طرف التفات کرتے ہیں اُس چیز کے دقائق در دقائق کو اپنی استعداد کے مطابق کما حقہ پالیتے ہیں۔ پس گویا ولایت کی تمام نسبتیں سالکِ راہِ نبوت کے کمال میں مجملاً مندرج ہوتی ہیں، جونہی کسی چیز کی طرف ایک ادنیٰ التفات متحقق ہوا تو اس چیز کی حقیقت اپنی تمام شرح و بسط کے ساتھ اُن کی بصیرت کے سامنے حاضر ہوجاتی ہے۔

تم یہ نہ سمجھنا کہ اس کلام سے مقصود طریقۂ نبوت کے سالک کو طریقۂ ولایت کے تمام اماموں پر فضیلت حاصل ہے، بلکہ اس خامہ فرسائی سے مقصود یہ ہے کہ راہِ نبوت کے سالک کے اندر ایک نور قدسی پیدا ہوتا ہے جس کی وجہ سے وہ ہر صاحب نسبت کی نسبت کا ادراک گو کہ وہ افضل و اعلیٰ ہو، کرسکتا ہے۔

جیسے آنکھ کے خانہ میں قوت باصرہ رکھی ہوئی ہو، جس قوت کی وجہ سے وہ ہر روشن مجسم چیز کو اپنی بینائی کی مضبوطی و کمزوری کے بقدر معلوم کرلیتا ہے اگرچہ اس تابندہ مجسم چیز کی روشنی آنکھ کی روشنی سے زیادہ اعلیٰ اور قوی ہو، واللہ اعلم۔

اور جہاں تک مبادی کے حصول کی بات ہے تو جاننا چاہیے کہ اشغال، اذکار، مجاہدات اور مراقبات کا مقرر کرنا درحقیقت تشریع کا سایہ ہے، اور جو شخص قرب الفرائض کے مقام میں قائم ہوتے ہیں اگر وہ بزرگ وار انبیاء علیہم السلام کی قسم سے ہوتے ہیں تو ضرور نئی شریعت والے ہوتے ہیں ورنہ اللہ تعالیٰ تک پہنچانے والے طریقوں کا تعین ان کی

طبیعت کی گہرائی سے فوارے کی طرح جوش مارتا ہے، اس میں تعلیم و تعلم کی کوئی گنجائش نہیں۔

**فائدہ:** ان چند سطور میں جو حضرت (سید احمد شہیدؒ) کے معاملات واقعات کے اجمالی اشاروں پر مشتمل ہے، بہت زیادہ فوائد ومنافع ہیں، انھیں فوائد کثیرہ میں سے وہ ہے جو شروع کلام میں لکھا گیا اور انھیں میں سے تحدیث بہ نعمت (نعمتِ الٰہی کا اظہار) ہے کہ اس میں حکمِ خداوندی "وَاَمَّا بِنِعْمَتِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ" (۲۰۱) کی تعمیل ہوتی ہے، اور انھیں فوائد میں سے غافلین کو خوابِ غفلت سے بیدار کرنا ہے کہ جو شخص اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا طالب ہو اور اس کی طلب، طلب صادق ہو تو وہ منزل مقصود تک پہنچ جاتا ہے، اور انھیں منافع میں سے زمانے کے جہلاء کی تنبیہ بھی ہے جو ولایت کو عقلی لحاظ سے ناممکن سمجھ کر اور اس کو امت کے سابقین اوّلین پر منحصر جان کر سلسلۂ نبوت کے انقطاع کی طرح اس کے اختتام کے قائل ہو گئے۔

والسلام علی من اتبع الهدیٰ والحمد للّٰه أوّلًا وآخراً وظاهراً وباطناً وصلّی اللّٰهُ علیٰ خیرِ خلقهٖ محمد واٰلِهٖ وصحبهٖ وسلم.

# حواشی

(۱) عن أبي هريرة مرفوعاً۔ (صحيح مسلم، كتاب الصلاة، باب ما يقال في الركوع والسجود). ترجمہ: میں تیری ویسی حمد وثنا نہیں کرسکتا جیسی تو نے خود اپنی حمد وثنا کی ہے۔

(۲) سورة النحل، الاٰية: ۱۸۔ ترجمہ: اور اگر تم اللہ کی نعمتوں کو گننے لگ جاؤ تو شمار نہ کرسکو۔

(۳) عن علي مرفوعاً۔ (مسند أحمد بن حنبل، ج:۱،ص:۸۳۔) رقم الحدیث:۶۲۸ ترجمہ: حاضر اس چیز کو دیکھتا ہے جسے غائب نہیں دیکھ سکتا۔

(۴) شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا شمار ان اشخاص میں ہوتا ہے جو صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں، انھوں نے ہندوستان میں کتاب وسنت اور عقائد صحیحہ کی نشر واشاعت میں کارہائے نمایاں انجام دیا، بعد کے دور میں برصغیر کی خاک سے اٹھنے والے تمام مفسرین، محدثین اور مصلحین اسی شجرۂ طوبیٰ کی شاخیں ہیں۔ شاہ صاحب کی ولادت چہارشنبہ کے دن، ۴؍شوال ۱۱۱۴ھ طلوع آفتاب کے وقت اپنے ننہیال قصبہ پھلت، ضلع مظفر نگر میں ہوئی۔ شاہ صاحب کی عمر جب پانچ سال کی ہوئی تو مکتب میں داخل کیے گئے، سات سال کی عمر میں قرآن مجید حفظ کیا، اس کے بعد فارسی اور عربی کی کتابیں پڑھنا شروع کیں۔ پندرہ سال کی عمر میں ہندوستان میں رائج علوم متداولہ سے فراغت حاصل کی۔

شاہ صاحبؒ کی علمی، فکری اور دعوتی وتجدیدی زندگی میں حجاز مقدس کا سفر اور قیام ایک تاریخ ساز واقعہ اور ان کی کتاب زندگی کا ایک نیا باب ہے، اسی سفر میں انھوں نے علم حدیث کا وسیع اور گہرا مطالعہ کیا اور وہاں کے شیوخ سے خوب علمی استفادہ کیا۔ جن میں سب سے ممتاز نام شیخ ابو طاہر محمد بن ابراہیم الکردی کا ہے۔ شاہ صاحبؒ نے متعدد قیمتی تصنیفات اپنی یادگار چھوڑی ہیں، جن میں سب سے نمایاں تصنیف ''حجۃ اللہ البالغہ'' ہے جو شریعت کے اسرار ورموز پر لاثانی تصنیف ہے۔

شاہ صاحب کی وفات ۲۹ محرم ۱۱۷۶ھ بروز شنبہ بوقت ظہر ہوئی۔ رحمہ اللہ رحمۃ الأبرار الصالحین.

(۵) (صحيح البخاری، کتاب الايمان، باب من كره أن يعود في الكفر كما يكره أن يلقي في النار۔ صحيح مسلم، كتاب الإيمان، باب بيان خصال من اتصف بهن وجد حلاوة الإيمان.) ترجمہ: اللہ اور اس کے رسول کی محبت جس کے نزدیک ہر چیز سے زیادہ ہو اس نے ایمان کی حلاوت پالی۔

(۶) سورة البقرة، الاٰية: ۱۶۵۔ ترجمہ: اور جو لوگ ایمان لائے وہ اللہ ہی سے سب سے زیادہ محبت رکھنے والے ہیں۔

(۷) سورة الجمعة، الآية: ۴۔ ترجمہ: یہ اللہ کا فضل ہے جس کو چاہتا ہے وہ عطا فرماتا ہے۔

(۸) سورة بنی اسرائیل، الآیة: ۸۵۔ ترجمہ: کہہ دیجئے کہ روح میرے رب کے حکم کا حصہ ہے۔

(۹) عن أبي هريرة مرفوعاً۔ (صحیح البخاري، کتاب الاستئذان، باب بدء السلام۔ صحيح مسلم، کتاب الجنة وصفة نعيمها وأهلها، باب يدخل الجنة أقوام أفئدتهم مثل أفئدة الطير۔) ترجمہ: اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو اپنی صورت پر بنایا۔

(۱۰) شغل برزخ یا تصور شیخ، تصوف کی ایک اصطلاح ہے۔ بسا اوقات یکسوئی حاصل کرانے کی غرض سے مرشد اپنے مرید سے ایسا عمل کراتا ہے، اس کی تفصیل آگے ''باب دوم'' میں آ رہی ہے۔

(۱۱) سورة العنكبوت، الآية: ۶۹۔ ترجمہ: اور جو بھی ہمارے لیے محنت کریں گے تو ہم ضرور ان کے لیے راستے کھول دیں گے۔

(۱۲) سورة البقرة، الآية: ۱۵۲۔ ترجمہ: تو تم مجھے یاد کرتے رہو میں تمھیں یاد کرتا رہوں گا۔

(۱۳) یہ دونوں جملے ایک ہی حدیث کے ٹکڑے ہیں، ملاحظہ ہو: عن أبي هريرة رضي الله عنه قال قال النبي صلى الله عليه وسلم يقول الله تعالىٰ: "أنا عند ظن عبدي بي وأنا معهٗ إذا ذكرني" (صحيح البخاري، كتاب التوحيد، باب قول الله تعالىٰ ويحذركم الله نفسه۔ صحيح مسلم، كتاب الذكر والدعاء والتوبة، باب الحث على ذكر الله تعالىٰ۔) ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں اپنے بندے کے گمان کے پاس ہوتا ہوں اور میں اس کے ساتھ ہوتا ہوں جب وہ مجھے یاد کرتا ہے۔

(۱۴) عن ابن عباس مرفوعاً۔ (سنن الترمذي، أبواب صفة القيامة، باب۔) ترجمہ: تم اللہ کو یاد کرو گے تو اس کو اپنے سامنے پاؤ گے۔

(۱۵) سورة الكهف، الآية: ۸۲۔ ترجمہ: اور میں نے اپنی رائے سے کچھ نہیں کیا۔

(۱۶) سورة الكهف، الآية: ۸۲۔ ترجمہ: تو آپ کے رب نے چاہا۔

(۱۷) حدیث اس ترتیب سے ہے: "عن أبي هريرة قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: "إن الله قال من عادىٰ لي وليًا فقد آذنته بالحرب وما تقرب إلى عبدي بشئ أحب إلى مما افترضت عليه وما يزال عبدي يتقرب إلى بالنوافل حتى أحبه فإذا أحببته كنت سمعه الذي يسمع به وبصره الذي يبصر به ويده التي يبطش بها ورجله التي يمشي بها وإن سألني لأعطينه ولئن استعاذني لأعيذنه." (صحيح البخاری، كتاب الرقاق، باب التواضع)، ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے

کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے جس نے میرے کسی ولی سے دشمنی کی تو میں اس سے جنگ کا اعلان کرتا ہوں، میرا بندہ مجھ سے کسی چیز کے ذریعے فرائض کے مقابلے میں قریب نہیں ہوسکتا ہے جو میرے نزدیک سب سے زیادہ پسندیدہ ہو اور میرا بندہ مسلسل نوافل کے ذریعے تقرب حاصل کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں پھر جب میں اس سے محبت کرتا ہوں تو اس کا کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے، اس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے، اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے اور اس کا پاؤں بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے اور اگر وہ مجھ سے سوال کرتا ہے تو میں اس کو عطا کرتا ہوں اور مجھ سے پناہ مانگتا ہے تو میں اس کو پناہ دیتا ہوں۔

(۱۸) (کنز العمال، رقم الحديث: ۱۱۵۷) ترجمہ: اور میں اس کی زبان بن جاتا ہوں جس سے وہ بولتا ہے۔

(۱۹) عن أبي موسىٰ مرفوعاً۔ (صحيح مسلم، كتاب الصلاة، باب التشهد في الصلاة۔) لیکن اس میں "إذا قال الله" کے بجائے "فإن الله تعالىٰ قال" ہے۔ ترجمہ: تو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کی زبان سے فرمایا، اللہ نے اس کی بات سن لی جس نے اس کی تعریف بیان کی۔

(۲۰) عن أبي موسىٰ مرفوعاً۔ (صحيح البخاري، كتاب الزكاة، باب التحريض على الصدقة والشفاعة فيها۔) ترجمہ: اور اللہ تعالیٰ اپنے نبی کی زبان سے جو چاہتا ہے وہ فیصلہ فرماتا ہے۔

(۲۱) اس کے سوا میں اور کچھ نہیں کہہ سکتا، کیوں کہ یہ ایک ایسا راز ہے جس کے بارے میں کچھ بولنے سے زبان گونگی ہے۔

(۲۲) سورة القصص، الأية: ۳۰۔ ترجمہ: میں ہی اللہ ہوں جہانوں کا رب۔

(۲۳) سورة الحديد، الأية: ۳۔ ترجمہ: وہی اوّل ہے اور وہی آخر ہے اور وہی ظاہر ہے اور وہی باطن ہے اور وہ ہر چیز کو اچھی طرح جانتا ہے۔

(۲۴) عن أبي هريرة مرفوعاً۔ (سنن الترمذي، أبواب التفسير، سورة الحديد۔ لیکن یہ روایت اس طرح سے ہے: "لو أنكم دليتم رجلا بحبل إلى الأرض السفلى لهبط على الله۔") ترجمہ: اگر تم کسی شخص کو رسّی سے باندھ کر زمین کی سب سے نچلی سطح کی طرف لٹکا دو تو وہ اللہ تعالیٰ پر جا گرے گا۔

(۲۵) جسم خاکی عشق کی بدولت آسمانوں پر چڑھ گیا، پہاڑ (عشق کی وجہ سے) رقص میں آ گیا اور چست ہو گیا۔ اے عاشق عشق طور کی جان ہے، طور مست ہے اور موسیٰ علیہ السلام بے ہوش ہو کر گر پڑے۔

(۲۶) ترجمہ: بانسری جو کچھ اپنے زیر و بم میں کہتی ہے اگر میں اس کو واضح کر دوں تو دنیا درہم برہم ہو جائے۔ سب معشوق ہیں اور عاشق (پس) پردہ ہے، معشوق زندہ ہے اور عاشق مردہ۔

(۲۷) عن عبد اللّٰہ بن عباس مرفوعاً۔ (سنن الترمذي، أبواب الناقب، باب مناقب أهل النبي ﷺ) ترجمہ: تم اللہ سے محبت کرو اس لیے کہ وہ تمھیں اپنی نعمتوں سے کھلاتا اور پلاتا ہے۔

(۲۸) سورۃ آل عمران، الأية: ۳۱۔ ترجمہ: آپ فرما دیجیے اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری راہ چلو۔

(۲۹) سورۃ الروم، الأية: ۳۰۔ ترجمہ: بس تو آپ دین کے لیے یکسو ہو کر رُخ کو اسی کی طرف کر لیجیے، اللہ کی بنائی فطرت پر چلتے رہیے جس پر اس نے تمام لوگوں کو ڈال دیا ہے، اللہ کی بنائی چیز میں تبدیلی نہیں ہو سکتی، یہی سیدھا دین ہے۔

(۳۰) سورۃ البقرۃ، الأية: ۱۳۵۔ ترجمہ: آپ فرما دیجیے بلکہ ہم تو یکسو رہنے والے ابراہیم کی ملت پر ہیں۔

(۳۱) یعنی ۱۔ اہل کمال سے محبت اور ان کی تعظیم ۲۔ محسن کی محبت اور اس کی تعظیم ۳۔ سخی کی محبت ۴۔ صمد کی تعظیم۔

(۳۲) ترجمہ: مجھے اپنی آنکھوں پر ناز ہے کہ اس نے تیرے جمال کا دیدار کیا ہے، میں اپنے پاؤں کو جھک کر سلام کرتا ہوں کہ اس نے تیری گلی کا چکر لگایا ہے، ہر دم میں اپنے ہاتھ کو بوسہ دیتا رہتا ہوں، کیوں کہ اس نے تیرے دامن کو پکڑ کر میری طرف کھینچا ہے۔

(۳۳) رستم ایران کا مشہور ہیرو، حاکم اور پہلوان تھا، اسے رستم داستان بھی کہا جاتا ہے، سیستان سام کا پوتا اور زال کا بیٹا تھا۔ ماں کا نام رودابہ تھا جو کابل کے بادشاہ مہراب کی بیٹی تھی۔ اس کی طاقت اور شجاعت کے کارنامے ایران اور توران کی لڑائیوں سے تعلق رکھتے ہیں، فارسی ادب میں کثرت سے اس کا ذکر موجود ہے۔

(۳۴) قدیم زمانے میں توران کا ایک بہادر بادشاہ جو تورین فریدوں کی نسل سے پشنگ کا بیٹا تھا اور جس نے کیانی خاندان کے دور میں ایران پر بار بار حملے کیے، بہادری میں اس کی مثال دی جاتی ہے۔

(۳۵) ترجمہ: بخدا تم اس شراب کی لذت کو محسوس نہیں کر سکتے جب تک تم اسے چکھو گے نہیں۔

(۳۶) جدائی و ملاقات کیا معنی رکھتی ہے؟ اصل تو دوست کی رضا مطلوب ہے، اس تمنا کے علاوہ دوسری آرزو پر افسوس ہو۔

(۳۷) ترجمہ: پیغمبر خدا ﷺ نے بہ بانگ دہل فرمایا: پہلے اونٹ کو باندھو پھر توکل کرو۔

(۳۸) تمھیں صاف ستھری اور تلچھٹ شراب کے سلسلے میں اعتراض کا کوئی حق نہیں ہے، تم خاموش رہو، کیوں کہ ہمارا ساقی جو کچھ نچھاور کر دے وہ اس کی عین مہربانی ہے۔

(۳۹) سورۃ المؤمنين، الأية: ۵۱۔ ترجمہ: اے رسولو! پاکیزہ چیزیں کھاؤ اور بھلے کام کرو۔

(۴۰) سورۃ البقرۃ، الأية: ۱۷۲۔ ترجمہ: اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو ہم نے تمھیں جو رزق دیا ہے اس کی پاکیزہ چیزوں میں سے کھاؤ (پیو)۔

(۴۱) حاشیہ نمبر (۳۹) دیکھیے۔

(۴۲) سورة الاعراف، الأية: ۳۲۔ترجمہ: پوچھیے کہ کس نے اللہ کے دیے ہوئے زینت کے سامان حرام کیے جو اس نے اپنے بندوں کے لیے پیدا کیے ہیں اور صاف ستھری کھانے کی چیزیں، کہہ دیجیے کہ وہ دنیاوی زندگی میں ایمان والوں کے لیے ہیں۔

(۴۳) سورة النساء، الأية: ۶۹۔ترجمہ: اور جو لوگ اللہ اور رسول کی پیروی کرتے ہیں تو وہ ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام فرمایا ہے یعنی انبیاء، صدیقین و شہداء اور نیکو کار لوگ۔

(۴۴) عن أبي هريرة مرفوعاً۔ (صحيح مسلم، كتاب البر والصلة والأدب، باب تحريم ظلم المسلم......)

(۴۵) عن عمر بن الخطاب مرفوعاً۔ (صحيح مسلم، كتاب الصيام، باب استحباب ثلاثة أيام من كل شهر۔) ترجمہ: ہم اللہ تعالیٰ سے راضی ہیں اس کو اپنا پروردگار مان کر اور اسلام سے خوش ہیں اپنا دین مان کر اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے خوش ہیں اپنا نبی مان کر۔

(۴۶) سورة الزمر، الأية: ۲۲۔ترجمہ: بھلا جس کا سینہ اللہ نے اسلام کے لیے کھول دیا تو وہ اپنے رب کی طرف سے روشنی میں ہے (کیا وہ اس کی طرح ہو سکتا ہے جو تاریکی میں ہو)۔

(۴۷) سورة العنكبوت، الأية: ۶۹۔ترجمہ: اور جو بھی ہمارے لیے محنت کریں گے تو ہم ضرور ان کے لیے اپنے راستے کھول دیں گے۔

(۴۸) حدیث کے اس ٹکڑے کا حوالہ و ترجمہ حاشیہ نمبر (۱۳) میں گزر چکا ہے۔

(۴۹) سورة الطلاق، الأية: ۳۔ترجمہ: اور جو اللہ پر بھروسہ رکھتا ہے تو وہی اس کے لیے کافی ہے۔

(۵۰) سورة الزمر، الأية: ۷۔ترجمہ: اور اگر تم احسان مانو تو اس سے وہ ضرور تم سے خوش ہوگا۔

(۵۱) سورة الأعراف، الأية: ۱۹۶۔ترجمہ: اور وہ نیک بندوں کی حمایت کرتا ہے۔

(۵۲) سورة محمد، الأية: ۱۱۔ترجمہ: یہ اس لیے کہ اللہ ان لوگوں کا کارساز ہے جو ایمان لائے۔

(۵۳) ایران کے افسانوی بادشاہ گشتاسپ کا بہادر بیٹا، جس نے چین اور توران سے جنگ میں نام پیدا کیا، اس نے ایران کے کھوئے ہوئے صوبوں کو تورانیوں سے چھین لیا اور ایران کا قومی پرچم بھی جو تورانیوں کے قبضے میں چلا گیا تھا، جیت لیا۔ اسفندیار ایک جنگ میں باغی رستم کے ہاتھوں مارا گیا۔

(۵۴) ترجمہ: میں افراسیاب کی بیٹی منیزہ ہوں میرے جسم کو کبھی آفتاب نے برہنہ نہیں دیکھا۔

(۵۵) اس میں اس کلام کی طرف اشارہ ہے جو امیر المؤمنین عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بارے میں کہا تھا کہ ابوبکر ہمارے سردار اور پیشوا ہیں، اور انھوں نے ہمارے سردار کو آزاد کیا، دوسرے سید سے مراد حضرت بلال رضی اللہ عنہ ہیں۔

(۵۶) سورة الحج، الآیة:۷۵۔ترجمہ:اللہ فرشتوں میں بھی قاصد چنتا ہے اور انسانوں میں بھی۔

(۵۷) سورة آل عمران، الآیة :۳۳۔ترجمہ:یقیناً اللہ نے آدم اور نوح اور آل ابراہیم اور آل عمران کو تمام جہانوں میں چن لیا ہے۔

(۵۸) سورة الأنعام، الآیة:۸۶،۸۷۔ترجمہ:اور ان سب کو ہم نے تمام جہانوں پر فضیلت بخشی اور ان کے باپ دادا میں سے اور ان کی اولاد اور ان کے بھائیوں میں سے بھی (بہتوں کو ہم نے ہدایت دی) اور ہم نے ان کو منتخب کیا اور ان کو سیدھے راستہ پر چلایا۔

(۵۹) سورة صٓ، الآیة :۴۵،۴۶،۴۷۔ترجمہ:اور ہمارے بندوں میں سے ابراہیمؑ اور اسحقؑ اور یعقوبؑ کو یاد کیجیے جو طاقت والے بھی تھے اور بصیرت والے بھی، ہم نے ان کو ایک خاص چیز (یعنی) آخرت کی یاد کے لیے چن لیا تھا اور یقیناً وہ سب ہمارے منتخب بہترین لوگوں میں تھے۔

(۶۰) سورة یوسف، الآیة :۲۴۔ترجمہ:اور اس عورت نے ان کا ارادہ کر ہی لیا تھا اور وہ بھی ارادہ کر لیتے اگر انھوں نے اپنے رب کی دلیل نہ دیکھ لی ہوتی، یوں ہی ہوا، تاکہ ہم ان سے برائی اور بے حیائی کو دور ہی رکھیں، بیشک وہ ہمارے منتخب بندوں میں تھے۔

(۶۱) (صحیح البخاری، کتاب الأدب، باب ذکر الملائکة۔) پوری حدیث اس طرح سے ہے:عن أبي هريرة عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: "إذا أحب الله العبد وفي رواية عبدًا نادي جبريل إن الله يحب فلاناً فأحبه فيحبه فينادي جبريل في أهل السماء إن الله يحب فلاناً فأحبوه فيحبه أهل السماء ثم يوضع له القبول في الأرض"۔
ترجمہ:حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:جب اللہ تعالیٰ اپنے کسی بندے سے محبت کرتا ہے تو جبریل علیہ السلام کو پکارتا ہے کہ اللہ تعالیٰ فلاں بندے سے محبت کرتا ہے لہٰذا تم اس سے محبت کرو پھر جبریل علیہ السلام اس سے محبت کرنے لگتے ہیں، اس کے بعد جبریل علیہ السلام آسمان والوں میں اعلان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فلاں سے محبت کرتا ہے لہٰذا تم سب اس سے محبت کرو تو آسمان والے بھی اس سے محبت کرنے لگتے ہیں، پھر زمین میں اس کے لیے مقبولیت رکھ دی جاتی ہے۔

(۶۲) (صحیح مسلم، کتاب الجنائز، باب فیمن یثنیٰ علیه خیر أو شر من الموتیٰ۔) حدیث کے الفاظ اس طرح سے ہیں:"أنتم شهداء الله على الأرض" ترجمہ:تم سب روئے زمین پر خدا کے گواہ ہو۔

(۶۳) سورة الحج، الآیة :۳۲۔ترجمہ:یہی بات ہے اور جس نے شعائر اللہ کی تعظیم کی تو یقیناً یہ دل کے تقویٰ کی بات ہے۔

(۶۴)عن علي مرفوعاً. (سنن الترمذي، أبواب المناقب، باب مناقب علي رضي الله عنه.) لیکن اس میں روایت اس طرح سے ہے:"لا يحبك إلّا مؤمن ولا يبغضك إلّا منافق" ترجمہ:تم سے محبت نہیں کرے گا مگر مومن اور تم سے نفرت نہیں کرے گا مگر منافق۔

(۶۵)سورة الأنعام، الآية:۱۴۹۔ترجمہ: کہہ دیجیے کہ دلیل تو بس اللہ ہی کی ہے۔

(۶۶) سورة السجدة، الآية :۵۔ترجمہ:وہ آسمان سے زمین تک کام کی تدبیر فرماتا ہے پھر وہ سب اسی کی طرف اٹھ جاتا ہے اس دن جس کی مقدار تمہارے شمار کے اعتبار سے ایک ہزار سال کی ہے۔

(۶۷)لال گندھک جو نہایت کمیاب اور اکسیر کا جز واعظم ہے، سرخ گندھک۔یعنی نایاب شے، کمیاب۔

(۶۸)وہ مرکب جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس سے تانبے کو سونا اور رانگ کو چاندی بنایا جاسکتا ہے۔یعنی کم یاب۔

(۶۹)ترجمہ: معاملہ کچھ کچا اور کچھ پکا نہیں ہونا چاہیے، بس مختصر بات ہونی چاہیے۔ والسلام۔

(۷۰)ترجمہ:غلامی کے داغ نے خسرو کا مقام بلند کردیا کیوں کہ وہ صدر مملکت بن جاتا ہے جسے سلطان خرید لے۔

(۷۱) سیدنا عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی ولادت گیلان، ایران میں ۴۷۰ھ میں ہوئی، آپ کا نسب دس واسطوں سے سیدنا امام حسن رضی اللہ عنہ پر منتہی ہوتا ہے۔آپ شریعت وطریقت ہر دو میں اعلیٰ مقام پر فائز تھے، آپ کی کرامت کی کثرت پر مؤرخین کا اتفاق ہے، آپ کے ہاتھ پر پانچ ہزار سے زائد یہودی اور عیسائی مسلمان ہوئے، عیّاروں اور جرائم پیشہ لوگوں میں سے ایک لاکھ سے زائد افراد نے توبہ کی۔شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی وفات ۹۰ رسال کی عمر میں ۵۶۱ھ میں ہوئی۔

(۷۲)سورة مريم، الآية:۵۹۔ترجمہ: پھر ان کے بعد ان کے ناخلف جانشیں ہوئے جنھوں نے نمازیں ضائع کردیں اور خواہشات کے پیچھے لگ گئے۔

(۷۳)ترجمہ: پہلے ایمان لا، پھر جہاد کر.....................

(۷۴)شیخ ابوسعید فضل الدین ابوالخیر خراسان میں ۹۶۷ء میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم کے بعد مرو گئے اور ابوعبداللہ الحصری کی شاگردی اختیار کی، ابوالحسن سرخسی، ابوالعباس احمد قصاب اور ابوالحسن علی خرقانی سے بھی فیضیاب ہوئے۔اس دور کے مشہور بزرگ ابوعبدالرحمٰن سلمی کے مرید ہوئے، انھیں فارسی شاعری میں تصوف کے مضامین کہنے والا پہلا شاعر کہا جاتا ہے۔ ان کی وفات ۱۰۴۸ء میں ہوئی، ان کے ملفوظات کو ان کے پوتے محمد نور نے ''اسرار التوحید'' کے نام سے مرتب کیا ہے۔

(۷۵)ترجمہ: دو تین بے خبر پیشواؤں کی تقلید سورماؤں کے راستے کو بدنام کردیتی ہے۔

(۷۶)اہل تحقیق محدثین کے نزدیک اس حدیث کی کوئی اصل نہیں ہے۔البتہ ابونعیم نے ضعیف سند کے ساتھ حضرت ابن عباسؓ سے مرفوعاً یہ روایت نقل کیا ہے:"أقرب الناس من درجة النبوّة أهل العلم

والــجهــاد". (لوگوں میں درجۂ نبوت سے سب سے زیادہ قریب علماء اور مجاہدین ہیں) ترجمہ: میری امت کے علماء بنی اسرائیل کے انبیاء کی طرح ہیں۔

(۷۷) سورة الكهف، الأية :۱۰۳۔۱۰۴۔ ترجمہ: کہہ دیجیے کہ کیا ہم تمھیں بتائیں کہ کاموں میں سب سے زیادہ گھاٹا کس نے اٹھایا، یہ وہ لوگ ہیں جن کی کوشش دنیا کی زندگی میں بے کار گئیں اور وہ سمجھتے رہے کہ وہ بہت بہتر کام کررہے ہیں۔

(۷۸) اللہ تعالیٰ ہمیں اور تمام مسلمانوں کو ان جاہلوں کی حالت سے پناہ میں رکھے۔ آمین!

(۷۹) ترجمہ: مرشد کی سب سے پہلی نصیحت اس بات کی تاکید ہے کہ بروں کی صحبت سے بچو۔

(۸۰) اے حافظ! علم و ادب سیکھ کیوں کہ جس کے پاس ادب نہیں وہ شاہی مجلس میں بیٹھنے کے قابل نہیں۔

(۸۱) سورة التوبة، الأية: ۱۳۸، ترجمہ: (یہ رسول) تمہاری بھلائی کے بہت خواہش مند ہیں ایمان والوں کے لیے تو بڑے شفیق، بہت مہربان ہیں۔

(۸۲) ترجمہ: ضرورتیں ممنوع چیزوں کو جائز کر دیتی ہیں۔

(۸۳) خواجہ عبداللہ انصاری ہروی کا پورا نام ابواسماعیل عبداللہ بن ابی منصور محمد ہے، خواجہ صاحب ۲ رشعبان ۳۸۵ھ کو شہر "ہرات" میں پیدا ہوئے، آپ قدیم افغانستان کے ایک حنبلی المسلک بڑے صوفی اور عارف باللہ بزرگ تھے، آپ کا انتقال ۲۲ رذی الحجہ ۴۸۱ھ میں ہرات، افغانستان میں ہوا۔

(۸۴) سورة العنكبوت، الأية: ٦۔ ترجمہ: یقیناً اللہ تعالیٰ تمام جہانوں سے بے نیاز ہے۔

(۸۵) عقل کے کارخانے میں کفر کا وجود بھی ضروری ہے، اگر ابولہب نہیں ہوتا تو دوزخ کی آگ کیسے جلاتی۔

(۸٦) ہر ایک کو اس کے مناسب کام کے واسطے پیدا کیا گیا ہے، اس کے دل میں اسی کی طرف میلان ڈال دیا گیا ہے۔

(۸۷) جب تک حلوائی کا بچہ روتا نہیں، اس کی شفقت و نوازش کا دریا جوش نہیں مارتا۔

(۸۸) سورة المائدة، الأية: ۳۵۔ ترجمہ: اے ایمان والو! اللہ سے ڈرتے رہو اور اس تک پہنچنے کا وسیلہ تلاش کرو اور اس کے راستے میں جان کھپاتے رہو تا کہ تم مراد کو پہنچو۔

(۸۹) کنز العمال، رقم الحدیث: ۲۲۲۵

(۹۰) مسند احمد بن حنبل، رقم الحدیث: ۱۱۵٦۱

(۹۱) کنز العمال، رقم الحدیث: ۸۷٦

(۹۲) صحيح البخاري، كتاب المظلم، باب النهي بغير إذن صاحبه. صحيح مسلم، كتاب الإيمان، باب بيان نقصان الإيمان بالمعاصي.......

(۹۳) صحيح البخاري، كتاب الأذان، باب الإنفتال والإنصراف عن اليمين والشمال.

(۹۴) سید احمد کبیر۔ آپ سید جلال بخاری (جلال الدین بخاری المتوفی ۸۵ےھ مطابق ۱۳۸۳ء) کے فرزند اور شیخ بہاؤالدین زکریا ملتانیؒ کے نواسہ تھے۔ آپ کے والد، مخدوم بہاؤالدین زکریا ملتانیؒ کے شوق دید میں بخارا سے ملتان آئے اور آپ سے بیعت ہو گئے شیخ زکریا ملتانیؒ نے اپنی دختر نیک اختر سے آپ کا نکاح کر دیا جن کے بطن سے تین فرزند پیدا ہوئے، سید احمد کبیر، سید محمد اور سید بہاؤالدین آپ چونکہ عمر میں سب سے بڑے تھے اس لئے سید کبیر عرف ہو گیا، سلوک کی تعلیم اپنے والد بزرگوار اور دیگر شیوخ وقت سے پائی اور اپنے زمانے کے بڑے نامور ولی ہوئے، سید صدرالدین راجو قتال بخاریؒ جو مادرزاد ولی تھے آپ ہی کے فرزند تھے، عوام حاجت روائی اور مصیبت سے نجات کے لئے آپ کے نام کی گائے وغیرہ ذبح کرتے ہیں جو کسی طرح جائز نہیں۔

سید کبیر کا اوچ میں انتقال ہوا اور یہیں اپنے والد سید جلال بخاریؒ کی خانقاہ کے اندر مزار کے بالکل متصل آپ کا مزار ہے جو زیارت گاہ خلائق ہے۔ سید احمد کبیرؒ کا کڑا (حلقہ) مشہور ہے۔ سانپوں کے کاٹے اور جنات کے آسیب زدہ لوگوں کو آپ کا کڑا دیا جاتا ہے۔

(۹۵) سنن أبي داؤد، كتاب الزكاة، باب فى فضل سقى الماء

(۹۶) مرقاة المفاتيح، كتاب الجنائز، باب ما يقال عند من حضره الموت.

(۹۷) شرح صحيح البخاري، لابن بطال، كتاب الوصايا.

(۹۸) ترجمہ: بعض تاریکیاں بعض سے بڑھ کر ہیں۔

(۹۹) سورة الأنعام، الأية:۱۳۸

(۱۰۰) سورة الأنعام، الأية:۱۳۹، ترجمہ: اور وہ کہتے ہیں کہ ان چوپاؤں کے پیٹ میں جو ہے وہ صرف ہمارے مردوں کے لیے ہے اور ہماری عورتوں کے لیے حرام ہے اور اگر بچہ مردہ (پیدا) ہو تو وہ سب اس میں شریک ہو جاتے ہیں، جلد ہی اللہ ان کے اس بیان کی سزا ان کو دے گا، یقیناً وہ حکمت والا ہے خوب جانتا ہے۔

(۱۰۱) صحیح مسلم، كتاب الأضاحى، باب تحريم الذبح لغيرالله ولعن فاعله.

(۱۰۲) سورة البقرة، الأية:۱۶۵، ترجمہ: اور لوگوں میں وہ بھی ہیں جو اللہ کے علاوہ اوروں کو (اللہ کے برابر) ٹھہراتے ہیں، ان سے اسی طرح محبت رکھتے ہیں جیسے اللہ کی محبت ہو اور جو لوگ ایمان لائے وہ اللہ ہی سے سب سے زیادہ محبت رکھنے والے ہیں۔

(۱۰۳) اصطلاح صوفیہ میں ''قطبیت'' ایک روحانی درجہ ہے جس پر فائز شخص محبوب نظر الٰہی ہوتا ہے، اور ایسا شخص ہر زمانے میں ہوتا ہے۔

(۱۰۴)غوثیت۔ اولیاء اللہ کے روحانی درجات میں سے ایک درجہ کا نام ہے۔ تصوف کی اصطلاح میں غوث ایسے مستجاب الدعوات انسان کے لیے بولا جاتا ہے جس کی طرف لوگ اضطرار کے وقت دعا کے لیے محتاج ہوں اور اگر وہ کسی بات پر قسم کھالے تو اللہ تعالیٰ اس کو سچا کر دیتا ہے۔

(۱۰۵)ابدال۔ اللہ کے وہ مقرب بندے ہیں، جو ولایت کے اس مقام پر پہنچے ہوئے ہوتے ہیں کہ ان کی دعاؤں سے اللہ تعالیٰ بارش برساتا ہے، کفار اور دشمنوں کے خلاف مسلمانوں کی مدد فرماتا ہے اور ان کی دعاؤں کی برکت سے عذاب وحوادث کو دور فرماتا ہے۔

(۱۰۶)سنن أبی داؤد، کتاب الملاحم، باب الأمر والنهي۔

(۱۰۷)سورة آل عمران، الآية: ۱۸۶، ترجمہ: اور تم ان لوگوں سے جن کو تم سے پہلے کتاب ملی اور مشرکوں سے بہت کچھ تکلیف کی باتیں سنو گے پھر اگر تم صبر کرو اور پرہیز گاری کے ساتھ رہو تو یقیناً یہ بڑی ہمت کے کام ہیں۔

(۱۰۸)سورة البقرة، الآية: ۱۵۶۔ ترجمہ: بے شک ہم اللہ ہی کے لیے ہیں اور ہم اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔

(۱۰۹)ترجمہ: اللہ تعالیٰ ہمیں اور تمام مسلمانوں کو گمراہ منافقوں کے شر سے محفوظ فرمائے۔ آمین۔

(۱۱۰) شعب الإيمان، رقم الحديث: ٤٤٥٢

(۱۱۱) سورة طٰهٰ، الآية: ۱۰۹، ترجمہ: کوئی سفارش کام نہ آئے گی، ہاں جس کو رحمٰن ہی کی طرف سے اجازت ہو اور وہ اس کی بات پسند فرمائے۔

(۱۱۲) سورة البقرة، الآية: ۴۸، ترجمہ: اور اس دن سے ڈرو جس دن کوئی کسی کے کام نہ آسکے گا۔

(۱۱۳)سورة المؤمنين الآية: ۱۰۱، ترجمہ: پھر جب صور پھونکی جائے گی تو اس دن وہاں نہ آپس میں رشتے ہوں گے اور نہ کوئی کسی کو پوچھے گا۔

(۱۱۴)سورة الحجرات، الآية: ۱۳، ترجمہ: اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا، اور تمہارے خاندان اور برادریاں بنادیں تاکہ ایک دوسرے کو پہچان سکو، بلاشبہ اللہ کے یہاں تم میں سے بڑا عزت دار وہ ہے جو تم میں سب سے بڑا پرہیز گار ہو۔

(۱۱۵)سورة البقرة، الآية: ۱۳۴، ترجمہ: یہ وہ امت ہے جو گزر چکی، اس نے جو کمایا وہ اس کے لیے اور تم جو کماؤ گے وہ تمہارے لیے ہے۔

(۱۱۶) مسند احمد بن حنبل، رقم الحدیث: ۸۷۳۶۔ ترجمہ: اللہ تعالیٰ نے تم سے جاہلی غرور اور اپنے آباء واجداد پر فخر و گھمنڈ کو دور کر دیا ہے، لہٰذا کوئی یا تو پرہیز گار مومن ہوگا یا بد بخت فاجر، تم سب آدمؑ کی اولاد ہو اور آدمؑ

مٹی سے تھے۔

(۱۱۷)سنن النسائی، کتاب عشرة النساء، باب حبّ النساء۔

(۱۱۸) مسند احمد بن حنبل، رقم الحدیث:۲۲۰۵۱

(۱۱۹) سورة النحل، الآية: ۱۱۸، ترجمہ: اور ہم نے ان کے ساتھ ناانصافی نہیں کی، ہاں وہ خود اپنے اوپر ظلم کرتے رہے تھے۔

(۱۲۰) ترجمہ: جو بھی عیب ہے وہ ہماری بے ناتناسب اور ناموزوں قامت کے سبب سے ہے۔ ورنہ جو خلعت تم نے بخشا ہے وہ کسی شخص کے لیے ناموزوں نہیں۔

(۱۲۱) ترجمہ: اگر تم حضوری چاہتے ہو تو اس سے غائب مت ہو حافظؔ۔

(۱۲۲)صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب تحریم الکبر وبیانه۔

(۱۲۳)سنن أبي داؤد، رقم الحديث: ۴۹۱۹۔سنن الترمذي، رقم الحديث: ۲۵۰۹

(۱۲۴)شرح الزرقاني على مؤطا الإمام مالك، باب ماجاء في الساعة التي في يوم الجمعة۔

(۱۲۵)سورة الأنعام، الآية، ۹۱: ترجمہ: اور انھوں نے اللہ کو جیسے پہچاننا چاہیے تھا نہ پہچانا جب وہ بولے کہ اللہ نے انسانوں پر تو کچھ اتارا ہی نہیں۔

(۱۲۶)سورة الزمر، الآية: ۶۷، ترجمہ: اور انھوں نے اللہ کو نہ پہچانا جیسے پہچاننا چاہیے جب کہ ساری زمین قیامت کے دن اس کی مٹھی میں ہوگی اور آسمان اس کے داہنے ہاتھ میں لپٹے ہوئے ہوں گے، اس کی ذات پاک ہے اور ان کے شرک کرنے سے بہت بلند ہے۔

(۱۲۷)سورة فاطر، الآية: ۴۱، ترجمہ: یقیناً اللہ ہی آسمانوں اور زمین کو تھامتا ہے کہ وہ ٹل نہ جائیں اور اگر وہ ٹل گئے تو اس کے سوا کوئی ان کو سنبھالنے والا نہیں یقیناً وہ بڑا تحمل والا بخشنے والا ہے۔

(۱۲۸) کنز العمال، رقم الحدیث: ۳۵۸۰۔

(۱۲۹)سورة النساء، الآية: ۷۹، ترجمہ: تم کو جو کوئی بھلائی ملتی ہے وہ اللہ کی طرف سے ہے اور جو تکلیف تم کو پہنچتی ہے وہ تمہارے نفس کی جانب سے ہے۔

(۱۳۰)سورة الشوریٰ، الآية: ۳۰، ترجمہ: اور تم جس مصیبت سے بھی دوچار ہوتے ہو وہ تمہارے ہاتھوں کی کمائی ہے اور کتنی چیزیں وہ درگزر کر جاتا ہے۔

(۱۳۱)سنن الترمذي، أبواب البر والصلة، باب رحمة المسلمين۔

(۱۳۲) کنز العمال، رقم الحدیث: ۱۶۱۷۱۔

(۱۳۳) کنز العمال، رقم الحدیث: ۳۴۸۶۔

(۱۳۴) صحيح البخاري، كتاب الجماعة والإمامة، باب فضل التهجير إلى الظهر

(۱۳۵) ترجمہ: اگر تم چاہتے ہو کہ تمہارا دل آئینے کی طرح صاف وشفاف ہو جائے، تو دس چیزوں کو اپنے سینے سے دور کردو، حرص، طمع، بخل، حرام، غیبت، جھوٹ، حسد، تکبر، ریا اور کینہ۔

(۱۳۶) صحیح مسلم، كتاب النكاح، باب ندب من رأي إمرأة فوقعت في نفسه۔

(۱۳۷) سنن الدارمي، كتاب النكاح، باب الرجل يرى المرأة۔

(۱۳۸) سورة النازعات، الآية: ٤٠۔

(۱۳۹) ترجمہ: بغیر خواہش کے شہوت بھڑکانا، شوق سے اپنا خون بہانا ہے۔

(۱۴۰) ترجمہ: اور نفس بچے کی طرح ہے اگر تم اسے چھوٹ دے دو تو وہ دودھ پینے کی محبت میں جوان ہو جائے گا اور اگر اس سے دودھ چڑھاؤ تو وہ چھوڑ دیتا ہے۔

(۱۴۱) سورة النساء، الآية: ۷۷، ترجمہ: آپ کہہ دیجیے دنیا کا عیش تھوڑا ہی ہے۔

(۱۴۲) سنن الترمذى، ابواب الزهد، باب هوان الدنيا على الله عزوجل۔

(۱۴۳) سورة الزخرف، الآية: ۳۵، ترجمہ: اور یہ سب کچھ نہیں بس صرف دنیا کی زندگی کے سامان ہیں اور آپ کے رب کے نزدیک آخرت پرہیزگاروں کے لیے ہے۔

(۱۴۴) اے بیٹا! میرا ہاتھ پکڑ۔

(۱۴۵) سورة الضحىٰ، الآية: ۷، ترجمہ: اور اس نے آپ کو (حق کے لیے) سرگرداں پایا تو راستہ چلایا۔

(۱۴۶) صحیح مسلم، كتاب البر والصلة والآداب، باب تحريم الظلم۔

(۱۴۷) سورة الأعراف، الآية: ۲۰۲، ترجمہ: اور جو ان کے بھائی بند ہیں (شیاطین) ان کو گمراہی کی طرف کھینچے لیے جاتے ہیں۔

(۱۴۸) ترجمہ: جب تمھیں گوشت نہ مل پائے تو شوربے سے کام چلاؤ۔

(۱۴۹) ترجمہ: زبان پر تسبیح اور دل میں گاؤخر کا خیال۔

(۱۵۰) ترجمہ: نیک لوگوں کے کام کو خود پر قیاس نہ کرو، اگرچہ لکھنے میں شیر اور شِیر (دودھ) ایک جیسا ہوتا ہے۔

(۱۵۱) صراط مستقیم کی یہی وہ عبارت ہے جس کے خلاف نافہمی یا بدفہمی کی بنا پر خوب واویلا مچایا گیا اور ایک طوفان بدتمیزی برپا کیا گیا اور جس کو بنیاد بنا کر ایک ایسے فتنے کی بنیاد ڈالی گئی جسے ابھی تک ختم نہیں کیا جا سکا۔ لہٰذا میں چاہتا ہوں یہاں پر اس عبارت کی ایسی توضیح کردی جائے کہ پھر آیندہ کسی شخص کو اس پر اعتراض کا موقع نہ مل سکے۔

اس سلسلے میں چند بنیادی باتیں پیش کی جاتی ہیں:

۱- پہلی قابل ذکر بات تو یہ ہے کہ کتاب ہذا میں اس مقام پر اپنے شیخ یا اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف خیال یا دھیان لے جانے کے لیے جو لفظ استعمال کیا گیا ہے وہ لفظ ''صرف ہمت'' ہے اور فارسی زبان میں دل میں کوئی خیال آنے یا کسی کی طرف خیال لے جانے کے لیے لفظ ''صرف ہمت'' کا استعمال نہیں کیا جاتا ہے بلکہ اس مافی الضمیر کی تعبیر کے لیے دوسرے الفاظ بولے جاتے ہیں۔ مثلاً اسی کتاب میں حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ علاجِ غیبت کے سلسلے میں فرماتے ہیں:

علاج غیبت آنست کہ اگر صرف خطرہ آں بگذرد......ص:۷۸

ترجمہ: غیبت کا علاج یہ ہے کہ اگر صرف اس کا خیال گزرے تو ......اس عبارت میں خیال کا معنی ادا کرنے کے لیے ''خطرہ'' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔

اسی طرح ایک جگہ بخل کے علاج کے سلسلے میں فرماتے ہیں:

برائے دفع بخل آنچہ کہ براں خیال بگذرد باید کہ دہد۔ ص:۷۵

ترجمہ: بخل کی بیماری سے نجات حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ جس چیز پر (بخل) کا خیال گزرے وہی چیز (بطور ہدیہ یا صدقہ) دیدے۔ اس عبارت میں خیال کی تعبیر کے لیے لفظ ''خیال'' استعمال ہوا ہے۔ ایسے ہی حضرت سید صاحبؒ نے ریا کا علاج تجویز کرتے ہوئے خیال کا معنی ادا کرنے کے لیے لفظ ''خیال'' ہی کا استعمال کیا گیا ہے۔ چنانچہ آپؒ فرماتے ہیں:

پس آں خیال را بمقدور خود دفع کند۔ ص:۸۰۔

ترجمہ: پس اس خیال کو اپنی مقدرت بھر ہٹائے۔

مذکورہ بالا تینوں مثالوں سے یہ بات روز روش کی طرح عیاں ہوگئی کہ فارسی زبان میں خیال کا معنی ادا کرنے کے لیے یا تو خطرہ کا لفظ بولا جاتا ہے یا خیال کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ اور حضرت سید صاحب نے بھی خیال کی تعبیر کے لیے انھیں دونوں الفاظ کا استعمال کیا ہے۔

اس توضیح سے یہ بات اظہر من الشّمس ہوگئی کہ فارسی میں عمومی خیال وگمان کے لیے ''صرف ہمت'' کا لفظ نہیں بولا جاتا ہے بلکہ اس امر کے اظہار کے لیے دوسرے الفاظ بولے جاتے ہیں جیسا کہ پیچھے بیان کیا گیا۔

۲- دوسری بات یہ ہے کہ اس مقام پر جو صراط مستقیم میں لکھا گیا ہے کہ: نماز میں اپنے شیخ یا ان جیسے عظیم المرتبت اشخاص کی طرف گو رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہوں، صرف ہمت کرنا ان کے بلند مراتب کی وجہ سے گاؤخر کے خیال میں ڈوب جانے سے بدتر ہے۔ اس عبارت میں صرف ہمت کا مطلب کیا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ: صرف ہمت، صوفیائے کرام کی ایک خاص اصطلاح ہے جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ دل کو تمام خیالات وخطرات سے خالی کر کے کسی ایک طرف لگا دینا جس طرح کہ انتہائی پیاس کے وقت پیاسے کو بس پانی

ہی کی طلب ہوتی ہے اور اس کا دھیان صرف اسی طرف لگا رہتا ہے، حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ القول الجمیل میں ''ہمت'' کی توضیح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

الهمة عبارة عن اجتماع الخاطر وتأكد العزيمة بصورة التمني والطلب بحيث لا يخطر في القلب خاطر سوى هذا المراد كطلب العطشان الماء.

ترجمہ: ہمت کے معنی ہیں چاہت اور طلب کی شکل میں دل کو یکسو اور قصد کو مضبوط کرنا اس طور پر کہ اس وقت دل میں سوائے اس مطلوب کے کسی اور کا خیال بھی نہ آنے پائے جس طرح کے پیاسے کو سخت پیاس کے وقت بس پانی ہی کی طلب ہوتی ہے۔

کبھی اسی ہمت کا تعلق استفادہ باطنی کے لیے اپنے شیخ طریقت یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کر دیا جاتا ہے اور اس وقت دل کو تمام اچھے برے خیالات سے خالی کر کے صرف اسی مقصود کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے حتی کہ اس وقت دل میں اللہ تعالیٰ کا بھی خیال نہیں ہوتا، اسی کا نام صوفیہ کی خاص اصطلاح میں ''شغل رابطہ'' ہے اور اس کی ایک انتہائی شکل ہوتی ہے جس کو ''شغل برزخ'' کہتے ہیں۔

ان تمام تمہیدات کو ذہن نشیں کر لینے کے بعد سنئے کہ ''صراط مستقیم'' میں اسی شغل رابطہ اور شغل برزخ کے متعلق لکھا گیا ہے کہ نماز میں یہ شغل کرنا اس سے بدتر ہے کہ انسان کو دوسری دنیوی چیزوں کے وساوس آئیں، اور وہ ان میں مستغرق ہو جائے، کیوں کہ اوّل تو یہ وساوس قصدی و اختیاری نہیں ہوتے پھر یہ کہ انسان کو ان سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہوتی بلکہ دل میں ان کی حقارت ہوتی ہے، اور یہی وجہ ہے کہ جب نمازی کو تنبہ ہوتا ہے تو وہ فوراً ان وسوسوں کو دل سے نکال دیتا ہے، بخلاف اس شغل رابطہ اور شغل برزخ کے کہ اس میں بالقصد دل کو ہر طرف سے (حتی کہ اللہ کی طرف سے بھی) ہٹا کر اپنے شیخ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہی متوجہ کرنا ہوتا ہے، بلکہ یہ تصور باندھا جاتا ہے کہ گویا وہ اس وقت ہماری آنکھوں کے سامنے ہیں اور ہم ان کے حضور میں باادب و تعظیم حاضر ہیں، اور ظاہر ہے کہ اس قسم کا تصور مقصد نماز کے بالکل ہی خلاف ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

الاِحْسانُ اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ الخ.

ترجمہ: عبادت کا اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ تم اس طرح حضور قلبی کے ساتھ خدا کی عبادت کرو گویا کہ تم اس کو دیکھ رہے ہو۔

(بحوالہ: حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ اور معاندین اہل بدعت کے الزامات، مؤلف: حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ حسب موقع وضرورت تھوڑی تبدیلی کے ساتھ)

علاوہ ازیں نماز میں نمازی کا اپنے دل و دماغ میں غیر اللہ کے اس طرح کا تصور و دھیان جمانے کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے جب وہ اس تصور و دھیان کے ساتھ نماز پڑھے گا تو وہ نماز جو اللہ کے لیے پڑھی جاتی ہے، غیر اللہ کے لیے ہو جائے گی، بایں طور کہ جب وہ اس دھیان کے ساتھ "اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنَ" کہے گا تو اس

صورت میں یہ مانا جائے گا کہ گویا وہ اللہ کے علاوہ اپنے مقصود و مطمحِ نظر کو مخاطب کر رہا ہے کہ: ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ سے ہی مدد مانگتے ہیں، اور جب معاملہ اس حد تک پہنچ جائے تو وہ نماز جو رضائے الٰہی اور قربِ خداوندی کا ذریعہ تھی، یہی اس کی رحمت سے دوری کا باعث اور شرک کی طرف لے جانے والی ثابت ہو جائے گی۔

میری ناقص رائے میں مذکورہ بالا وضاحت کے بعد اب کسی کے لیے بھی اس مسئلہ پر اعتراض کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی پھر بھی اگر کسی کو اس پر اعتراض ہو تو اس کے حق میں بس اتنا ہی کہنا کافی ہے کہ

گر نبیند بہ روز شپرہ چشم　　چشمۂ آفتاب را چہ گناہ؟

بہرحال ''صراطِ مستقیم'' میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خیال مبارک آنے یا حسبِ موقع (جیسے وأشهد أنّ محمداً عبده ورسوله پڑھتے وقت) آپ ﷺ کے خیال مبارک لانے کو مضر یا منافی نماز نہیں بتلایا گیا ہے بلکہ اسی بیان کردہ ''شغل برزخ'' کو جس کا دوسرا نام ''صرف ہمت'' بھی ہے مذکورہ وجوہات کی بنا پر وساوسِ دنیویہ سے زیادہ مضر کہا گیا ہے۔

۳- تیسری بات یہ ہے کہ اس عبارت میں جو ''گاؤ خر'' کا ذکر آیا ہے کیا یہاں پر ان کے حقیقی معنی مراد ہیں یا وہ بطور تمثیل مذکور ہیں؟ تو اس سوال کا جواب یہ ہے کہ اس جگہ ان دونوں لفظوں کے حقیقی معنیٰ (گائے، گدھا) مراد نہیں ہے بلکہ یہ بطور تمثیل مذکور ہیں، اس سے مراد ہر وہ چیز ہے جو خدا تعالیٰ کے علاوہ ہو، چنانچہ حضرت سید صاحب فارسی شعر کے اس مصرعے ''بزبان تسبیح و در دل گاؤ خر'' (زبان پر اللہ کا نام اور دل میں گاؤ خر کا خیال) کے تذکرہ کے بعد گاؤ خر کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

گاؤ خر تمثیل است، ہر چہ سوائے حضورِ حق است گاؤ باشد یا خر فیل باشد یا شتر۔

ترجمہ: اس سے مراد ہر وہ چیز ہے جو حق تعالیٰ کے علاوہ ہو خواہ وہ گائے ہو یا گدھا، ہاتھی، ہو یا اونٹ۔

لہٰذا کتاب ہذا میں اس مقام پر ''گاؤ خر'' کا ترجمہ گدھا، بیل سے کرنے کے بجائے دنیا کی حقیر چیزوں یا خرافات سے کرنا زیادہ صحیح اور روحِ عبارت کے زیادہ قریب ہے۔

(۱۵۲) ترجمہ: اگر میں ایک بال برابر بھی اُڑا تو تجلیٔ خداوندی میرے پروں کو جلا کر راکھ کر دے گی۔

(۱۵۳) سورة الشمس، الآية: ۹-۱۰۔ ترجمہ: وہ کامیاب ہو گیا جس نے اس کو سنوار لیا اور وہ ناکام ہوا جس نے اسے خاک میں ملایا۔

(۱۵۴) ترجمہ: وہ خوب مہربانی کرنے والا بھی ہے اور زیادہ سزا دینے والا بھی۔

(۱۵۵) سورة الأنعام، الآية: ۷۹، ترجمہ: میں نے تو اپنا رُخ اس ذات کی طرف کر لیا جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا۔

(۱۵۶) صحيح البخاري، كتاب صفة الصلوٰة، باب هل يلتفت لأمر ينزل به أو يرىٰ شيئاً

أو بصاقا في القبلة۔

(۱۵۷)سنن أبي داؤد، رقم الحديث: ۹۴۶۔سنن الترمذي، رقم الحديث: ۳۷۹۔

(۱۵۸)صحيح البخاري، أبواب العمل في الصلوٰة، باب ما يفكر الرجل الشيئ في الصلوٰة۔

(۱۵۹)سورة النساء، الاٰية:۵،ترجمہ:(مال)جن کواللہ تعالیٰ نےتمہارے لیے(زندگی کا)سرمایہ بنایا ہے۔

(۱۶۰)صحيح البخارى، كتاب بدء الخلق، باب صفة إبليس وجنوده۔

(۱۶۱)سورة الرعد، الاٰية: ۱۷،ترجمہ:بس جھاگ تو بیکار جاتا ہےاور جو چیز لوگوں کے لیے مفید ہوتی ہے وہ زمین میں باقی رہتی ہے۔

(۱۶۲)ترجمہ: کیا ہی اچھا ہوتا کہ دوزخ مجھ سے بھر جاتی مگر دوسروں کو رہائی مل جاتی۔

(۱۶۳)مردانِ خدا میں جو سب سے زیادہ تکالیف جھیل کر سب سے زیادہ امتحانات سے گزر کر قطبیت تک پہنچتا ہے وہ اس وقت کا قطب الأقطاب کہلاتا ہے،اور ہر وقت اور حالات کے مطابق کوئی ایک ہوتا ہے۔

(۱۶۴)ترجمہ:اللہ تعالیٰ ہمیں اور تمام مسلمانوں کو بدعات سے محفوظ فرمائے اور تمام حالات میں حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع کی توفیق عنایت فرمائے۔آمین۔

(۱۶۵)سورة الفاتحة، الاٰية: ۵۔ترجمہ:اے اللہ ہم تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور تجھ سے ہی مدد چاہتے ہیں۔

(۱۶۶)سورة النور، الاٰية: ۳۵۔ترجمہ:اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔

(۱۶۷)سورة الرحمٰن، الاٰية: ۲۹۔ترجمہ:ہر روز اس کی ایک شان ہے۔

(۱۶۸)حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ۔آپ کی جائے پیدائش اور آبائی وطن سجستان ہے۔آپ کی تربیت خراسان کے ملک میں ہوئی، والد ماجد کا نام خواجہ غیاث الدین حسن ہے جو حسینی سادات سے ہیں۔شیخ ہارونی کے مرید تھے، ہندوستان میں سلسلہ چشتیہ کے سردار مانے جاتے ہیں۔شیخ عثمان ہارونیؒ فرماتے ہیں کہ ہمارے معین الدین خدا کے محبوب ہیں، مجھے اپنے ان جیسے مرید پر فخر ہے۔ ہندوستان کے لوگ عام طور پر آپ کے عقیدت مند تھے۔آپ علوم ظاہری و باطنی میں یکتائے زمانہ تھے۔خوارق وکرامات کا بے شمار ظہور ہوا۔جس کو بیان نہیں کیا جاسکتا۔روایت ہے کہ جب حق تعالیٰ نے آپ کو توفیق توبہ عطا فرمائی، اور آپ نے اپنا تمام مال واسباب درویشوں میں تقسیم فرمادیا، تو آپ سمرقند اور بخارا تشریف لے گئے، اور وہاں قرآن مجید حفظ کیا۔علومِ دینیہ کو حاصل کیا۔ پھر وہاں سے عراق،عرب تشریف لے گئے۔جب آپ نیشاپور کے قصبہ ہارون میں پہنچے۔شیخ عثمان ہارونی کی خدمت میں حاضر ہوئے،اور کامل بیس سال تک آپ کی خدمت کی۔خواجہ معین الدین چشتیؒ نے دور دور ممالک کا سفر کیا اور بڑے بڑے مشائخ سے آپ نے فیض حاصل کیا۔ بعد ازاں دہلی اور دہلی سے اجمیر جا کر وہاں مستقل

سکونت اختیار فرمالی، آپ کے قدوم کی برکت سے ہزاروں مشرکین اور کفار کو دولت اسلام ملی، اور جو لوگ اسلام نہیں لائے وہ بھی حضرت سے خوش عقیدگی رکھتے تھے۔

(۱۶۹) قطب الدین بختیار کاکی دہلوی برّصغیر کے صوفی بزرگ سلطان الہند خواجہ معین الدین چشتی اجمیری کے خلیفہ اور بابا فریدالدین گنج شکر کے پیرومرشد ہیں۔ ولادت: آپ ۵۸۲ھ-۱۱۸۷ء قصبہ اوش ترکستان میں پیدا ہوئے۔ آپ کا نام سید بختیار، لقب قطب الدین اور قطب الاقطاب اور کاکی عرفیت ہے، حسینی سادات میں سے تھے۔

(۱۷۰) سورة طٰهٰ، الآية: ۵۔ ترجمہ: رحمٰن عرش پر جلوہ افروز ہوا۔

(۱۷۱) سورة بني اسرآئيل، الآية: ۴۴۔ ترجمہ: سب اس کی تسبیح میں لگے ہیں، البتہ تم ان کی تسبیح سمجھتے نہیں۔

(۱۷۲) حضرت خواجہ بہاء الدین نقشبند قدس سرہٗ۔ آپ کا نام محمد بن محمد التجاری ہے۔ آپ کو نقشبند کہنے کی وجہ رسالہ بہائیہ میں جو مقامات خواجہ میں ہے، یہ لکھی ہے کہ آپ نے فرمایا کہ میں اور والد دونوں کم خواب کے کپڑے بننے اور ان پر نقوش بنانے میں مشغول رہتے تھے، اور یہی روایت مولانا عبدالرحمٰن جامیؒ کے مکتوبات میں ملی ہے۔ آپ سلسلہ خواجگان نقشبندیہ کے سرتاج ہیں۔ اور آپ کو خواجہ محمد بابا سماسی نے فرزندی میں قبول فرمایا تھا، آپ میر سید کلال کے مرید ہیں۔ آپ اویسی بھی ہیں، اور روحانی نسبت آپ کو خواجہ عبدالخالق غجدوانی قدس سرہٗ سے حاصل ہے۔ اور آپ نے قشم شیخ و خلیل اتا مشایخ ترکستانی کی خدمت وصحبت سے فیض وبرکات حاصل کی ہیں۔ اپنے زمانہ کے غوث اور اولیائے وقت کے قبلہ وامام گزرے ہیں۔ ہر خاص وعام آپ سے خوش عقیدگی رکھتا تھا۔ آپ شریعت مطہرہ کی سختی سے پابندی کرتے تھے۔ مذہباً حنفی تھے، امام ابوحنیفہؒ کے مقلد تھے۔ اس سلسلہ کے اکثر مشایخ حنفی المذہب گزرے ہیں۔ کسی نے خواجہ صاحب سے دریافت کیا کہ کیا آپ کے طریقہ میں جہر وخلوت اور سماع کا جواز ہے؟ فرمایا نہیں۔ پھر آپ سے پوچھا کہ آپ کے طریقہ کی بنیاد کس چیز پر ہے؟ فرمایا ظاہر میں خلقِ خدا پر اور باطن میں حق تعالیٰ پر۔

(۱۷۳) ترجمہ: جو ہماری ابتدا ہے وہ دوسرے منتہی کی انتہا ہے، اور ہماری انتہا تو یہ ہے کہ تمناؤوں کی جیب خالی ہوجائے۔

(۱۷۴) سورة الأنبياء، الآية: ۵۲۔ ترجمہ: یہ کیا مورتیں ہیں جن پر تم جمے بیٹھے ہو۔

(۱۷۵) شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی علوم ظاہری وباطنی میں فاضل کامل تھے، فراغ علمی حاصل کرنے کے بعد علم وعرفان کے دریا بہانے شروع کردیئے۔ ۱۰۰۸ھ-۱۵۹۹ء میں اپنے وطن سے حج کے لیے روانہ ہوئے۔ راستہ میں دہلی میں حضرت خواجہ محمد باقی باللہ سے ملاقات کی، اور بیعت وخلافت سے سرفراز ہوئے۔ نقشبندیہ سلسلہ کا خوب شیوع کیا اتباع سنت کا بڑا خیال رکھتے تھے، عہد اکبری میں علمائے سوء کی

وجہ سے اسلام کی جوصورت مسخ ہوئی تھی اور شریعت محمدیہ کو جونقصان پہنچا تھا، اس کی اصلاح کی حضرت مجدد نے پوری پوری کوشش کی، بدعات کا رد کیا، وحدت الشھود کے نظریہ کی اشاعت کی، جب جہانگیر بادشاہ نے مجدد صاحب کو قید کردیا تو حضرت نے تسلیم ورضا کا مظاہرہ کیا، ۱۰۳۴ھ-۱۶۲۴ء میں داعی اجل کو لبیک کہا، حضرت مجدد کی تصانیف میں ان کے مکتوبات بہت مشہور ہیں۔

(۱۷۶)سورة البقرة، الآية: ۱۵۳۔ترجمہ: بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

(۱۷۷)سورة الشعراء، الآية: ۶۲۔ترجمہ: یقیناً میرا رب میرے ساتھ ہے، وہ ابھی مجھے راستہ دے گا۔

(۱۷۸)سورة التوبة، الآية: ۴۰۔ترجمہ: یقیناً اللہ ہمارے ساتھ ہے۔

(۱۷۹)سورة المائدة، الآية: ۵۴۔ترجمہ: ان سے وہ (اللہ) محبت کرتا ہوگا اور وہ اس سے محبت کرتے ہوں گے۔

(۱۸۰) ترجمہ: اللہ کی پاکی ہے اس کی مخلوق کی تعداد کے برابر اور اس کی رضا اور اس کے عرش کے وزن اور اس کے کلمات کی سیاہی کے برابر۔(صحيح مسلم، كتاب الذكر والدعاء والتوبة، باب التسبيح أوّل النهار وعند النوم)

(۱۸۱) سورة النساء، الآية: ۹۵۔ترجمہ: اور بھلائی کا وعدہ اللہ نے سب سے کیا ہے۔

(۱۸۲)سورة يونس، الآية: ۲۶۔ترجمہ: جنھوں نے بھلے کام کیے ان کے لیے بھلائی ہے اور بڑھ چڑھ کر ہے۔

(۱۸۳) ترجمہ: اور عنقریب تم دیکھو گے جب گرد وغبار چھٹ جائے گا تو، کہ تمہارے پاؤں کے نیچے گھوڑا ہے یا گدھا۔

(۱۸۴)سورة البقرة، الآية: ۱۱۵۔ترجمہ: تو تم جدھر بھی رخ کرو بس ادھر اللہ کی ذات ہے۔

(۱۸۵)سورة الضحىٰ، الآية: ۶، ۷، ۸۔ترجمہ: کیا اس نے آپ کو یتیم نہیں پایا تو اس نے ٹھکانا دیا، اور اس نے آپ کو (حق کے لیے) سرگرداں پایا تو راستہ چلایا، اور آپ کو ضرورت مند پایا تو غنی کردیا۔

(۱۸۶)سورة صٓ، الآية: ۷۵۔ترجمہ: میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے بنایا۔

(۱۸۷)سورة التحريم، الآية: ۸۔ترجمہ: اے ہمارے رب ہمارے لیے ہمارے نور کو مکمل فرمادے۔

(۱۸۸) ترجمہ: جب تم ساقی ہو تو کوئی بھی محروم نہیں رہے گا۔ آغوش ساحل کی وسعت موج کے مطابق ہوتی ہے۔

(۱۸۹) ترجمہ: مجھے اندیشہ ہے کہ تو خانۂ کعبہ تک نہیں پہنچے گا اے اعرابی! کیوں کہ تو جس راستے پر چل رہا ہے وہ ترکستان کا ہے۔

(۱۹۰)سورة البقرة، الآية: ۲۵۵۔ترجمہ: جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے سب اسی کا ہے۔

(۱۹۱)سورة الأنعام، الآية: ۱۳۔ترجمہ: رات اور دن میں بسنے والی ہر چیز اسی کی ہے۔

(۱۹۲)سورة الأنعام، الآية: ۳۔ترجمہ: وہی اللہ ہے آسمانوں میں اور زمین میں، تمہارے چھپے اور کھلے کو جانتا ہے۔

(۱۹۳)سورة مريم، الآية: ۸۔ترجمہ: میرے بچہ کس طرح ہوگا جب کہ میری بیوی بانجھ ہے اور میں بھی بڑھاپے

کی اس انتہا کو پہنچ گیا ہوں کہ گودا خشک ہو چکا ہے۔

(۱۹۴)سورۃ الأعراف، الآیۃ: ۱۵۶۔ترجمہ:اور میری رحمت ہر چیز کو گھیرے میں لیے ہوئے ہے۔

(۱۹۵)السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ۲۸۲۲، قال الباني لا أصل له. ترجمہ:اللہ کی عادتیں اختیار کرو۔

(۱۹۶)سورۃ الکھف، الآیۃ: ۲۸۔ترجمہ:اور آپ ان ہی لوگوں کے ساتھ اپنے آپ کو لگائے رکھیے جو صبح و شام اپنے رب کو پکارتے ہیں اس کی خوشنوں کی چاہت میں۔

(۱۹۷)مسند احمد، رقم الحديث: ۶۶۴۴

(۱۹۸)ترجمہ: موسیٰؑ نے درخت کے اندر آگ دیکھی، وہ درخت اس آگ سے خوب سرسبز وشاداب ہو گیا، اسی طرح اہل دل کی خواہش وحرص کو سمجھنا چاہیے۔

(۱۹۹)ہر پھول کا رنگ اور خوشبو جدا جدا ہے۔

(۲۰۰)حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ۔حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے انتقال کے وقت ان کی عمر قریب ۱۷ رسال کے تھی، تمام علوم ظاہر و باطن اپنے والد ماجد سے حاصل کیے، بعض کتب حدیث کی سند اپنے والد ماجد کے اجل تلامذہ شاہ محمد عاشق پھلتی اور خواجہ امین اللہ کشمیری سے لی، علم فقہ اپنے خسر مولوی نوراللہ سے حاصل کیا۔ جامع علوم ظاہری و باطنی، صاحب علم وقلم وزہد و ورع وتقویٰ تھے، دور دور سے لوگ ان کی خدمت میں حاضر ہوتے اور علم حاصل کر کے اپنے علاقوں میں دین کی خدمت کرتے۔ غرض وہ مرجع علماء ومشائخ تھے۔ تمام عمر درس وتدریس، افتاء، فصل خصومات، وعظ وپند اور تلامذہ کی تربیت وتکمیل میں صرف کردی۔ نجف خاں کے زمانہ میں اس کی سخت گیر پالیسی کی وجہ سے شاہ صاحب کو سخت تکلیف پہنچی۔ یہاں تک کہ شہر سے نکالا گیا۔ جائداد ضبط ہوئی، مگر حضرت نے اصلاح وتبلیغ کا کام برابر جاری رکھا، ان کی تصانیف میں عزیز الاقتباس، رسالہ بلاغت، ملفوظات شاہ عبدالعزیز، وسیلہ نجات، تحقیق الرویا، سیر الجلیل، میزان الکلام، حاشیہ میر زاہد، رسالۂ حاشیہ میر زاہد ملاّ جلال، حاشیہ میر زاہد شرح مواقف، حاشیہ شرح ہدایت الحکمۃ وغیرہ بھی ہیں۔

(۲۰۱)سورۃ الضحیٰ، الآیۃ: ۱۱۔ترجمہ:اور جو آپ کے رب کی نعمت ہے اس کو بیان کرتے رہیں۔

# کتابیات


۱۔ القرآن الکریم۔

۲۔ صحیح البخاری، ابوعبداللہ محمد بن اسماعیل البخاری، دارابن کثیر- بیروت۔

۳۔ صحیح مسلم، ابوالحسین مسلم بن الحجاج القشیری النیسا فوری، دارالجیل - بیروت

۴۔ سنن أبی داؤد، سلیمان بن الأشعث أبوداؤدالسجستانی، دارالکتاب العربی- بیروت

۵۔ سنن الترمذی، ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ الترمذی، داراحیاء التراث العربی- بیروت

۶۔ سنن النسائی، أبوعبدالرحمٰن احمد بن شعیب النسائی، مکتبۃ المطبوعات الإسلامیہ-حلب

۷۔ سنن ابن ماجہ، محمد بن یزید ابوعبداللہ القزوینی، دارالفکر- بیروت، لبنان

۸۔ مسند احمد بن حنبل، أبوعبداللہ احمد بن محمد بن حنبل الشیبانی، عالم الکتب- بیروت

۹۔ شعب الایمان، احمد بن الحسین بن علی بن موسیٰ ابوبکر البیہقی، مکتبۃ الرشد- ریاض

۱۰۔ کنزالعمال، علی بن حسام الدین المتقی الہندی، موسسۃ الرسالۃ - بیروت

۱۱۔ سنن الدارمی، عبداللہ بن عبدالرحمٰن أبومحمد الدارمی، دارالکتاب العربی- بیروت

۱۲۔ شرح صحیح البخاری لابن بطال، ابوالحسن علی بن خلف البکری القرطبی، مکتبۃ الرشد- ریاض

۱۳۔ السلسلۃ الضعیفۃ، محمد ناصرالدین الألبانی، مکتبۃ المعارف- الریاض

۱۴۔ سیرت سید احمد شہید، مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام-لکھنؤ

۱۵۔ جماعت مجاہدین، غلام رسول مہر، کتاب منزل- لاہور

۱۶۔ تذکرہ علماء ہند، رحمان علی، ہسٹاریکل سوسائٹی- پاکستان

۱۷۔ سفینۃ الأولیاء، داراشکوہ، مطبع منشی نول کشور-لکھنؤ

۱۸۔ مرقاۃ المفاتیح، علی بن سلطان الشہیر بملّا علی القاری، کتب خانہ اشاعت اسلام- دہلی

۱۹۔ شرح الزرقانی علی مؤطأ الإمام مالک، محمد بن عبدالباقی بن یوسف الزرقانی، دارالکتب العلمیۃ - بیروت